داستان غدر
ظہیر دہلوی

سلسلۂ نوادرِ ادب

شمارۂ اوّل

داستانِ غدر

یعنی

ہنگامۂ ۵۷ء کے چشم دید حالات

مصنّفہ

راقم الدولہ سیّد ظہیر الدّین ظہیرؔ دہلوی

شاگردِ ذوقؔ دہلوی و داروغۂ ماہی مراتب شاہ ظفرؔ

شائع کردہ

اکادمی پنجاب، ادبی دنیا منزل۔ لاہور

قیمت تین روپے چار آنے — اراکینِ اکادمی سے دو روپے آٹھ آنے

عام اور تاجرانہ فروخت کے لئے سول ایجنٹس

میسرز پبلیشرز یونائٹڈ لمیٹڈ انارکلی۔ لاہور

سلسلۂ مطبوعاتِ اکادمی شمارہ (٦)

اکادمی ایڈیشن، طبع اوّل

جون ۱۹۵۵ء

شکریّہ

اس کتاب کے مصارفِ طباعت و اشاعت کا ایک حصّہ وزاتِ تعلیم حکومتِ عالیہ مرکزیہ پاکستان نے بطورِ اعانت عطا فرمایا ہے۔ جس کے لئے اکادمی سراپا سپاس ہے۔

معتمد اعزازی

(در کریسنٹ پرنٹنگ پریس لاہور طبع شد)

نہ گل ہوں نہ برگ تاک بریدہ ہوں
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

ظہیر دہلوی

فہرست مضامین

تیسرا باب

چوتھا باب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

زیرِ نظر کتاب سیّد ظہیر الدین ظہیرؔ دہلوی نے جو اُستاد ذوق کے شاگرد اور ابوالمظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ ثانی ظفر آخری شاہ دہلی کے داروغہ ماہی مراتب تھے اپنی زندگی کے حالات میں لکھی تھی۔ چونکہ اُنہوں نے ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کا انقلاب اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ زندگی میں گوناگون مصائب برداشت کئے اور غدر کے بعد ترکِ وطن کی اذیتیں بھی جھیلیں۔ اس لئے اِن کی زندگی زمانے کے نشیب و فراز اور شکست و تعمیر کا آئینہ بن گئی تھی۔ جیسا کہ اُنہوں نے کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے اُنہیں احباب کے اصرار پر آئندہ نسلوں کی معلومات کے لئے اپنے حالاتِ زندگی قلم بند کرنا پڑے۔ اِن کی زندگی چونکہ انقلابِ زمانہ کا مرقّع تھی۔ اِس لئے اُنہوں نے اپنے حالات میں نہ صرف اپنی نجی اور ذاتی روداد ہی لکھی بلکہ ماحول کے حالات بھی

تحریر کئے۔ چنانچہ اس کتاب میں شاہ ظفر۔ قلعۂ دہلی، ۱۸۵۷ء کے غدر اور غدر کے بعد کی کیفیت۔ ریاست الور۔ ریاست جے پور۔ ریاست ٹونک اور ریاست حیدر آباد کے حالات بھی اجمالی طور سے بیان کئے گئے ہیں۔

مصنف نے ۱۸۵۷ء کے غدر کے حالات وہی لکھے ہیں جو انہیں اپنے گرد و پیش نظر آئے۔ یا پھر اُن حادثات کا ذکر کیا ہے جو اُنہیں یا ان کے عزیزوں کو پیش آئے۔

غدر کے جن واقعات سے انہیں کوئی سابقہ نہیں پڑا یا جو دہلی سے باہر دوسرے صوبوں یا ریاستوں میں رونما ہوئے۔ ان کا انہوں نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ حتّٰی کہ بہادر شاہ ظفر کے مقدمہ کی روداد بھی بیان نہیں کی۔ شاید اس لئے کہ وہ خود موقع پر موجود نہیں تھے۔ یا شاید اس لئے کہ مقدمہ میں حکومت مدعی تھی۔ اور مقدمہ کے موضوع پر اس زمانہ میں قلم اٹھانا جب کہ انگریز مسلمان کو بلا قصور موت کے گھاٹ اتار دینا ثواب سمجھتا تھا، جان کو جوکھوں میں ڈالنا تھا۔ تاہم میں نے مقدمہ کی مختصر کیفیت حاشیے پر لکھ دی ہے۔

سید ظہیر نے اپنے یا دوسروں کے حالات بیان کرتے ہوئے کہیں بھی کوئی تاریخ یا سن یا مہینہ نہیں لکھا۔ حتّٰی کہ اپنی تاریخ پیدائش تک نہیں لکھی وہ لکھتے ہیں کہ غدر کے وقت میری عمر بائیس سال تھی۔ اس لئے قیاس سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ۱۸۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ قلعہ کی ملازمت حاصل کرتے وقت میری عمر تیرہ سال تھی۔ اس حساب سے وہ ۱۸۴۸ء

میں بادشاہ کے ملازم ہوئے ہوں گے۔ اور انہیں ماہی مراتب کے داروغہ کا عہدہ ملا۔ ان کے فرائض یہ تھے کہ جب بادشاہ کہیں جاتا تو وہ اپنے نائبین کو ساتھ لے کر بادشاہ کی رکاب میں چلتے۔ ورنہ دربار میں حاضر رہتے۔

ان کے والد خوش نویسی میں بادشاہ کے استاد تھے سیّد ظہیرالدین اور اُن کے چھوٹے بھائی انور بھی خوش نویس تھے۔ ظہیر چودہ برس کے سن میں اُستاد ذوق کے شاگرد ہوئے۔ اور شعر و سخن کی محفلوں میں شریک ہونے لگے ان کے چھوٹے بھائی انور بھی اُستاد ذوق ہی کے شاگرد تھے۔ مگر ذوق کی وفات کے بعد مرزا غالب کو کلام دکھانے لگے۔ غدر میں ان دونوں بھائیوں نے بہت تکلیفیں اٹھائیں۔ یہ دلی سے نکل کر جھجر۔ سونی پت۔ نجیب آباد۔ ہوتے ہوئے بریلی پہنچے۔ یہاں سے رام پور گئے۔

۱۸۶۲ء میں لارڈ لارنس کے زمانے میں واپس دہلی آئے۔ پھر الور چلے گئے۔ وہاں چار برس رہے۔ پھر ریاست جے پور میں تھانہ دار ہو گئے۔ وہاں کم و بیش ۱۹ سال رہے۔ والئے ریاست کی وفات پر وہاں سے نکلے اور پندرہ سولہ سال ریاست ٹونک میں بسر کئے آخر عمر میں حیدر آباد دکن گئے اور وہیں پیغام اجل آپہنچا۔ ظہیر نے ۱۹۱۱ء میں حیدر آباد ہی میں وفات پائی۔

ظہیر اپنے اُستاد ذوق کی طرح پُرگو شاعر تھے۔ ان کا پہلا دیوان گلستان سُخن کے نام سے آگرہ سے شائع ہوا تھا۔ بعد میں دو دیوان مطبع کریمی بمبئی نے شائع کئے۔ کہا جاتا ہے کہ چوتھا ان کے نواسے میر اشتیاق حسین شوق دہلوی کے پاس تھا۔ جو طبع نہیں ہوا۔ زیر نظر کتاب کا مسودہ بھی ان کے

نواسے ہی کے پاس تھا۔ ظہیر اگرچہ ذوق کے شاگرد تھے مگر کلام میں مومن کا رنگ ہے۔ خود بھی کہتے ہیں ؎

طرزِ مومن سے نہ آگاہ تھا جب تک کہ ظہیر
سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگ غزل نے نہ دیا

کیا بنا ہی طرزِ مومن اے ظہیر
طاق ہیں لاریب اپنے فن میں ہم

افسوس ہے کہ اس کتاب میں آپ نے اپنی کوئی پوری غزل نقل نہیں کی۔ مسدس شہر آشوب کے کچھ بند کہیں کہیں نقل کئے ہیں۔ اور تین چار شعر غزل کے ہیں کہیں دیئے ہیں۔ حالانکہ ضرورت یہ تھی کہ وہ اس کتاب میں الور خیر پور اور ٹونک کے معرکہ کے مشاعروں کی غزلیں نقل کرتے۔ ذیل میں میں آپ کی متفرق غزلوں کے چند اشعار پیش کرتا ہوں ؎

فقط اک سادگی پر شوخیوں کے ہیں گماں کیا کیا
نگاہِ شرمگیں سے ہے نہاں کیا کیا عیاں کیا کیا

تصور میں وصالِ یار کے سامان ہوتے ہیں
ہمیں بھی یاد ہیں حسرت کی بزم آرائیاں کیا کیا

قدم رکھنے نہیں دیتی وہ زمیں پر بے نیازی سے
بڑھا جاتا ہے یاں شوقِ سجودِ آستاں کیا کیا

اعجازِ دلفریبیٔ انداز دیکھنا

ہر ہر ادا یہ مجھ کو گمان نظر رہا

پرہیزِ عشق سے مجھے وحشت فزوں ہوئی

میں کچھ دوا سے اور بھی رنجور تر رہا

کیا بری شے ہے محبت بھی الٰہی توبہ

جرم ناکردہ خطاوار بنے بیٹھے ہیں

یہ شوخی ہے کہ تمکیں ہے الٰہی کیا قیامت ہے

اُلجھتے ہیں دمِ رفتار سو سو بار دامن سے

بہت ظہیر کو ہم یاد کرکے واں روئے

کبھی جو ذکرِ حریفانِ بادہ خوار آیا

ظہیر آخری دور کے بڑے نامور شاعر تھے۔ اور اپنے زمانے میں فنِ شعر اور زبان کے بڑے اُستاد مانے جاتے تھے۔ ان کے بہت سے شاگرد تھے۔ جن میں سے نجم الدین احمد ثاقب بدایونی نے بہت شہرت حاصل کی۔ یہ پہلوانِ سخن کے لقب سے مشہور تھے۔

ظہیر اگرچہ زبان میں اُستادِ وقت تھے۔ پھر بھی مادری زبان کی

پیروی کرتے تھے۔ زیرِ نظر کتاب میں اُنھوں نے بعض الفاظ اُسی طرح لکھے ہیں۔ جس طرح عوام بولتے ہیں۔ وہ خود تمہید میں لکھتے ہیں۔

"میں اپنی سیدھی سادی روزمرہ کی زبان میں اپنی سرگزشت لکھ رہا ہوں۔ اخبار نویس نہیں قصہ خواں نہیں۔ میری جو زبان مادری ہے زمانہ شیر خواری سے جو الفاظ اپنے پالنے والوں کی زبان سے سُنے ہیں وہ میرے ذہن نشین ہو گئے ہیں۔ اور میرے اُستاد اور اتالیق نے جو مجھے تعلیم کئے ہیں وہ نقش کالحجر ہیں میری زبان اور میرے قلم سے وہی کلمے نکلتے ہیں"

چونکہ ظہیرؔ نے اس کتاب میں کہیں بھی کوئی تاریخ یا سن نہیں لکھا۔ اس لئے یہ طے کرنا بڑا مشکل ہے کہ یہ کتاب ظہیرؔ نے کس سن میں تحریر کی۔ چونکہ اس میں میر محبوب علی خاں اور ریاست حیدر آباد کے حالات بھی ہیں۔ اس لئے قیاس یہ ہے کہ انھوں نے یہ کتاب حیدر آباد میں ہی قلم بند کی ہوگی۔ حیدر آباد وہ سنہ ۱۹۱۰ء میں گئے اور سنہ ۱۹۱۱ء میں وہیں فوت ہو گئے۔ ممکن ہے کہ انھوں نے کتاب کا بیشتر حصہ پہلے سے لکھا ہوا ہو۔ اور حیدر آباد میں اس کی تکمیل کی ہو۔ بہر حال کتاب کسی عہد میں بھی لکھی گئی۔ اس کی زبان وہ ہے جو ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ کے عہد میں شہرِ دہلی کے شرفاء کی زبان تھی۔ مثلاً انھوں نے ہر جگہ جا یا جگہ کی بجائے لفظ "جائے"

استعمال کیا ہے۔ مثلاً "روپیہ رکھنے کو جائے نہ تھی"۔ ذوق کہتا ہے۔

سرِ بوقتِ ذبح اپنا اس کے زیرِ پائے ہے
یہ نصیبِ اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

اب ہم کہتے ہیں لوٹنے کی جا ہے۔ شکر کا مقام ہے۔ جائے نہیں بولتے۔

ظہیر نے اس کتاب میں ہر جگہ "برابر" کو مؤنث لکھا ہے۔ مثلاً فلاں شہر جے پور کی برابر ہے۔ ہم کہیں گے جے پور کے برابر ہے۔ انہوں نے لکھا ہے "مکان کرائے کو لیا"۔ ہم کہیں گے مکان کرائے پر لیا۔ انہوں نے ہر جگہ لفظ "بعد" کو میں کے بغیر استعمال کیا ہے۔ مثلاً بعد ہم نے ایک روز" ہم کہیں گے" بعد میں ہم نے ایک روز انہوں نے لکھا ہے "ہمیں کرسٹان بنانا چاہا"۔ ہم کہتے ہیں ہمیں عیسائی بنانا چاہا۔ انہوں نے گاڑی کو ہندی لہجہ میں ہر جگہ گاڈی لکھا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "خلقت نے ہماری گرویدگی اختیار کی"۔ ہم کہیں گے "خلقت ہماری گرویدہ ہونے لگی یا ہو گئی"۔

غرض کتاب کی زبان کم و بیش سو سال پرانی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ظہیر مرحوم نے جیسا کہ انہوں نے تمہید میں بیان کیا۔ دہلی سے نکلنے کے بعد سالہا سال تک باہر زندگی بسر کرنے کے باوجود اپنی گھریلو زبان کو قائم رکھا۔ غزل میں ان کی زبان وہی ہے جو مومن یا آزردہ یا حالی کی غزل کی ہے۔ لیکن نثر میں انہوں نے نہ غالب کی نثر کا تتبع کیا۔ نہ حالی کی نثر کا۔ بلکہ نثر میں وہی زبان اختیار کی جس میں وہ بچپن سے اپنے گھر میں اور احباب میں بات چیت کرتے تھے

اگرچہ یہ ظہیر دہلوی کی ۷۶ سالہ زندگی کی روداد ہے۔ مگر اس میں ضمناً اردو اردو ادب، شہر دہلی اور بعض ہندوستانی ریاستوں کی تاریخ کے چند اوراق بھی شامل ہو گئے ہیں۔ اگرچہ اب نہ شہر دہلی رہا نہ وہ ریاستیں رہیں تاہم اُن کے ضمنی ذکر سے اس کتاب کی علمی حیثیت دو چند ہو گئی ہے۔

میں نے مکرمی مولانا صلاح الدین احمد صاحب کے ایما سے اس کتاب کی تصحیح کی۔ جابجا ضمنی سُرخیاں اور فٹ نوٹ لکھے۔ مصنف نے بعض جگہ ایک ہی عنوان کے ماتحت مختلف واقعات لکھ دیئے تھے۔ اس لئے ضمنی سُرخیاں قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مگر مصنف کی عبارت میں نہ کوئی کمی بیشی کی گئی نہ ترتیب بدلی۔ اس طرح اب اس کتاب کو ایسی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ جو اس کی شان کے شایاں ہے۔

اصغر حسین خاں نظیر لودھیانوی

لاہور۔ مورخہ ۹ فروری

سنہ ۱۹۵۳ء

گذارش

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) سے لے کر بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی تک ڈیڑھ سو برس کا زمانہ اگرچہ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے زوال کا زمانہ ہے، لیکن یہی وہ زمانہ ہے، جب وہ تمدن فروغ پذیر ہوا، جسے ہم "ہندو مسلم" تمدن یا آسان تر لفظوں میں "زبانِ اُردو کا تمدن" کہہ سکتے ہیں۔ اُردو شاعری اور فارسی نثر نگاری اس تمدن کی امتیازی خصوصیات تھیں اور مغلیہ ہندوستان کے اہلِ قلم اور اہلِ ذوق، عام اس سے کہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو، اپنی علمی ضروریات اور ادبی مشاغل کے لئے انہی دو زبانوں کا وسیلہ اختیار کرتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ رؤسا اور امراء، شہزادگان اور راجگان یکساں طور پر فارسی اور اُردو کے ان انشاپردازوں اور شاعروں کی سرپرستی فرماتے تھے۔۔۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ آزادی کے بعد یہ صورتِ حال بدل گئی لیکن اس تبدیلی نے بھی اپنی تکمیل کے لئے کم و بیش نصف صدی کا عرصہ لیا۔ منشی ہر گوپال تفتہ فارسی زبان کے آخری صاحبِ دیوان ہندو شاعر اور مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ، فارسی اور اُردو شعر و ادب کے آخری سرپرست ہندو امیر تھے۔

زیرِ نظر کتاب کے مصنف سیّد ظہیر الدین حسین ظہیرؔ دہلوی نے ہنگامۂ ۵۷ء سے ربع صدی پہلے اور نصف صدی بعد کا زمانہ پایا ہے اور اس عہد کی تبدیلیوں اور کیفیتوں کو چشمِ عبرت سے دیکھا اور اس کے گرم و سرد کو زبانِ تجربہ سے چکھا ہے۔ اور اپنی اس خود نوشت سوانح عمری میں اپنی معلومات اور محسوسات کو بڑی سادگی اور بے تکلفی سے بیان کر دیا ہے۔

یہ کتاب اُنیسویں صدی کے ایک ایسے سادہ مزاج اور راست بیان شخص کے واردات و مشاہدات پر مشتمل ہے جس نے اپنے ملک میں اس صدی کا سب سے بڑا انقلاب اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کے نتائج و عواقب کو اپنی جان پر لیا تھا۔ پھر اسی سلسلے میں وہ ہندوستان کے دل سے نکل کر اس کے دور دراز گوشوں تک پہنچا اور زندگی کی متنوع کیفیتوں سے بدرجۂ شدید اثر پذیر ہوا۔ پس طرازِ ظہیری حقیقت میں انیسویں صدی کی ایک دلپذیر داستان ہے جسے شرفائے دہلی کے ایک خانماں برباد نمائندے نے بڑے دلآویز پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس بیان میں ظہیر کا اندازِ نظر ہمیشہ روشن اور دامنِ خیال ہمیشہ کشادہ رہا ہے اور یہی اس داستان کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ یہ کتاب آج سے کم و بیش چالیس برس پیشتر پہلی بار حبیبِ مکرم آغا محمد طاہر صاحب نبیرۂ حضرت آزاد کے اہتمام سے چھپی تھی۔ اب اُردو کے کلاسیکی ادب کے احیاء و تجدید کے ضمن میں جب اسکی دوبارہ اشاعت کا خیال پیدا ہوا، تو میں نے صاحبِ موصوف سے اسکی اشاعت کے حقوق مانگے اور بڑی آسانی سے حاصل کر لئے۔ آغا صاحب نے اس تصنیفِ لطیف کو روشناسِ خلق کر کے زبان و ادب پر ایک احسانِ بے پایاں کیا تھا، میں نے اس احسان کا محض سایہ دراز کرنے کی سعی کی ہے۔ خدا کرے کہ میری یہ ناچیز کوشش اہلِ ذوق اور اہلِ علم کو پسند آجائے۔

میری درخواست پر محبِ گرامی خان اصغر حسین خاں صاحب نظیر لدھیانوی نے اس کے مطبوعہ متن کی تصحیح و تدوین فرمائی اور ایک نظر افروز دیباچہ بھی رقم فرمایا۔ اُردو کے ایسے خادموں کا دم غنیمت ہے اور اس تجدد کے زمانے میں جو لوگ اب بھی اسلاف کا نام لیتے اور یادِ رفتگاں کو سینے سے لگائے پھرتے ہیں خانِ موصوف ان میں ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ اس کتاب کی طباعت کے سلسلے میں متعدد حادثات پیش آئے۔ بیشمار فرمے ضائع ہوئے پھر بھی چھپائی مرضی کے مطابق نہ ہو سکی۔ موجودہ زمانے میں بہت کم پریس اپنے کام سے دلچسپی رکھتے ہیں ورنہ صرف کاغذ سیاہ کرنا جانتے ہیں۔ اکادمی اب اپنے ذاتی پریس کا انتظام کر رہی ہے، خدا کرے یہ مرحلہ بہت جلد طے ہو جائے اور ہم جو محنت تدوین و نگارش میں صرف کرتے اور جو زرِ کمیاب اچھے کاغذ کی فراہمی اور عمدہ جلد کی تیاری میں خرچ کرتے ہیں، وہ ضائع ہونے سے بچ جائے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

خاکپائے رفتگاں **صلاح الدین احمد**

۱۸ مئی [illegible]

تمہید

بعد حمد و ستایش خداوندِ پاک اضعف العباد فقیر حقیر سیّد ظہیر الدین حسین ظہیرؔ دہلوی - خدمتِ احبابِ کرم فرما و مخلصانِ بے ریا و اصحابِ با صفا میں گزارش پرواز ہے کہ عرصہ بعید و مدت مدید سے اکثر محبّانِ باصفا و دوستانِ باوفا جویائے حالِ پُر اختلال اس شکستہ بال کے تھے اور کیفیت سرگذشت اس خود فراموش کی طلب فرماتے تھے، فقیرِ بے سروپا بخیال گذشت آنچہ گذشتؔ گذشتہ را صلواۃ تصوّر کر کے بلطائف الحیل ایّام گزاری کرتا رہا - انجام کار جب احبابِ صادق الوداد کا تقاضا حدِ اصرار سے تجاوز کر گیا اور فقیر کو بجز اقبال گنجائش عذر و معذرت نہ رہی اور خطوط کا ایک دفتر فراہم ہو گیا، ناچار بپاسِ خاطرِ چند محبّان اخلاص کیش قدرے اجزائے پُر ملال بسانِ نامۂ اعمال سیاہ کرنے کا اتفاق ہوا اور تمامی سرگزشت بطور سوانحمری روزِ ولادت سے تا زمانۂ شیخوخیت راست راست بے کم و کاست بلا تصنّع و بلا مبالغہ و ——— بلا تصرّف و بلا تحریف جو حوادث سر پر گزرے اور جو واقعات مدۃ العمر میں پیش آئے ہیں قلم برداشتہ بقیدِ تحریر لائے جاتے ہیں کسی کی توہین و مذمت و ستایش و مدحت سے سروکار نہیں صلہ و مُزد و تحسین و آفرین کا طلبگار نہیں - عبارت نگاری اور انشا پردازی سے بحث نہیں راست بیانی اور صدق گفتاری سے کام ہے - تقفیہ و تسجیع سے طبیعت عاری ہے - ہر چند کہ میری طرزِ تحریر آج کل کے عبارت نگاروں کے خلاف ہے، ہوا کرے - مجھے

اپنے ادائے مطلب سے مراد ہے۔ کسی کی عذب البیانی و رطب اللسانی سے کیا غرض میں اپنی سیدھی سادی روزمرہ کی بول چال میں اپنی سرگذشت لکھ رہا ہوں۔ اخبار نویس نہیں، قصہ خواں نہیں۔ میری جو زبان مادری ہے۔ زمانہ شیر خوارگی میں جو الفاظ اپنے پالنے والوں کی زبان سے سُنے ہیں وہ میرے ذہن نشین ہو گئے ہیں۔ اور میرے اُستاد و اتالیق نے جو مجھے تعلیم کئے ہیں وہ نقش کالحجر ہیں میری زبان اور میرے قلم سے وہ ہی کلمے نکلتے ہیں اب اگر لاکھ دوسروں کی تقلید کروں تو کیا ہو سکتا ہے، زبان مادری بدلی نہیں جا سکتی ہے۔

اکثر مکالمات اور بیانات میں جو الفاظ میں نے دوسروں کی زبان سے سُنے ہیں مِنْ وعَنْ وہ کے وہ ہی برقرار رکھے ہیں۔ اپنی جانب سے تبدّل اور تحریف کو روا نہیں رکھا۔ جو واقعات میری نظر سے گزرے اور بیانات کہ میں نے اپنے کان سے سُنے اُسی طرح درج صحیفہ کئے ہیں۔ دروغ بر گردنِ راوی۔

مثلاً ایامِ غدر میں جو معرکۂ جنگ کے حالات زبانی مردانِ فوجِ باغیہ میرے گوش گذار ہوئے وہ ہی لکھتا ہوں۔ اور بازاری گپوں کا اعتبار نہیں اُن سے مجھے احتراز ہے۔

پہلا باب

میرے آبا

شُنیدہ کے بود مانندِ دیدہ

چہ پرسی از سر و سامانیم عمر یست چوں کاکل سیہ بختم پریشان روزگارم خانہ بر دوشم

سلسلۂ نسب فقیر ظہیر حضرت علی مرتضےٰ شیر خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام تک پہنچ کر منتہی ہوتا ہے ستر ہ پشتیں جدِ امجد حضرت شاہ نعمت اللہ ولی رحمتہ اللہ علیہ تک پہنچتی ہیں اور حضرت شاہ نعمت اللہ ولی سے تا حضرت امام ہمام امام رضا علیہ السلام ہشت پشت منتہی ہوتی ہیں اور حضرت امام رضا علیہ السلام سے تا حضرت علی مرتضےٰ کرم اللہ وجہہ آٹھ پشت جاکر منتہی ہوتی ہیں۔ حضرت شاہ نعمت اللہ ولی کے نبیرگان شاہ نور اللہ اور شاہ حبیب اور شاہ محب اللہ خلف شاہ خلیل اللہ ابن شاہ نعمت اللہ ولی زمانۂ سلطنت بہمنیہ میں حسب الطلب بادشاہِ بہمنیہ ہندوستان میں تشریف لائے اور بادشاہِ بہمنیہ کے پیر و مرشد تھے۔ چنانچہ مزارِ مبارک بزرگوارِ ممدوح کا شہر بیدر تخت گاہ شاہان دکن میں اب تک موجود ہے۔

دیگر بزرگانِ فقیر دربارِ سلاطین گورگانیہ آلِ تیمور میں عہدہ ہائے جلیلہ و مناصبِ عظمٰے پر فائز و ممتاز ہوتے چلے آئے ہیں حتّیٰ کہ تا اختتام سلطنتِ تیموریہ بادشاہِ اخیر حضرت سراج الدّین محمد ابو الظفر بہادر شاہ بادشاہ دہلی عالی والدِ بزرگوارِ فقیر حقیر اعنی حضرت شاہ جلال الدّین حیدر المخاطب بہ خطاب حاذق الدولہ مرصع رقم خاں بہادر منصبِ اُستادی حضرتِ بادشاہ عرش آرامگاہ پر سرفراز تھے - و نیز فقیر ظہیر سن دوازدہ سالگی میں بخدمتِ دارو غگی قوربیگی میں سرفراز کیا گیا تھا اور تمام کارخانہ جلوس شاہی مثل ماہی و مراتب و علم و سواری و چتر فقیر کی تفویض میں تھا - و بصلہ خدمتگاری خطاب راقم الدولہ داروغہ قوربیگی پیش گاہِ سلطنت سے عطا ہوا تھا - عاملانِ عہدہ ہائے مذکورہ بالا ماتحت فقیر حقیر تھے -

میری ولادت

حال ولادتِ فقیر شکستہ بال بدیں عنوان ہے کہ والدینِ فقیر و جدِّ امجدِ فقیر کو اولاد کی نہایت تمنّا تھی قبل ولادتِ فقیر چند اولاد والدِ امجد تلف ہو چکے تھے - جب میں پیدا ہوا تو میرے بزرگوں کو نہایت خوشی حاصل ہوئی اور غایت ناز و نعم سے میری پرورش ہونے لگی - تمام گھر کی آنکھ کی پتلی کا تارا میں تھا اور والد بزرگوار اُس زمانہ میں لکھنؤ بدربار ہمہ بلیش قرار ملازم تھے اور جدِّ بزرگوار دہلی میں حضرت بادشاہ کے خطِ نسخ میں اُستاد تھے -

جب میرا سن چار سالگی کو پہنچا تو میری والدہ نے مجھے روزہ رکھوایا - کیونکہ انھوں نے خدا کی جناب میں منّت مانی تھی - نہایت دھوم سے روزہ کشائی کی تقریب عمل میں آئی - زاں بعد میں ساڑھے چار برس کا ہوا تو میرا ختنہ کرایا گیا - اور میری مسلمانی اور تسمیہ خوانی کی تقریب شامل کر کے بڑی دھوم سے شادئی بسم اللہ کی تمام شہر کے عمائد و امراد

شاہزادگان وغیرہ فراہم ہوئے تھے اور دو روز تک محفلِ رقص و سُرود گرم رہی اور تمام عمائد کے یہاں تورے تقسیم کئے گئے۔ چند روز تک پخت طعام اور تورہ بندی جاری رہی۔

میں نے اپنے والدِ بزرگوار کی زبانی سُنا ہے کہ "تیری بسم اللہ کے روز عزیز و اقارب وغیرہ نے سَو اشرفی تیرے ہاتوں میں دی تھیں"۔ غرضکہ میری بسم اللہ اس دھوم سے ہوئی تھی کہ میری شادی کتخدائی بھی اس دھوم سے نہیں ہوئی۔

تعلیم

بعد بسم اللہ مجھے مکتب میں بٹھایا گیا اور جناب اُستاد شیخ صفدر علی صاحب میری اتالیقی اور اُستادی پر مقرر ہوئے۔ اور بہت سے اطفالِ ہمسن میرے ہم مکتب ہوئے۔ میں نے ابجد خوانی کے بعد کلام مجید شروع کیا اور ہمراہ پند نامہ سعدی۔ جب کلام مجید ختم کیا تو گلستان و بوستان بھی میں ختم کر چکا تھا اور کتبِ درسیہ مثل بہارِ دانش و یوسف زلیخا و دیگر انشاء وغیرہ دیکھتا تھا۔ ابو الفضل۔ سکندر نامہ تک میں نے شیخ صاحب مرحوم سے پڑھا۔ اور بعد کتب دیگر پنج رقعہ و سہ نثر ظہوری و ملا طغرا۔ قصائد عُرفی و خاقانی۔ و فارغ نعمت خان عالی مختلف اُستادوں سے پڑھیں۔ بعد مطالعہ کتبِ فارسی، کتبِ عربی کا مطالعہ میں نے مولانا قاری سیّد جعفر علی سے مدرسہ میں کیا۔ غرضکہ سن دوازدہ سالگی تک درس و تدریس کا اتفاق ہُوا اور بعد ملازمتِ شاہی کے نوکری سے فرصت نہ حاصل ہوئی کہ تحصیل عربی تکمیل کو پہنچی۔ ہدایۃ النحو تک میں نے صرف نحو دیکھی ہے مگر ہاں کتب سیر و تواریخ مثل روضۃ الصفا و روضۃ الاحباب و تاریخ و شاہنامہ وغیرہ میری نظر سے گزرے ہیں۔

شاعری کا آغاز

ابتدا شعر و سُخن کی یہ ہے کہ میں جس زمانہ میں بہارِ دانش و زلیخا پڑھتا تھا ایک روز والدِ بزرگوار کے ایک دوست قدیم میاں

نبی بخش صاحب بنبیئہ شاہ نصیر مرحوم تشریف لائے اور میرے مکتب ہی میں دونو بزرگوار بیٹھے ہوئے تھے کہ میاں نبی بخش صاحب نے ایک شعر کسی اُستاد کا پڑھا میرے والد نے فرمایا کہ کیا لاجواب وعمدہ مطلع کہا ہے۔ سبحان اللہ

وہ یہ شعر تھا ؎

گردشِ لیل و نہار دیکھئے کبتک رہے
ہم سے پھری چشم یار دیکھئے کبتک رہے

مطلع کا کلمہ سن کر میرے کان کھڑے ہوئے، ڈرتے ڈرتے اپنے والدِ بزرگوار سے دریافت کیا کہ مطلع کے معنی کیا ہیں اور مطلع کسے کہتے ہیں۔ والد ماجد نے پہلے تو مجھے مطلع و مقطع کے معنی سمجھائے اور پھر فرمایا کہ علم عروض میں اول جو شعر لکھا جاتا ہے اُس کے دونو مصرعوں میں قافیہ ہوتا ہے اُسے مطلع کہتے ہیں اور جس کے اخیر مصرع میں قافیہ ہو اُسے شعر کہتے ہیں اور شعر کی تعریف بیان کی۔ غرضکہ سب ارشادات جنابِ ممدوح میرے ذہن نشین ہو گئے اور میں نے فی البدیہہ ایک مطلع اور ایک شعر اسی وزن پر موزوں کر کے پڑھا تو والدِ بزرگوار اور عموی صاحب میاں نبی بخش صاحب نہایت خوش ہوئے اور میاں نبی بخش صاحب نے مجھے پیار کیا اور کہا کہ تو لا کلام شاعر ہوگا۔ وہ مطلع اور شعر یہ ہیں۔ (مطلع)

مجھ سے یہ دار و مدار دیکھئے کب تک رہے
صحبتِ اغیار و یار دیکھئے کب تک رہے

میری طرف سے غبار دیکھئے کب تک رہے
غیر سے دل تیرا یار صاف ہے آئینہ وار

بس وہ تعریف اور عنایات اُن بزرگواروں کی میرے حق میں بارود میں شتابہ اور سونے پر سہاگہ کا کام کر گئی۔ اور مجھے شوقِ شعر و سخن پیدا ہو گیا اور روز بروز نادوسبی جوانی کی طرح ترقی پذیر ہوتا چلا گیا۔ اب یہ کیفیت ہوئی کہ جس کی زبان سے شعر اچھا سنا وہ

دل میں نقش ہو گیا۔ گھر کے کتب خانہ کو دیکھا تو اہلِ فارس کے دواوین بکثرت نظر آئے شعرائے فارس کے انتخاب بطور تذکرہ گھر میں موجود تھے ان کو دیکھنا شروع کیا اردو کی غزل جس اُستاد کی سُنی یاد کر لی۔ دیوان ناسخ اور آتش اور واسوخت اور مثنویاں وغیرہ لکھنؤ سے چھپ کر تازہ تازہ دلی میں آئی تھیں۔ شبانہ روز ان کے دیکھنے کا مشغلہ رہنے لگا۔ ایک دو غزلیں بھی ٹوٹی پھوٹی لکھیں اور میاں نبی بخش صاحب کو دکھائیں لیکن والد صاحب منع فرماتے تھے کہ تو شعر نہ لکھا کر۔ حالانکہ خود شاعر لاجواب تھے۔ شاہ نصیر صاحب کے شاگرد تھے۔ غرضکہ انہیں ایام میں حافظ قطب الدین صاحب مشیرؔ شاگرد شاہ نصیر صاحب مرحوم نے شاہ صاحب کے مکان میں مشاعرہ قرار دیا۔ چونکہ مکانِ مشاعرہ میرے مکان سے بہت قریب تھا میں شاملِ بزم ہونے لگا۔ اوّل غزل میں نے اسی مشاعرہ میں پڑھی ہے۔ اور جناب شیخ محمد ابراہیم صاحب ذوقؔ خاقانی ہند کا جا کر شاگرد ہوا۔ اور داغؔ صاحب بھی شریکِ مشاعرہ تھے اور بہت سے نام آور شعرا موجود تھے۔ میرا سن کم و بیش اُس زمانہ میں چودہ سال کا ہو گا۔ اس کے بعد دہلی میں ایک دو جگہ اور مشاعرے ہوئے تو میں ان میں شریک نہ تھا طبعی طور پر طبع آزمائی کیا کرتا تھا حضرتِ اُستادِ مرحوم کی خدمت میں جانے کا اتفاق تو ہمیشہ ہوتا لیکن غزلیں اکثر ہی دکھانے کا اتفاق ہوا۔ اِلّا فیضانِ محبت اُستاد سے بہت کچھ فائدہ حاصل ہوا میں نے جب غزل بنا بر اصلاح پیش کی اور جناب ممدوح نے اسے ملاحظہ فرمایا جب مقطع پر نظر پڑی تو خوش ہو کر یہ شعر پڑھا ؎

دیوانِ ظہیر فاریابی | در کعبہ بدزد گر بیابی

اور نیز زبانِ فیض ترجمان سے فرمایا کہ انشاء اللہ تو شاعر ہو گا۔ اسی کلام معجز نظام کا تصرف ہے جو میری زبان سے جاری ہوتا ہے۔ بعد انتقال اُستادِ مرحوم چند قصائد اور

اکثر غزل نگاری کا اتفاق ہوا۔ مگر افسوس ہے کہ وہ سب سرمایہ ایّامِ غدر میں تلف ہو گیا۔ فقط دو غزلیں کہ مشہور ہو گئی تھیں اور لوگوں کو یاد تھیں اور مجھے بھی چند شعر یاد رہے۔ وہ باقی رہے اور سب کلام ضائع ہو گیا۔ ازانجملہ ایک دو شعر مجھے یاد ہیں۔ مطلع قصیدہ در مدحِ بادشاہ۔

ہوائے موسمِ باراں سے کچھ بعید نہیں ۔۔۔ بنے جو خانۂ گلشن نگار خانۂ چیں
نسیم آیۂ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلیٰ ۔۔۔ گلوں کے کان میں کرتی ہے صبحدم تلقیں

شعر قصیدۂ دوم در مدح ولیعہد ؎

نسیم مست نکلتی ہے جوشِ مستی میں ۔۔۔ لپٹ لپٹ کے جوانانِ باغ سے ہر بار

اشعار قصیدہ در مدح محبوب علی خاں مختار بادشاہ ؎

سال میں ایک مہینہ رمضاں کا ٹھیرا ۔۔۔ حکم کرتا ہے پئے صوم خدائے متعال
اور مجھے چار مہینے متواتر گزرے ۔۔۔ آخری ماہ جمادی سے لگا تا شوال
روزے رکھوائے مجھے چار مہینے پیہم ۔۔۔ لیکن آیا مرے افطار کا اب تک نہ خیال

ایک غزل حسبِ فرمایش مہاراجہ جیت سنگھ عموئی مہاراجہ والیِ ریاست پٹیالہ جس کے صلہ میں ایک ہزار روپیہ کی گھڑی مجھے عنایت ہوئی تھی دو سو روپیہ مطلع کے اور آٹھ سو روپیہ آٹھ شعروں کے حساب سے صلہ عطا ہوا تھا۔ مطلع تھا ؎

خوں بہائے عاشقِ ناشاد کیا ۔۔۔ دلبروں کی داد کیا فریاد کیا

دوسری غزل کے دو شعر ؎

چاہت کا جب مزا ہے کہ ہوں وہ بھی بیقرار ۔۔۔ دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

سوائے اِن دو غزلوں کے کلامِ سابقہ میں سے کچھ باقی نہ رہا +

اساتذہ اور معاصرین

بعد انتقال حکیم مومن خاں صاحب و شیخ محمد ابراہیم ذوق مرحوم و مغفور کے مرزا اسد اللہ خاں صاحب غالب مفتی صدر الدین خاں صاحب آزردہ حکیم آغا جان صاحب عیش۔ غلام علی خاں صاحب وحشت[1] اور نواب مصطفےٰ خاں صاحب شیفتہ مشاہیر روزگار مستند اوستادی کے سزاوار تھے ان حضرات کے قطع نظر ہم لوگ نوخیزوں میں تصوّر کئے جاتے تھے درجۂ اوّل پر مرزا زین العابدین خاں صاحب عارف[2] درجۂ دوم سید معین الدین صاحب معین درجہ سوم حافظ قطب الدین صاحب مشیر۔ مگر حافظ مرد سن اور کہنہ مشق تھے۔ اُن کے شاگرد بھی بکثرت ہیں۔ اُن کو درجۂ دوم میں تصوّر کرنا زیبا ہے۔ علیٰ ہذالقیاس مرزا رحیم الدین صاحب حیا بھی خوش بیان اور کہنہ مشق درجہ دوم میں شمار ہوتے تھے۔ اُن کا کلام بھی پایۂ اُستادی سے ہم پایہ تھا۔ ان بزرگوار وں کے بعد چند نوجوان نوخیز۔ نوعمر۔ شوخ طبع باذاق۔ جدّت پسند نازک خیال ہمعصر کہ زمانہ حال کے موافق اگر غور کیا جائے تو ہر ایک یگانۂ روزگار تھا۔ نواب مرزا خاں

---

[1] مرزا غالب نے اس شعر میں انہیں کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مرگیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں!

[2] مرزا زین العابدین خاں عارف۔ مرزا غالب کی بیوی کے بھتیجے تھے۔ شاعری میں مرزا ہی کے شاگرد تھے۔ عین جوانی میں وفات پائی۔ مرزا غالب نے انہیں کی وفات پر کہا تھا ؎

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

صاحب داغ ۔ میر مہدی حسین صاحب مجروح ۔ سید شجاع الدین عرف امراؤ مرزا تخلص انور ۔ مرزا قربان بیگ صاحب سالک ۔ مولوی عبدالکریم صاحب سوز خلف مولوی امام بخش صاحب صہبائی ۔ حکیم غلام مولےٰ قلق شہزادہ مرزا پیارے صاحب شہرت ۔ مرزا قادر بخش صاحب صابر ۔ میاں خدا بخش صاحب تنویر ۔ غلام احمد صاحب تصویر ۔ عبدالقادر صاحب توقیر ۔ یوسف علی خاں صاحب عزیز ۔ مولوی امیر مرزا خورشید ۔ میاں تشنہ صاحب، آغا مرزا صاحب برادر خورد داغ صاحب تخلص شاغل ۔

اس قدر احباب ایک مکان پر وقت شام بلاناغہ ہم جلیس ہوتے تھے اور باہم داد سخن دیتے تھے ۔ زمانہ غدر تک یہ گلزار سخن شاداب و سیراب تھا اور یہ خوشنوایان چمن ایک جا فراہم ہو کہ نواسنجیاں کرتے تھے فقیر بھی اُس بوستان تاراج شدہ کا ایک نخل خزاں رسیدہ ہے ہیہات ہیہات کیا تھا کیا ہوگیا ۔ زمانہ غدر کے بعد اُس مرقع کا شیرازۂ جمعیت درہم برہم ہو کر ورق ورق منتشر ہوگیا ۔

والدہ کی وفات پہلے شفقت والدین کا حال معرض بیان میں آچکا ہے ۔ اب اعادہ اُس کا فضول ہے ۔ خصوصاً والدۂ فقیر کہ بسبب ہاہر دری

لہ سید شجاع الدین عرف امراؤ مرزا انور حضرت ظہیر مصنف کتاب ہذا کے چھوٹے بھائی تھے اُستاد ذوق کے شاگرد تھے ۔ بعد میں مرزا غالب ۔ سے بھی اصلاح لی لیکن شعر میں مومن کے مقلد تھے ۔ یہ شعر انہیں ہے ۔

نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے
پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

انور ۳۸ سال کی عمر میں بمقام جے پور فوت ہوئے (نظیر)

مجھ پر اور میرے چھوٹے بھائی پر جان و دل سے فدا تھیں۔ اور شبانہ
روز ہم دونوں کو مثلِ مردمِ چشم آنکھوں میں رکھتی تھیں۔ بے مہریِ چرخِ تفرقہ پرداز
سے سنِ ہشت سالگی میں اُن کا سایہ دامانِ عاطفت میرے سر سے اُٹھ گیا اور وہ
مخدومۂ مہربان مجھے اور میرے بھائی کو والد بزرگوار کے سپرد کر کے داعیِ اجل کو لبیک کہہ کر
رہگرائے روضۂ جنت ہوئیں۔ مجھے اوّل وہی صدمہ مہاجرت مادرِ مہربان کا ہوا لیکن
وقتِ رحلت میری مادرِ مہربان نے بحالتِ ہوش و حواس بموجودگی اپنے جملہ بزرگان
و عزیزان پہلے ہم دونوں بھائیوں کو گلے سے لگایا اور بہ کمالِ حسرت و یاس ہمارے والد
بزرگوار کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر کہا کہ آپ کو ان دونوں کی نسبت مہر و محبتِ پدری
تو ہے لیکن ان کی نسبت مہرِ مادری بھی ضرور ہے۔ کیونکہ اب یہ بے ماں کے ہوتے
ہیں۔ ان کے ساتھ مہرِ مادری رکھنے والا سوائے تمہارے کون ہے۔ اگر آپ نے اُن کی
نسبت کم توجہی کو کام فرمایا تو میں حشر میں دامنگیر ہونگی۔ یہ کہہ کر اور کلمہ شہادت پڑھ کر راہیِ
جنت ہوئیں۔ لیکن والد بزرگوار نے حسبِ وصیت مخدومہ فی الحقیقت محبتِ پدری و
مہرِ مادری دونوں کو کام فرمایا۔ میری پرورش اور ناز برداری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت
نہیں فرمایا اور استاد تعلیم و تربیت پر مقرر فرمائے۔ ہزارہا روپیہ میں نے بیدریغ صرف کیا۔ زمانۂ
طفولیت میں پتنگ اور کبوتروں میں صدہا روپے برباد کئے مگر جنابِ ممدوح نے مجھ سے کبھی
دریغ نہ فرمائے جو طلب کیا وہ مجھے دیا۔ جب میں سنِ بلوغت کے قریب پہنچا تو مجھے گھوڑے
کی سواری کا شوق ہوا دو دو گھوڑے خریدے اور اُن کو کھلایا اور تیار کیا۔ چڑھا
اُترا۔ مگر یہ سب صرف اُس جناب کے ذمہ رہا۔ مجھے ایک اُستاد چابک سوار
کا شاگرد کرایا اور سواری سکھلائی۔ گھوڑے کا بنانا اور چڑھنا۔ تیار کرنا اور

عیب و صواب سے آگاہ ہونا یہ سب باتیں میرے استاد نے بتائیں۔

معمول و مشاغل میں علی الصباح قبل از نماز بامداد سوار ہو کر نوکری میں جایا کرتا اور قبل از برآمدن حضور پرنور زیر جھروکہ شاہی جا کر حاضر ہو جایا کرتا تھا جس وقت حضور برآمد ہوتے قلمدان کمر میں لگا کر ہوادار کے ہمراہ ہو لیتا تھا جو کچھ شعر اشعار ہنگام سواری موزوں ہوا کرتے تھے لکھتا جاتا تھا۔ مگر جب تھوڑی دور پیادہ پا ہمراہ چلتا تھا تو ازراہ الطاف خسروانہ حکم صادر ہو جاتا تھا کہ سوار ہو لے عقب سواری مبارک دو ہاتھی رہا کرتے تھے۔ اُن میں سے ایک پر سوار ہو جاتا تھا۔ میری سواری کا گھوڑا کوتل میرے ہمراہ رہتا تھا کبھی اُس پر سوار ہو لیتا تھا۔ قصہ مختصر نو بجے کے بعد مکان پر واپس آجاتا تھا۔ میری نشست کا دیوان خانہ علیحدہ تھا۔ میرا چھوٹا بھائی امراؤ مرزا انور اور برادر عمہ زاد امیر مرزا خورشید ہم تینوں بھائی اُس دیوانخانہ میں نشست رکھتے تھے نو بجے صبح کے بعد دوست احباب فراہم ہوتے تھے اور اکثر طالب علم بھی ہمارے پاس سبق کو آتے تھے۔ دو گھنٹے کامل درس و تدریس کا شغل رہتا۔ اس اثنا میں شعر اشعار کا بھی تذکرہ ہو جاتا تھا۔ دواوین فارسی اور تذکرہ جات کی اشعار خوانی رہتی تھی۔ بعد گیارہ بجے صحبت برخاست ہو جاتی تھی میں گھر میں جا کر کھانا کھاتا اور بعد تناولِ طعام گھنٹہ دو گھنٹے استراحت کر کے بیدار ہوتا تھا تو پھر احبابِ محلہ آ بیٹھتے تھے گنجفہ چوسر وغیرہ کا شغل رہتا تھا۔ پانچ بجے دن کے گھوڑے پر سوار ہو کر بازار کی سیر کو چلا جاتا تھا۔ بعدِ مغرب مکان پر آتا تھا۔ اور پھر احباب کا مجمع رہتا تھا۔ ہر طرح کی دل لگی رہتی تھی۔ ایک دو ستار نواز آجاتے۔ ستار طبلہ وغیرہ

سے دل کو فرحت ہوتی تھی یا کسی اور شغل میں دل بہلاتے تھے۔ کبھی ایک دو دوست متفق ہو کر کسی دل لگی کی صحبت میں چلے جاتے تھے غرض گیارہ بجے شب تک اپنی خوش طبعی میں بسر کرتے تھے۔ کسی طرح فکر و غم لاحق حال نہ ہوتا تھا دن عید رات شب برات کی مانند بسر ہوتی تھی۔ سوائے ہنسنے ہنسانے کے اور خوش طبعی کے کوئی رنج پاس نہ پھٹکتا تھا۔ کوئی میلا تماشا ایسا نہ ہوتا تھا جہاں اس مجمعِ احباب کا گزر نہ ہوتا عجب ایک صحبتِ رنگین یارانِ خوش باش، خوش معاش لطیفہ سنج بذلہ گو، ظریف الطبع کی فراہم ہوتی تھی جن کو دنیا و مافیہا سے کچھ خبر نہ تھی۔ دن رات چہچہوں سے کام تھا۔ اس صحبت میں سب شریف زادے امیر زادے وغیرہ مجتمع تھے کوئی بد وضع بد پیشہ، بد معاش ہماری صحبت میں باریاب نہ ہوتا تھا۔ شہر کے شرفا میں سے ہر فن اور ہر کمال کا آدمی ہمارے پاس آتا جاتا تھا جو کسی فن کا اہلِ کمال دتی میں وارد ہوتا تھا۔ ایک بار میرے مکان پر بھی ضرور اس کا گزر ہوتا تھا۔ غرضکہ اس خوشحالی اور فارغ البالی سے زمانۂ غدر تک بسر اوقات ہوئی۔

غدر سے چار ماہ پیشتر میری شادی ہوئی۔ اس زمانہ میں میرا سن کم و زیادہ بائیس سال کے قریب تھا کہ زمانۂ غدار و فلکِ ناہنجار نے یہ آتش فتنہ و فساد برپا کی۔ اور سنگِ حوادثِ آسودگانِ بسترِ خوابِ ناز کے سر پر برسانے شروع کئے ۔ وہ صحبتیں عیش و عشرت کی سب ایک قلم درہم و برہم ہو گئیں۔ ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

ملازمت

اول تو والد بزرگوار ہر طرح کی ناز برداری فرماتے تھے۔ دوم میں اپنی ذات سے بھی پچاس روپے ماہوار کا ملازم تھا تیسرے بباعثِ شعرو

سخن راجہ اجیت سنگھ بہادر والیٔ پٹیالہ قدردانی فرماکر میرے ساتھ مسلوک ہوتے تھے
چہارم خرید و فروختِ اسپاں میں مجھے مفادِ کثیر ہوتا رہتا تھا کبھی شکایتِ تنگ دستی
نہ ہونے پاتی تھی۔ مہاراجہ اجیت سنگھ بہادر والیٔ پٹیالہ نے صلۂ غزل فرمائشی
گھڑی معہ زنجیر طلائی قیمتی ایک ہزار روپیہ۔

صلۂ قصیدۂ مدحیہ، خلعت دوشالہ زرّیں و سیلا مندیل بنارسی و پارچہ قیمتی
شش صد روپیہ عطا فرمایا۔

جب میرا سن تیرہ برس کا ہوا تو میری والدہ کے خالو مرزا خان صاحب نے رحلت
فرمائی اور وہ لاولد تھے۔ داروغائی ماہی مراتب کی ان کے نام تھی وہ داروغائی خالی
ہوئی۔ اس پر امیدواروں کی درخواستیں بکثرت گذریں، اس سے پیشتر میری جا مزباشی
حضور میں ہو چکی تھی۔ آٹھ برس کی عمر سے محل میں آتا جاتا تھا میں بادشاہ کا شاگرد
ہو گیا تھا، اصلاح لینے جایا کرتا تھا میرے والد نے اس موقع کو بہت غنیمت سمجھ کر
حضور میں عرض کی کہ خانہ زاد کا سن قریب پیری کے پہنچ کر ہے امیدوار ہوں کہ غلام زادے
سے نوکری لی جائے اور پیشگاہِ حضور سے سب استادزادگان کی پرورش ہوگئی ہے
اِلّا غلام ہنوز محروم ہے۔ یہ خدمت غلام زادے کو عطا فرمائی جائے کہ یہ ہر دو طرح
سے مستحق اس عطیۂ کبرے کا ہے از روئے قرابت بھی اور میری جانب سے امیدوارِ
پرورش ہے۔ چنانچہ وہ درخواست مقرونِ اجازت ہوئی اور داروغائی ماہی مراتب
پر مجھے سرفراز فرمایا گیا اور بمقام[1] خواجہ صاحب میں خلعت درد غائی اور خطاب راقم الدولہ
سید ظہیر الدین حسین خاں داروغہ فوز بیگی عنایت ہوا اور میں نوکری میں حاضر باش رہنے

[1] خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی درگاہ سے مراد ہے۔

لگا۔ جب سواری مبارک خواجہ صاحب میں رہتی تھی۔ میں وہیں رہتا تھا۔ دونوں وقت خواصہ کا خوان میرے واسطے محل سے آتا اور میں ایک دن بھی رکابِ سعادت سے جدا نہ ہوتا تھا۔ تیرہ برس سے بائیس سال کی عمر تک نوکری میں حاضر رہا۔ غدر میں جب بادشاہ کے سب ملازموں کو جدا کیا گیا ہے۔ میں بھی جدا ہوا ہوں۔

شادی

اور اسی سن سیزدہ سالگی میں میری نسبت قرار پائی۔ منگنی ہوگئی۔ بعد تین سال کے میرا عقد نکاح بھی ہوگیا۔ لیکن شادی کے رسوم ادا نہیں ہوئے تھے۔ ساچق مہندی۔ برات چوتھی وغیرہ باقی تھیں۔ رخصت نہ ہوئی تھی۔ سامان جہیز وغیرہ سب امانت رکھا ہوا تھا۔ میرا آغازِ شباب تھا۔ بسبب امورِ خلافِ تہذیب شادی کرنے میں مجھے تامل تھا۔ ایام گزاری کرتا تھا۔ اسی وجہ سے والدِ مہربان مجھ سے ناراض تھے۔ مجھے سلام کی اجازت نہ تھی۔ مگر میری والدہ نے مجھے لے جاکر اُن کے قدموں پہ ڈال دیا اور میرا قصور معاف کرایا اور میں شادی کرنے پر رضامند ہوگیا۔ دھوم دھام سے میری شادی ہوئی۔ اور سب رسومات حسبِ دستور ساچق مہندی برات ادا ہوئیں۔ رخصت بھی حسبِ زمانہ تکلف سے ہوئی۔ جہیز بھی پانچ ہزار روپیہ کا ملا۔ سب باتیں ہنسی خوشی دل لگی کے ساتھ ہوئیں۔ بعد انفراغِ شادی سب سامان جہیز کا کوٹھوں میں داخل کرکے قفل لگادیئے گئے۔ اپنے گھر کا سامان استعمال میں لایا گیا۔

تباہی کی پیش گوئی

بعد چار ماہ کے غدر صاحب نازل ہوئے اُس سامان میں سے ایک چھلا بکار آمد نہ ہوا۔ وہ سب سرکار انگریزی کے نذر ہوا اُس کے علاوہ چالیس ہزار روپیہ سے زائد کا اثاث البیت جو زمانہ بزرگان سے اندوختہ چلا آتا تھا۔ وہ سب دستبردِ افواجِ انگریزی میں تاراج ہوا۔ ایسی ایسی نایاب چیزیں تلف

ہوئیں کہ جن کی نظیر ملنی محال ہے ۔میں جلد کلام مجید مطلا مذہب جدّ بزرگوار کے ہاتھ کے
اور سات کلام اللہ والد ماجد کے ہاتھ کے کاغذ یزدی کاشانی پانچ روپیہ دستہ پر اور
بنا تیاری علاوہ اور ہزار جلد کتاب ہر اقسام کی وہ سب لٹ لٹا کر برابر ہو گیا۔ کوئی تین
سو روپیہ کی کتابیں مثل تاریخ روضۃ الصفا۔ تاریخ فرشتہ۔ شاہنامہ و دیگر کتب میرے
والد نے میرے لئے مجھی سے منگائی تھیں۔ لوٹ میں گئیں۔ میری شادی کے ایک ماہ بعد میری
چھوٹی بہن کی شادی قرار پائی۔ میری بی بی اور میرے بہنوئی آغا سلطان بخشی باہم ماموں
پھوپھی کے بہن بھائی تھے۔ اس شادی کے سامان وغیرہ میں مہینہ بیس روز صرف ہو گئے
اس کے ایک مہینہ بعد رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہوا مجھے تو شادی کے
دو مہینہ بعد بھی عیش و آرام سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ ساتویں تاریخ رمضان کو شام کے
وقت میں اور میرا بھائی امراؤ مرزا انور گھر سے روزہ بہلانے کے واسطے جامع مسجد
کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر گزری کی سیر کر کے گھر کو واپس آنے لگے تو وقت
تنگ ہو گیا تھا۔ میں نے بھائی سے کہا چلو مٹیا محل میں چل کر روزہ کھولیں گے میں اپنی
سسرال میں گیا۔ میرے والوں نے اندر اطلاع کی۔ گھر میں سے مبارک خادمہ نے آکر
کہا میاں آتے کیوں نہیں۔ تم سے چھپنے والا کون ہے۔ فقط تمہاری خوشدامن ہیں۔
اور باقی سب بڑی بیگم صاحبہ کے ہمراہ بخشی جی کی شادی میں مہمان گئے ہوئے ہیں۔ فقط
نواب صاحب اور تمہاری بھابو ہیں۔ میں نے کہا کہ میرا چھوٹا بھائی میرے ساتھ ہے۔
تم پردہ کرا دو۔ غرض کہ وہ دالان میں چلی گئیں۔ چلمنیں چھوٹ گئیں۔ پردہ ہو گیا۔ باہر
مکان کے صحن میں بنگلے کے آگے تختوں کا فرش تھا۔ وہاں نواب صاحب میرے خسر
بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اور میرے بھائی نے آگے بڑھ کر آداب کیا۔ فرمایا آؤ بیٹا

بیٹھ جاؤ۔ میں ہنوز بیٹھا ہی ہوں۔ اور میرا بھائی میری برابر میں ہے کہ یکایک روزے کی توپ کی آواز آئی۔ روزہ افطار کر کے نماز پڑھی گئی۔ پھر کھانے کا دستر خوان بچھا کھانا کھانے بیٹھے۔ دو لقمے کھا کر میرے خسر مجھ سے فرمانے لگے بھئی نواب مرزا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہر میں تلوار چلے اور خونریزی عظیم ہو میں نے عرض کی حضرت آپ بزرگ ہیں آپ یوں ہی فرمایا کرتے ہیں۔ شہر میں تلوار چلنے کے کون سے آثار ہیں۔

نواب صاحب۔ بیٹا تم کیا میری بات کو خلاف جانتے ہو۔ خدا کی قسم ایسا امر ہونے والا ہے جب تو مجھے یقین کامل ہوا کہ اِن کی بات کبھی خلاف نہیں ہوتی۔ میں نے پوچھا کیا روس کی فوج آئے گی۔

نواب صاحب:۔ اس کا علم اللہ کو ہے،

پھر میں نے پوچھا کہ حضرت یہ امر کب تک ہونے والا ہے۔

نواب صاحب:۔ کہنے والے تو یہی کہتے ہیں کہ جو کچھ ہونا ہے۔ اسی رمضان میں ہو جائے اور بھئی دیکھو میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ میں بھی شہید ہوں گا۔ میں نے عرض کی حضرت خدا کے لئے آپ یہ تو نہ فرمائیے۔ خدا آپ کو ہمارے سر پر زندہ اور سلامت رکھے آپ ہماری سپر ہیں۔

نواب صاحب:۔ مشیّت ایزدی سے کچھ چارہ نہیں۔

القصّہ ہم دونوں بھائی کھانا اور پان کھا کر رخصت لے کر اپنے گھر آئے +

دوسرا باب

سلطنتِ مغلیہ کی حالت

جہاں کھودو وہیں بنیاد کے پتھر نکلتے ہیں
بہت معمورۂ ہستی میں اجڑے گھر نکلتے ہیں
فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَارِ

ہر چند سلطنت تو ڈیڑھ سو برس پیشتر خاندانِ عالی شانِ تیموریہ و دودمانِ اولوالعزم گورگانیہ کو ہذا فراق بینی و بینک کہہ کر رخصت ہو چکی تھی برائے نام بادشاہت رہ گئی تھی کیونکہ ایک چھوٹی سے چھوٹی ریاست ہندوستانی کے برابر بھی بادشاہ دہلی کو وسعتِ مقدرت واستطاعت نہ رہی تھی۔ بقول سوداؔ[1]

کہ ایک شخص ہے بائیس صوبہ کا خاوند   رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداری کول

فقط ایک لاکھ روپیہ ماہوار تو سرکارِ انگریزی سے آتا تھا اور کسی قدر پرگنات ومحالات وتہ بازاری وکرایہ دکاکین وآمدنی باغات وطیول ونزول خالصہ وغیرہ کی آمدنی تھی من کل الوجوہ سوا لاکھ روپیہ ماہوار تصور کر لینا چاہیے مگر عظمتِ جلال

[1] سوداؔ کی مراد مغل بادشاہ یعنی شاہ عالم ثانی سے ہے۔ عہدِ مغلیہ میں ہندوستان ۲۲ صوبوں میں منقسم تھا (ناظر)

شان وشوکت وتزک واحتشام وادب وآداب دربار وانتظام سواری کو دیکھ کر
معلوم ہوتا تھا کہ ہاں کسی زمانے میں یہ خاندانِ عالی شان سزاوار فرمانروائی ہندوستان
جنت نشان ہوگا۔ چل چلاؤ مگر باوجود اختلاط وکثرتِ تمول وقلتِ معاش دو امر حیرت خیز
وتعجب انگیز ایسے نظر سے گزرے ہیں کہ مجھے آج تک ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا
ہے۔ اوّل تو خدائے عالم نے اُس لاکھ روپیہ میں ایسی برکت عطا فرمائی تھی کہ وہ
خیر وبرکت ووسعت واستطاعت کروڑوں روپیہ کی ریاستوں میں بھی نہ دیکھی ؎

شریف اگر متضعف شود خیال مبند　　　　که پایگاہِ بلندش ضعیف خواہد شد

چار روپیہ کا سپاہی ہے وہ بھی خوشحال ہے اور بیش قرار درماہہ وار ہے سو وہ بھی
مالامال ہے۔ گردشِ روزگار کا کسی کو شاکی نہ پایا۔ یہ ثمرۂ خوش نیتی تو نتیجہ علو ہمتی کا ہے۔
دوم قرائنِ دربارِ سلطانی وسطوتِ جہانبانی جو دربارِ شاہی میں دیکھے۔ وہ کسی
ریاست میں نہ پائے۔ خرچ واخراجاتِ شاہی پہ جو نظرِ مغائر ڈالی جاتی ہے تو
عقل حیران رہ جاتی ہے کہ یا الٰہی یہ کیا معاملہ تھا۔ اتنی برکت خزینۂ شاہی میں
کہاں سے آگئی تھی کہ ان اخراجات کو مکتفی ہوتی تھی۔

شاہی کارخانہ جات خاصۂ کلاں۔ خاصۂ خورد۔ آبدار خانہ۔ دواخانہ۔ توشے خانہ
جواہر خانہ۔ اسلحہ خانہ۔ خانسامانی۔ فیل خانہ۔ اصطبل بگھی خانہ۔ توپ خانہ۔ شتر خانہ
رتھ خانہ۔ شکار خانہ۔ جلوس ماہی مراتب۔ چتر وعلم۔ بخشی خانہ فوج۔ کتب خانہ۔ کبوتر خانہ
داروغہ نذر نثار۔ داروغہ فراش خانہ۔ پالکی خانہ۔ داروغہ کہاراں۔ داروغہ
خاص برداراں۔ جمعدار صبیان۔ نواب ناظر افسر خواجہ سرایاں۔ کارخانہ داران کے
نام بنظرِ طوالت قلم انداز کئے گئے۔

افواج | سپاہ پلٹن۔ اگری پلٹن۔ بجھیرہ پلٹن۔ خاص برداران۔ رسالہ سواران۔

معززین دربار معلّٰی | وزراء۔ پیرو مرشد اوستادان علماء حکما۔ شاہزادگان نواب ناظر۔ بخشی فوج۔ برادران کسان کمیدان۔ کاملین پُرفن مہتممان کارخانہ جات۔ عرض بیگیان۔

صیغہ ہائے تقسیم تنخواہ | تنخواہ محلّات وشاہزادگان۔ صیغہ سرکارِ قدیم۔ صیغہ علاقہ بخشی گری۔ صیغہ روزینہ داران۔ تعلقہ نظارت۔ معززین دربار۔ سلاطین فوج۔

دربار شاہی کے آداب | جو قرینے دربارِ سلاطینِ دہلی کے تھے سوائے سلطنتِ ایران کے کسی سلطنت یورپ میں مروّج نہیں۔ دیوانِ خاص کے وسط میں تختِ طاؤس نصب ہوتا تھا اور بالائے تخت نمگیرہ زرّیں چوبہائے نقرہ ملمّع طلائی پر نصب کیا جاتا تھا۔ تختِ طاؤس کے برابر چار گوشوں پر چار طاؤس طلائی مینا کار نصب ہوتے تھے اور ان کی منقاروں میں بڑے بڑے موتیوں کی مالائیں جن میں زمرّد کے گُچھے ہوتے تھے آویزاں ہوتی تھیں۔ تختِ طاؤس میں مسند تکیے لگائے جاتے تھے۔ جب بادشاہ دربار فرماتے تختِ طاؤس کے دونوں پہلوؤں میں دو طرفہ دو صفیں درباریوں کی دست بستہ استادہ ہوتی تھیں سب نیچی نگاہیں کئے کھڑے رہتے تھے۔ خاموش مجال کیا ہے کہ کوئی کسی طرف دیکھ لے یا کھجائے یا مسکرائے یا بات کرے۔ دربار کے دونوں گوشوں پر دو قطار لکڑی بردار دو لکڑیاں سُرخ لئے کھڑے رہتے تھے۔ ذرا سی کسی سے بے اعتدالی ہوتی

اور گردن میں لکڑی ڈال کر دربار سے باہر کیا گیا۔ اور روسائے ہند کا مسا دربار نہ تھا دیوانِ خاص کے مقابل لال پردے کا دروازہ تھا وہاں سرخ بانات کا پردہ پڑا رہتا تھا جو شخص دروازہ میں سے داخل دیوانِ خاص ہوتا تھا پہلے لال پردے کے آگے آکر سلام گہ پر آکر استادہ ہوتا تھا آداب و تسلیمات بجالاتا تھا اور تین سلام مودّب بہت جھک کر بجالاتا اور نقیب لال پردے کے برابر سے آواز لگاتا ملاحظہ آداب سے! آداب بجالاؤ جہاں پناہ بادشاہ سلامت عالم پناہ بادشاہ سلامت۔ بعد اُس کے شخص سلامی پہلو میں ہو کر عقب حمام کی جانب کے زینہ سے دیوانِ خاص کے چبوترہ پر چڑھتا اور نعلین خالی کرتا اور دیوانِ خاص میں جاکر دوبارہ دوسری سلام گاہ پر آداب بجا لاتا اور نقیبِ دربار بطورِ اوّل آواز لگاتا اور سلام کرتا۔ اگر نذر گزرانی ہے تو سیدھا تخت کی طرف جاکر نذر پیش کرے گا اور بادشاہ نذر اُٹھا کر نذر نثار کے داروغہ کو دے دیتے نذر نثار کا داروغہ تخت کے پہلو میں استادہ رہتا تھا اور ایک متصدی لکھتا جاتا تھا۔ مگر نذر دے کر پھر پچھلے قدموں ہٹ کر سلام گاہ تک جاتا اور بقاعدہ اوّل پھر اُسی طرح آداب بجا لاتا اور جہاں جا ملتی صفِ دربار میں جا ملتا تھا۔ تخت کے عقب میں خواص لوگ عہدے سے کھڑے رہتے تھے وہ بالِ ہما سے مگس رانی کرتے تھے۔ اگر کچھ عرض معروض کرنی ہو تو عرض بیگی دو صفوں میں دربار کے سرے پر کھڑے رہتے تھے۔ عرضی اُن کو دے دی جاتی تھی اور وہ عرضی لے جاتے تھے۔ بادشاہ کے سامنے عرضی کو کھول کر ملاحظہ کرا دیتے تھے پشت عرضی پر عرض بیگی کی جانب ہوتی تھی۔ بعد ملاحظہ عرضی خواص قلمدان پیش کرتا تھا اور وہ بصورت آئینہ گھر کے مجوف تھا۔ اُس میں قلم ہر طرح کے رکھے رہتے تھے۔ عرضی کو اُس پر رکھا گیا اور بادشاہ نے پنسل سے دستخط فرما دیئے۔ جس محکمہ کے نام حکم ہوا فوراً تعمیل ہو گئی یہ قاعدے دربار شاہی کے تھے۔

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اہلِ کمال

جو کاملین جس علم و فن کے ملازم سرکارِ بادشاہی تھے وہ فردِ کامل اور انتخابِ روزگار تھے۔ اُن کی نظیر اور مثال بجائے دیگر غیر ممکن اور محال اگر بفرضِ محال تھے بھی تو اُسی سرکار ذوی الاقتدار کے وظیفہ خوار شمار کئے جاتے تھے۔ اگر کسی دوسرے جائے نوکر بھی ہو جاتے تو تھوڑا بہت وہاں سے بھی روزینہ پائے رہتے تھے برس چھ مہینے میں آکر آستانہ بوسی کر جاتے تھے بعد بربادیٔ قلعۂ معلّٰے اکثر اشخاص خانہ ویراں ہو کر اطراف و جوانبِ ہندوستان میں منتشر و پریشان ہو گئے۔

(حاشیہ صفحہ ۳۷) ابوالظفر محمد سراج الدین ظفر خاندانِ مغلیہ کے آخری بادشاہ اکبر شاہ ثانی کے بیٹے اور شاہ عالم ثانی کے پوتے تھے ۱۷۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ ثانی کی وفات پر بہادر شاہ ثانی کے لقب سے تخت نشین ہوئے۔ انہوں نے حکومت انگریزی سے اپنے وظیفہ میں اضافہ کے لئے درخواست کی تھی اور رام موہن رائے مشہور برہمو سماج لیڈر کو راجہ کا خطاب دے کر وظیفہ میں اضافہ کے مقدمہ میں وکالت کے لئے انگلستان بھیجا تھا۔ مگر حکومت نے یہ درخواست منظور نہ کی۔ ظفر کے عہد میں انگریزوں نے بادشاہ کی رہی سہی اہمیت بھی ختم کر دی۔ اسی میں گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف ہند کی طرف سے بادشاہ کو نذر دینے اور اپنے تقرر کی تصدیق کرانے کا طریقہ بھی چھوڑ دیا گیا۔ بلکہ کمپنی کی حکومت شاہی خاندان کو قلعہ سے نکالنے اور ظفر کے بعد دہلی کی برائے نام مغل شہنشاہی کو بھی ختم کر دینے کے درپے تھے۔ کہ غدر ہو گیا۔

ظفر ایک قادر الکلام اور خوش گو شاعر تھے۔ شعرا اور اہلِ کمال کے قدردان تھے، استاد ذوق کے شاگرد تھے۔ اُن کی وفات کے بعد مرزا غالب کو کلام دکھانے لگے۔

(نظیر)

مرزا جواں بخت کی شادی

ہر چند کہ تقریبات بسیار ریاستہائے ہندوستان میں نظر سے گزری ہیں، مگر جیسی شادی بازیب و تجمل شاہزادہ میرزا جواں بخت بہادر مرحوم کی ہوئی ایسی رنگین محفل و تقریب دلفریب باجاہ و حشم اس دربار دلی کے ساتھ کہیں نظر سے نہیں گزری۔ بیانِ تکلفات رسوم ساچق و مہندی و برات و آرائش شہر و روشنی و نقار خانہ جات وغیرہ فضول جانکر قلم انداز کیا جاتا ہے۔ البتہ دو امر قابلِ نگارش ہیں۔ ایک یہ کہ قرینۂ محفل سب سے جداگانہ تھا۔ دیوان کی بارہ دری میں جدا جدا محفلیں ترتیب دی گئیں تھیں۔

ہر در میں ایک طائفہ جدا رقص کرتا تھا۔ شاہزادگان کی محفل جدا ملازمین معززین کی انجمن جدا فرقہ سپاہ کی بزم جدا شاگرد پیشہ کے لئے جدا اسی طرح ہر فریق کی محفل جدا تھی۔ اہلِ شہر کے لئے حکمِ عام تھا کہ آئین اور تماشائے رقص و سرود سے محفوظ ہوں رقاصانِ پری پیکر ہر طرف سرگرم ناز و انداز تھیں اور مہ جبینانِ ناہید نواز زمزمہ پرداز۔ دس بارہ روز تک محفلیں گرم رہیں۔ کُل ملازمین شاہی و روسائے شہر کے واسطے تورہ جات کا حکم تھا جس کا جی چاہے نقد پچاس روپیہ تورے کی قیمت لے خواہ تورہ لے ، جتنے قلم کے نوکر تھے نام بنام سب کو تورے تقسیم کئے جاتے تھے۔ مثلاً میرے والد کا تورہ جدا میرے نام جدا میرے چھوٹے بھائی کے نام جدا وہ بھی نوکر تھا۔ میری والدہ کے نام جدا۔ کیونکہ ایک تنخواہ اُن کے نام بھی تھی۔ میں نے مہتممانِ تورہ بندی سے کہلا بھیجا تھا کہ آٹھ روز کے بعد ایک تورہ بھجوا دیا کرو۔ اس دربار دلی سے تقسیم تورہ جات کی ہوتی تھی۔ جس روز تورہ آتا تھا تمام عزیز و اقارب دوست احباب کے گھر کھانا تقسیم ہوا کرتا تھا۔ ایک تورہ میں طعام اس قدر ہوتا تھا کہ ایک محفل شکم سیر ہو کر کھائے۔ میرے

مکان کا تمام دالان بھر جاتا تھا ایک ایک طباق میں پانچ پانچ سیر کھانا ہوتا تھا۔ چار چار پانچ پانچ طرح کے پلاؤ رنگ برنگ کے میٹھے چاول، سُرخ، سبز، زرد، اُودے پانچ سیر کی باقر خانی ایک شیریں ایک نمکین اور کئی قسم کے نان غرضکہ اقسامِ خوردنی سے کوئی شے باقی نہ رکھی گئی تھی مختصر یہ کہ کسی ریاست میں ایسی پُرتکلف کوئی تقریب نظر سے نہیں گزری جو اس گئی گزری سلطنت میں دیکھنے میں آئی۔ اس کے علاوہ جن شعرا نے قصائد تہنیت اور سہرے وغیرہ لکھے تھے۔ باوجودیکہ ملازم تھے مگر سب کو صلے و خلعت و انعام عطا ہوئے۔ شاگرد پیشہ کو جوڑے تقسیم کئے گئے۔[1]

شاہی سواری بادشاہ کی سواری کی گاڑی میں سولہ گھوڑے لگائے جاتے تھے اور نواب زینت محل بیگم صاحبہ کی سواری میں آٹھ گھوڑے لگائے جاتے تھے ؎

کہاں وہ خسروِ عالی نظر بہادر شاہ　　کہاں وہ سروِ نکو سیر بہادر شاہ

کہاں وہ بادشہِ دادگر بہادر شاہ　　کہاں وہ داورِ والا گہر بہادر شاہ

کہاں سے باغیِ بے دین آ گئے ہے ہے

کہ نام اُس کا جہاں سے مٹا گئے ہے ہے

[1] مرزا جواں بخت ہی کی شادی پر مرزا غالب اور اُستاد ذوق نے سہرے کہے تھے۔ ذوق نے اس موقع پر ایک طویل قصیدہ بھی کہا تھا جس کا مطلع ہے۔

پائے نہ ایسا ایک بھی دن خوشنما آسماں

کھائے اگر ہزار برس چکّر آسماں!

یہ کیسی آتشِ فتنہ لگا گئے ظالم
جہاں میں ایک قیامت مچا گئے ظالم

غرضکہ نامِ خلافت اٹھا گئے ظالم
سبھوں کو مٹنے سے پہلے مٹا گئے ظالم

کسی پہ قہر خدا کا نہ آفت آئی تھی!
یہ خاندانِ تمر پر قیامت آئی تھی

حضرت بادشاہ کیوان بارگاہ حق آگاہ معرفت دستگاہ جامع الکمال و موردِ افضالِ حضرت ذوالجلال تھے۔ سوائے رتبہ اعلائے سلطنت دنیوی تصفیہ باطنی سے بھی موصوف تھے۔ اکثر تصرفات حضرت کے سُننے میں آئے ہیں۔ چنانچہ ازانجملہ ایک یہ بھی تکیہ کلام حضرت کا تھا کہ میری اولاد ناحق آرزو سلطنت کی رکھتی ہے۔ یہ کارخانہ آگے کو چلنے والا نہیں ہے مجھ ہی پر خاتمہ ہے از تیمور تا ظفر چنانچہ ایسا ہی ظہور میں آیا حضرت کو بعیت میاں کالے خاں صاحب نبیرۂ مولانا فخرالدین علیہ الرحمتہ سے ہے اور مریدانِ حضرت بھی ایسا از بسیار تھے۔ اس کے علاوہ جمیع علوم و فنون عجیبہ میں دستگاہِ تام رکھتے تھے۔

فنِ خوش نویسی

خطِ نسخ میں حضرت بادشاہ ظل اللہ میرے جدِ بزرگوار میر امام علی شاہ صاحب مرحوم کے شاگردِ رشید تھے۔ میرے دادا نے میرے والد اور بادشاہ کو برابر بتایا تھا۔ دونو بزرگوار خوش نویس لاثانی تھے۔ دہلی میں جتنے اس فن کے خوشنویس تھے میرے والد کے یا بادشاہ کے شاگرد تھے ایک بار ایک قصیدۂ عربی سلطانِ روم کی مدح میں خدیو مصر کی جانب سے ولایت کو بھیجا گیا۔ اور ولایت سے دہلی میں آیا۔ طامس صاحب پریذیڈنٹ دہلی نے میرے والد سے کہا کہ آپ اُسے لکھ دیجئے والد نے جواب دیا میں بغیر اجازت حضور کے نہیں لکھ سکتا۔ آپ اجازت حاصل کیجئے میں لکھ دوں گا۔ طامس قصیدہ کو لے کر حضور میں گئے اور تمام کیفیت عرض کی

حضور نے والد کو بلوا کر حکم دیا خلیفہ تم لکھو۔ وہ میرے والد نے اُس کی صحت کرا کے لکھ دیا۔ کہ طامس صاحب نے بہت سا سونا چڑھوا کر اُسے تیار کرایا اور پھر وہ ولایت کو بھیجا گیا۔

فنِ شعر و سُخن

حضرت بادشاہ شاعر لاجواب و زبان دانِ کامل تھے۔ کوئی محاورہ زبان کا باقی نہیں چھوڑا۔ پانچ دیوان موجود ہیں۔ شاہ نصیر مرحوم اور شیخ ابراہیم ذوق خاقانی ہند کے شاگرد تھے۔

فنِ سپاہ گری

بندوق ایسی لگاتے تھے کہ بایدو شاید۔ بال بندھا نشانہ اُڑاتے تے کبھی نشانہ خطا ہی نہ کرتا تھا۔ بارہا ایسا دیکھنے میں آیا ہے۔ کہ جانور اُڑتا ہوا جاتا ہے ہوادار پہ بندوق دھری ہے اُٹھائی اور جھونک دی۔ چھتیانے کی حاجت نہیں لوٹ پوٹ ہوا اور ہوادار میں آرہا۔ دریا میں مچھلی یا مگر نے منہ نکالا اور گولی منخرین پر پڑی اور چت ہو گیا

فنِ تیر اندازی

فنِ تیر اندازی میں بادشاہ آیا سنگھ سکھ کے شاگرد تھے۔ بادشاہ کی کثرتِ تیر اندازی کا حال میں نے اپنے والد کی زبانی سنا ہے کہ بادشاہ زمانہ ولیعہدی میں جوان تھے۔ تیر اندازی کی مشق بڑھانے کو دیوانِ خاص میں ایک جرِ ثقیل لگا رکھی تھی تین من چنوں کی پوٹ نیچے لٹکتی تھی جرِ ثقیل کے ذریعہ سے آسے چٹکی سے کھینچا کرتے تھے تیس ٹانک کمان کھینچنے پر قادر تھے۔ اچھی کمان کو کبادہ[1] بنا کر

---

[1] کبادہ۔ محنت مشقت۔ رنج کھینچنا۔ اصطلاح میں اس کمان کو کہتے ہیں۔ جو بہت نرم ہوتی ہے۔ اور اس میں کئی جگہ چاک لگا دیئے جاتے ہیں تا آنکہ نرم ہو جائے۔ اور تیر پھینکنے میں کمان کو زیادہ زور سے کھینچنا پڑے اور اسی طرح کمان کھینچنے کی مشق ہو۔ کبھی اس کا چلہ زنجیر کا ہوتا ہے (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ)

پھینک دیتے تھے۔ ایک دن سواری مبارک سلیم گڑھ سے قلعہ کو آتی تھی۔ راستہ میں
مرزا فتح الملک بہادر ولیعہد ثانی کا باغ تھا وہاں سے کچھ شور و غل کی آواز آئی تھی۔
فرمایا غل کیسا ہے۔ عرض ہوئی مرشد زادے تیر لگا رہے ہیں۔ حکم ہوا سواری اُدھر لے
چلو۔ غرض وہاں پہنچے۔ سب آداب بجا لائے۔ فرمایا تیر لگاؤ۔ سب تیر لگانے لگے۔
فرمایا تیر کمان اُدھر لاؤ۔ کمانوں کی کشتی پیش کی گئی۔ اُن میں سے ایک کمان اُٹھالی۔ اور
تین تیر کھینچ لئے اور استاد پر باقاعدہ کھڑے ہو کر ایک تیر لگایا۔ تیر تودہ میں پیوست ہوا
ایک بالشت باہر رہا۔ سب نے تحسین آفرین کی۔ دوسرا تیر اور لگایا۔ وہ اس سے زیادہ
تودہ میں داخل ہوا۔ تیسرا وہ بالکل سب مغروق تھا۔ فقط لب سوفار ہی باہر رہے اور تمام
تیر غرق تھا۔ نعرۂ تحسین و آفرین بلند ہو گیا۔ یہ میری چشم دید بات ہے۔

شمشیر زنی بھکیتی کے فن میں بادشاہ میر حامد علی صاحب کے شاگرد تھے۔ میر حامد علی
و میر اشرف علی دو نو بھائی اُستاد کامل تھے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے
رئیس ان کے شاگرد تھے۔ علی مد کی کسرت جو حضرت علی مرتضےٰ شیر خدا کی ایجاد سے ہے
وہ ان کے گھرانے کی میراث تھی۔

میں نے اپنے والد کی زبانی یہ سُنا ہے کہ بادشاہ تن تنہا آٹھ آدمیوں کے مقابل
یکدم کسرت کرتے تھے اور آٹھ آدمی برابر اُن پر چوٹ کرتے تھے اور بادشاہ سب کے وار
روکتے تھے اور اپنی چوٹ چھوڑتے جاتے تھے۔ اس قدر مشق بہم پہنچائی تھی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲) ہندوستان میں اس کمان کو لیزم کہتے تھے۔ استاد ذوق نے کہا ہے ؎

خبر کر جنگ نوفل کی تو مجنوں اہلِ ہاموں کو!

کبادہ ناصبا کھچوا سے شاخ بید مجنوں کو

فنِ شہسواری

مشہورِ روزگار ہے کہ ہندوستان میں ڈھائی سوار تھے ایک بہادر شاہ دوسرے آپ کے بھائی مرزا جہانگیر جنہوں نے انگریزوں سے شرط بد کر الہ آباد کی خندق گھوڑے سے کُدوائی تھی اور نصف سوار کوئی مرہٹہ مشہور تھا۔ اب سنِ مبارک اسّی برس سے تجاوز کر گیا تھا لیکن اب بھی جس وقت گھوڑے پر سوار ہو جاتے تھے۔ اپنی شہسواری دکھا دیتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گھوڑے پر ایک ستون قائم کر دیا ہے۔ ایک روز حضرت نظام الدین اولیا کو سواری مبارک جاتی تھی تسبیح خانے میں سے جب برآمد ہوئے تو ہوادار میں تو سوار نہ ہوتے۔ سامنے خاصوں کی زین لگی ہوئی تھی۔ آگے چابک سوار کھڑے تھے۔ محبوّ بیگ کی طرف نگاہ الطاف ہوئی وہ آگے حاضر ہوئے اُن سے دریافت فرمایا کہ وہ والی گھوڑا نو خرید جو تمہاری تفویض ہوا ہے وہ قابلِ سواری ہے۔ محبوّ بیگ نے ہاتھ باندھ کے عرض کی حضور کے اقبال سے تیار ہے۔ فی الفور گھوڑا آگے آیا حضور سوار ہوئے۔ سب ملازم رکابِ سعادت میں ہمراہ ہوئے۔ آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے نقارہ خانہ کی ڈیوڑھی سے باہر ہو کر ترپولیہ کے پٹری پر پہنچے۔ گھوڑا گردن جھکائے ہوئے دہانہ سے کھیلتا ہوا پھنے کو بناتا ہوا جھومتا چلا جاتا ہے۔ وہاں جا کر محبوّ بیگ نے نظر بچا کر گھوڑے کے پچھلے ہاتھ سے چپکا دیا اور گھوڑا ذرا چمکا۔ چونکہ یہ سکار بند پکڑے ہوئے گھوڑے کے ساتھ لپٹے چلے آتے تھے۔ بادشاہ نے مُڑ کر دیکھا اور فرمایا کیا کرتا ہے میں تو خود گھوڑے کو روکے ہوئے چلا آتا ہوں۔ گھوڑے کی چالاکی میں کچھ کسر نہیں ہے۔ لے دیکھ تو بس ذرا رانوں میں مسکا ہے کہ گھوڑے نے جھکے بھرنے شروع کیئے۔ ایک پلہ بھر اسی طرح اُڑتا ہوا ہو گیا ہے جیسے کوئی پرند اُڑتا ہے یا ہرن چوکڑیاں بھرتا ہے بعد تھپکی ہاتھ کی دے کر گھوڑے کو چمکار

لیا پھر سب لوگوں کو سواری کا حکم دیا۔ سب اپنی اپنی سواریوں پر سوار ہوئے اور حضور نے گھوڑے کو دوگامے قدم پر لگا دیا اور گھوڑے نے کلائیاں مار مار کر اور جھوم جھوم کر دوگامہ چلنا شروع کیا۔ اسی طرح تین کوس شہر سے درگاہ ہے اسی طرح پہنچے اور دروازہ درگاہ پر گھوڑے سے اتر کر درگاہ میں داخل ہوئے سوا پس آتی دفعہ مولا بخش ہاتھی پر سوار ہو کر محل ہا میں تشریف لائے۔

مبصری

حضور انور جیسے شہسوار تھے۔ اسی درجہ مبصّر بھی تھے۔ گھوڑے کے عیب و صواب و قوم دور سے دیکھ کر بتادیتے تھے۔ اور ہر قوم کی عادت سیرت سے از روئے تجربہ آگاہ تھے۔ شہر میں جو سوداگر بیش قیمت گھوڑا لے کر آتا تھا۔ اوّل حضور کو ملاحظہ کرایا جاتا تھا۔ اس کے بعد شہر کے رئیس دیکھتے تھے جو گھوڑا اچھا قوم دار آتا وہ حضور لیتے تھے۔

حضور نے ایک نکتہ بطور قاعدہ کلیہ تعلیم فرمایا تھا کہ گھوڑے کی قوم میں ہر رنگ میں سو برس سلطنت رہتی ہے اس رنگ کا گھوڑا بادشاہ ہوتا ہے اور دوسرے رنگ کا وزیر اور شناخت ان کی یہ ہے جس رنگ کا بادشاہ ہوتا ہے سو برس تک اس رنگ کا گھوڑا شریر نہیں ہوتا۔ بلکہ وفادار ہوتا ہے اور اس کی پیدائش بکثرت ہوتی ہے اور وزیر کی شناخت یہ ہے کہ اس کی عادت بادشاہ سے ملتی جلتی ہے۔ مگر بطور شاذ ایک دو شریر بھی ہو جاتا ہے۔ اور اس کی پیدائش بہ نسبت بادشاہ قدرے کم ہوتی ہے۔ چنانچہ فی زمانا بورتے کی سلطنت ہے اور سبزے کی وزارت اور بعد سبزے کی سلطنت ہوگی اور بورتے کی وزارت۔

گھوڑے کی اقوام میں سے ایک قوم ہے پیر پائی اس کا خواص یہ ہے کہ وہ پنجشنبہ

کے روز روزہ دار رہتا ہے اور اپنے تھان پر نجس اور غلیظ آدمی کو مثل خاکروب وغیرہ کو نہیں آنے دیتا۔ اور اگر آجاتا ہے تو فوراً اُس پر چوٹ کرتا ہے۔

ایک بار میں دربار میں موجود تھا ولایتی سوداگر گھوڑے لے کر آئے۔ دس بارہ گھوڑے تھے لال پردہ کے آگے گھوڑوں کی صف استادہ تھی اور حضور دیوان خاص کے بیچ کے در میں تشریف رکھتے تھے اتنے فاصلے سے دیکھ کر فرمایا کہ ان گھوڑوں میں وہ گھوڑا اچھا ہے بشرطیکہ شریر نہ ہو۔ غرضکہ وہ سامنے کو آگے طلب کیا گیا۔ واقعی گھوڑا شکل و صورت کا بہ نسبت کاروان اچھا تھا حکم ہوا سواری دیکھی جائے۔ ایک چابک سوار کو سوار کرا دیا گیا۔ چابک سوار نے چاہا باگوں کو پھیر کر دکھلائے۔ گھوڑے نے باگ پر لے کر شرارت شروع کی کھڑے ہو کر تالی بجائی اور نیچے اُتر کر باچھی پھینکی۔ موئے پر منہ ڈالا سوار بودا تھا ڈر گیا مارا نہ گیا جان بچانی مشکل ہوئی اُسے اُتار دیا گیا۔ دوسرا سوار چڑھا اور اُس نے مارنا شروع کیا۔ گھوڑا اُڑ کر فراش خانہ کے دالان میں جا پڑا۔ اکثر سامان کا نقصان ہوا۔ سوار نے وہاں سے مار کر کودایا آبدار خانہ میں لے گھسا۔ وہاں سے بھی مار کر نکالا۔ وہاں سے چڑیا خانے میں جا پڑا وہاں سے مار کر باہر لایا دو گھنٹے برابر سوار کی اور گھوڑے کی لڑائی رہی۔ اب گھوڑے کا یہ حال ہو گیا کہ پسینے میں شرابور اور تمام رانوں کے ٹکڑے ہو گئے۔ جا بجا سے خون کی فصدیں کھل گئیں اور خون بہت بہ گیا۔ اور گھوڑا انڈھال ہو گیا۔ اب سوار جدھر کو پھیرتا ہے پھر جاتا ہے۔ کیا مجال کہ سرتابی کرے اور بادشاہ کے آگے ناک پھیر کر دکھلا دیا اور سلام کر کے اُتر پڑا۔ اُسی وقت بادشاہ نے ایک شالی رومال چابک سوار کو عطا فرمایا۔

مولا بخش نامی ہاتھی

مولا بخش نامی ایک قدیمی ہاتھی معمر تھا کئی بادشاہوں

کی سواری دی تھی اس ہاتھی کی عادتیں بالکل انسان کی تھیں۔ قد و قامت میں ایسا بلند بالا ہاتھی ہندوستان کی سرزمین پر نہ تھا اور نہ اب ہے۔ یہ ہاتھی بیٹھا ہوا اور ہاتھیوں کے قد کے برابر ہوتا تھا۔ خوبصورتی میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ دوازدہ ماہ مست رہتا تھا کسی آدمی کو سوائے ایک خدمتی کے پاس نہ آنے دیتا تھا جس دن بادشاہ کی سواری ہوتی تھی اس سے ایک دن پیشتر بادشاہی چوبدار جا کر حکم سُنا دیتا تھا۔ میاں مولا بخش کل تمہاری نوکری ہے ہشیار ہو جاؤ۔ نہا دھو کر تیار ہو رہو بس اسی وقت سے ہوشیار ہیں فیلبان تھان سے کھول کر جمنا میں لے گئے اور لے جا کر لٹا دیا اور جھانوں سے میل چھڑانا شروع کیا پھر دوسری کروٹ لٹا کر دوسری طرف سے پاک صاف کر کے تھان پر لائے نقاش نے مستک پر نقش و نگار کھینچ دیئے۔ وقت سواری گدیلہ کس کر کارخانہ میں لے گئے گہنا پہنایا جھول ڈالی عماری کسی نقارخانہ کی ڈیوڑھی پر لا کر استادہ کر دیا۔ برابر اور ہاتھیوں کی قطار کھڑی جس وقت ہوادار سواری بادشاہ نقارخانہ کے دروازہ سے برآمد ہوا یہ چیخ مار کر تین سلام کیئے اور خود ہی بیٹھ گیا جس وقت تک بادشاہ سوار نہ ہولیں اور خواص نہ بیٹھ لے کیا مجال کہ جنبش کر جائے۔ جب بادشاہ سوار ہولیئے۔ اور فوجدار نے اشارہ کیا فوراً اُستادہ ہو گیا۔ ایک خوبی اور تھی کہ وقت سواری دو کمانیں اس کے دونو کانوں میں پہنائی جاتی تھیں وہ ترکش نیزوں کے کانوں کے نیچے آویزاں کیئے جاتے تھے اور بہت بڑی سپر فولادی مستک پر نصب کی جاتی تھی اور بہت بڑا حقہ چاندی کا مع چلم چنبر نقرہ اس کے سر پر رکھا جاتا تھا اور پیچوان کی سٹک فوجدار خاں اپنے کندھے پر رکھتے۔ بادشاہ ٹھنڈا حقہ پیتے جاتے تھے اور سواری رواں ہوتی تھی۔ کیا مقدور ہے کہ حقہ گرنے پائے یا چلم گرے ایسا سبک رفتار تھا بڑی منجھولی رفتار تھی۔ قصہ مختصر جب

سواری سے فرصت پائی۔ پھر ویسا ہی مست رہے جیسا تھا۔ یہ کمال اُس ہاتھی کو حاصل تھا۔ اِس کے علاوہ ایک وصف اور تھا کہ تمام دن خورد سال جو بارہ برس کے کم سن سے کم سن بچے معصوم ہوتے تھے اُس کے گرد بیٹھے رہتے تھے۔ اُن سے کھیلا کرتا تھا اور اپنے ہاتھ سے گنّوں کی پوریاں توڑ کر صاف کر کے اُن کو دیا کرتا تھا۔ دن بھر بچّے اُسے گھیرے رہتے تھے۔ بچّے اُسے کہتے تھے مولا بخش نکی آوے تو وہ ایک اپنا اگلا ہاتھ زمین سے اُٹھا لیتا تھا اور ہلایا کرتا تھا اور بچے جتنی دیر کی تعداد لگا دیتے اور کہہ دیتے کہ گھڑی بھر یا دو گھڑی اُسی قدر ہاتھ اُٹھائے رکھتا تھا۔ جب بچے کہتے ٹیک دو ہاتھ ٹیک دیتا۔ پھر آپ تو ان کہتا بچے ایک پاؤں سے کھڑے ہو جاتے اگر وہ گھڑی بھر سے پیشتر کہتے کہ گھڑی پوری ہو گئی تو سر ہلا دیتا ابھی نہیں ہوئی ہے اور جب گھڑی پوری ہو جاتی تو خود ہی توں کہہ دیتا۔ بچّے پاؤں ٹیک دیتے تھے جس دن بچے نہ آتے تو چیخیں مار کر بلا لیتا تھا۔ بچّوں کو گنّے کھلاتا۔

جب فیلخانۂ شاہی اور اصطبل پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو اسپِ ہمدم اور مولا بخش ہاتھی نے دانہ پانی چھوڑ دیا۔ اسپِ ہمدم بہت شاندار گھوڑا اور دکابہ نہایت خوش رنگ اور خوبصورت تھا۔ سواری میں سب کوتلوں سے آگے چلتا تھا زمانۂ ولیعہدی سے بادشاہ کی سواری میں تھا۔ اب اُس کی عمر چالیس سال کی ہوئی تھی۔ تمام جسم اُس کا منقش تھا اور چھوٹے چھوٹے گلاب کے پھول کی برابر سرخ رنگ کے پھول تھے۔

جب ان دونوں نے آب و دانہ ترک کر دیا تو مولا بخش کے فیلبان نے جا کر سانڈرس صاحب کو اطلاع دی کہ ہاتھی نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے۔ کل کلاں کو نیکی بدی ہو جائیگی تو سرکار مجھے پھانسی دے گی۔ سانڈرس صاحب کو یاد نہ آیا فیلبان کو گالیاں دیں اور

کہا کہ ہم چل کر خود کھلوائیں گے اور پانچ روپیہ کے لڈو اور کچوریاں ہمراہ لاکر ہاتھی کے تھان پر پہنچے اور ٹوکرہ شیرینی کا ہاتھی کے آگے رکھوایا۔ ہاتھی نے جھلاکر ٹوکرا کھینچ کر مارا اگر کسی آدمی کے لگتا تو کام تمام ہوجاتا وہ ٹوکرا دور جاکر پڑا اور تمام شیرینی بکھر گئی۔ سانڈرس بولے ہاتھی باغی ہے اسے نیلام کرو اسی روز صدر بازار میں لاکر استادہ کیا۔ اور نیلام کی بولی بولی۔ کوئی خریدار نہ ہوا۔ بنسی پنساری یک چشم جس کی دکان کھاری باولی میں تھی اُس نے ڈھائی سو روپیہ کی بولی دی اسی بولی پر صاحب نے نیلام ختم کردیا۔ فیلبان نے ہاتھی سے کہا کہ اے بھائی تمام عمر تو تُونے اور میں نے بادشاہوں کی نوکری کی اب میری اور تیری تقدیر پھوٹ گئی کہ ہلدی کی گرہ بیچنے والے کے دروازے پر چلنا پڑا۔ یہ سنتے ہی ہاتھی کھڑے قد سے دھم دیسی زمین پر گر پڑا اور جاں بحق ہوگیا اور اسی دن اسپ ہمدم کا بھی خاتمہ بخیر ہوا۔

سبحان اللہ ایسے نمک حلال جاں نثار رفیق کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ ایسا حیوان انسانِ ناسپاس سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ خدا انسان کو بھی ایسی ہی توفیق خیر عطا فرمائے۔

اخلاق

حضرت بادشاہ کیواں بارگاہ باوجود عظمت و شوکت و جلال و جبروتِ خداداد جملہ علم و فضل و عجز و انکسار و کسرِ نفس و حلم و ترحم و حسنِ خلق سے آراستہ و پیراستہ تھے۔ عجز و انکسار مزاجِ اقدس امتزاج میں اس درجہ تھا کہ خود کو ادنٰے بندگانِ بارگاہِ احدیت کی برابر متصور فرماتے تھے کبھی کوئی کلمہ تمکنت و سطوتِ شاہانہ زبان پر نہ لاتے تھے۔ بوئے نخوت و رعونت پاس ہوکر نہ نکلی تھی۔ ہر بندۂ خدا سے خلقِ محمدی سے پیش آتے تھے اور عالمِ شہزادگی سے مزاجِ تقدس امتزاجِ زہد و

صلاح و تقوئے طہارت و عبادت کی جانب مائل تھا۔ ایامِ شباب میں بھی مرتکب منہیات و ممنوعاتِ شرعیہ نہ ہوئے۔

خوش بیان اس درجہ تھے کہ اگر پہروں بیان فرمائے جائیں تو دل کو سیری نہ حاصل ہو۔ صدہا افسانہائے لطیفہ و حکایات عجیبہ و غریبہ نوکِ زبان تھیں۔

اکثر تذکرہ جات عالم شاہزادگی زمانۂ سلطنت حضرت شاہ عالم بہادر مرحوم بیان فرمایا کرتے تھے۔

جائے افسوس و مقامِ عبرت ہے دنیائے ناپائدار و بے وفا و زمانۂ غدار پُر دغا کا کیا اعتبار کیسی پُرانی سلطنت کس زمانہ کی سلطنت معرضِ زوال میں آئی ہے۔ کیسے کیسے بادشاہان اولوالعزم کشورستان صاحب اقبال اس خاندان والا دودمان میں گذرے ہیں۔ جن کے رایتِ جہانگیر کا پھریرا قیصرِ روم و خاقان چین و زار روس کے سروں پر لہراتا تھا۔ بزورِ شمشیر غرب سے شرق تک کشورستانی کا ڈنکہ بجوادیا۔ ہفت اقلیم میں رعب داب کا سکہ بٹھادیا۔ شاہزادی التقوٰی سے لے کر بہادر شاہ بادشاہ دہلی تک پانچہزار سال سے زیادہ سلطنت خاندانِ مغلیہ میں رہی ہے۔

امیر تیمور کشورگر کی ہمت و جرأت کو غور کیا چاہیئے کہ ہفت اقلیم میں قبضہ جمادیا۔ اور بڑے بڑے سرکشوں کو کتے کی کھوپری میں پانی پلوادیا۔ سلطانِ روم کو لوہے کا پنجرہ جھکادیا۔ بابر کی علو ہمتی کو دیکھئے تن تنہا بجانِ واحد گھر سے نکل کر سرحدِ کابل سے تا دریائے شور اپنا قبضہ جمالیا۔ بادشاہِ اکبر نے حکمتِ عملی سے تمام ہندوستان کے کان میں کوڑی ڈال دی۔ عالمگیر تو اسم بامسمّٰے پورے پورے عالمگیر ہی ہوئے۔ باون برس کپڑے کے خیمہ میں بسر کرکے تمام ہندوستان پر قابض و متصرف ہوگئے۔

ایسی قدیم سلطنت کو زمانہ ناہنجار و بے وفا نے ایسا نیست و نابود کیا کہ تواریخ تک میں درج کرنے کو نام و نشان باقی نہ چھوڑا اور کچھ پاسِ قدامت نہ کیا۔

فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَارِ

توانگری بدل است نہ بمال

سخیاں ز اموال بر مے خورند　　بخیلاں غم سیم و زر مے خورند

راجہ اجیت سنگھ

ان کے واقعات بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ راجہ صاحب موصوف رئیس ریاست پٹیالہ کے چچا تھے ایامِ شباب میں واردِ دہلی ہوئے تھے۔ دلّی کے عیش و عشرت ایسے مرغوبِ طبع ہوئے کہ پھر وطنِ مالوف کی جانب متوجہ نہ ہوئے۔ ڈیڑھ دو لاکھ کے جاگیردار تھے جس وقت آپ کی جاگیر کا روپیہ آتا تھا کل سامانِ امارت از سرِ نو درست کر کے راجہ بن بیٹھتے تھے۔ مکان کی آرایش شیشہ آلات۔ جھاڑ فانوس گاڑی۔ بگھی۔ سامانِ پوشاک لباس وغیرہ وغیرہ سب کا از سرِ نو خرید کیا جاتا تھا اور جب داد و دہش وغیرہ پر کمر باندھی جاتی تھی۔ تو چند روز میں سب کو دے دلا۔ فقیر ہو بیٹھے تھے ایک بوریا ایک کمبل رکھ لیتے تھے اور کہتے تھے "ہمیں تو فقیر ہیں" بعد قرض دام پر گزر کرتے تھے۔ سال بھر میں دو لاکھ روپیہ کے مقروض ہو جاتے تھے۔ جب وہ تین سال میں پانچ چار لاکھ قرض ہو جاتے نالشیں ہوتیں ڈگریاں جاری ہوتیں۔ یہ خبر پٹیالہ میں پہنچتی رئیسِ پٹیالہ بخیالِ بدنامی ریاست روپیہ بھیج دیتے اور سال بھر میں اُن کے واسطے پانچ چھ گھوڑے بیش قیمت معہ سازِ طلا و نقرہ ایک دو زنجیر فیل برائے سواری بھیجتے رہتے تھے اور یہ ہر سال لوگوں

کو بخشش کر دیتے تھے۔ ایک سال ایک فیل مادہ معہ زیور نقرہ و جھول زردوزی و حوضہ نقرہ و یک ہزار روپیہ خوراک مومن خاں صاحب کو عطا کی تھی۔ اور ایک زنجیر پا یہ فیل داغ صاحب کو عطا ہوا تھا۔

راجہ صاحب موصوف کو دو باتوں کا شوق از حد تھا۔ ایک شعر و سخن کا دوسرے سماعِ مزامیر کا۔ جتنے اربابِ نشاط تھے سب دربار میں بارہ مہینے حاضر رہتے تھے۔

جس شخص کو سُن لیتے تھے کہ شعر کہتا ہے گھر سے بلوا کر اس کی قدردانی حد سے زائد فرماتے تھے۔ صبح کے نو بجے حوائج ضروری سے فارغ ہو کر دربار کرتے تھے۔ دربار میں مصاحبین شعرا وغیرہ دوست احباب فراہم ہوتے تھے۔ اور بزم رقص و سرود گرم ہوتی تھی۔ رات کے دس بجے تک صحبتِ عیش و عشرت میں ہر طرح کی دُھل لگی رہتی تھی۔

پوشاک نہایت عمدہ و لطیف پہنتے تھے اور اہلِ صحبت کو بھی خوش پوشاک رکھتے تھے۔ اور ہر روز داد و دہش فرماتے رہتے تھے جو شاعر اُن کے پاس پہنچ گیا اور دس پانچ شعر اُس کے سُن لیے خالی نہ جانے دیتے تھے اُسی وقت اُس کو خلعت نقد وغیرہ عطا کرتے تھے۔

برسات میں یہ کیفیت ہوتی تھی کہ بیس پچیس خیاط بیٹھے ہوئے ہیں اور تھان پر تھان پارچہ اور گوٹہ کناری وغیرہ کے چلے آتے ہیں اور سیلے مندیلیں بنارسی اور دوشالے وغیرہ خریدے جا رہے ہیں اور جوڑے تیار ہو کر سب کو ایک رنگ تقسیم ہو رہے ہیں۔ بیس بیس ہزار روپیہ میں نے ایک جلسہ میں تقسیم کرتے ہوئے دیکھا ہے

غرضکہ چند روز میں زرِ نقد تقسیم ہو جاتا تھا بعد توشہ خانہ تقسیم ہوتا تھا بعد سواریاں بخشش کی جاتی تھیں۔ پھر سامانِ مکان تقسیم ہوتا تھا۔ جب سب کچھ دے چکتے تھے تو بستر تک اٹھا کر بوریے پر ہو بیٹھتے تھے۔

اس دل گردے کا فیاض بے ملک امیر نظر سے نہیں گذرا۔ یہ انتہا کی سخاوت ہے اگر کوئی صاحبِ ملک اس درجہ سخی ہو تو عجب نہیں۔ اس کم بضاعتی پہ حیا دل ہونا تعجبات سے ہے ایک بار ایک گھوڑا تین ہزار روپیہ کی قیمت کا انھیں پٹیالہ نے بھیجا اور اپنی قسم لکھی کہ تم اس گھوڑے کو ضائع نہ کرنا یہ نایاب ہے اور کامداروں کو تاکید لکھی کہ اگر یہ گھوڑا کسی کو دیا جائے گا تو تمہارے لئے بہتر نہ ہوگا۔ خیر کامدار حفاظت کرتے تھے۔ ایک دفعہ یہ خود میں دروازہ میں اُس پر سوار چلے آتے تھے کہ ایک فقیر نے سوال کیا کہ راجہ جیت سنگھ تمہارا نام سُنکر دور سے آیا ہوں کہ راجہ صاحب بڑے سخی ہیں جب میرا سوال پورا کرو۔ تو میں جانوں۔

راجہ صاحب:۔ تیرا کیا سوال ہے۔

فقیر:۔ یہ گھوڑا مجھے دے دو۔

راجہ صاحب گھوڑے پر سے اُتر پڑے۔ گھوڑے کی باگ اُس کو دے دی اور کہا کہ میں جانتا تھا کوئی بڑا سوال ہوگا کہ مجھ سے پورا نہ ہوگا۔ یہ تو کچھ بھی سوال نہ تھا۔ غرضکہ فقیر گھوڑا لے کر راہی ہوا۔ یہ پیادہ پا مکان پر پہنچے۔ کامداروں نے سُنا کہ گھوڑا دے آئے وہ تلاش کر کے فقیر کے پاس پہنچے اُس سے دریافت کیا گھوڑا بیچتا ہے اُس نے کہا ہاں۔ کامدار نے کہا کیا لے گا اُس نے کہا ایک ہزار۔ کامداروں نے فی الفور گھوڑا کھول لیا۔ مکان پر لا کر ہزار روپیہ اُسے دے دیا۔

جب تو وہ گھوڑا بیچ رہا بعد چھ ماہ کے کسی اور کو دے دیا +

شہر دہلی کی تقریبات

دہلی میں یوں تو سب میلے مثل عیدین اور بارہ وفاتیں اور بسنتیں اور حضرت نظام الدین اولیا کی سترھویں بڑی دھوم دھام سے ہوتی تھیں اور تمام شہر کی خلقت کا اژدحام عام ہوتا تھا۔ مگر سیر گلفروشاں عجب پُر تکلف اور رنگین میلہ تھا ایسا میلہ میری نظر سے کہیں نہیں گزرا۔ ہر چند کہ بڑے بڑے میلے ہندوستان کے مثل ہردوار اور بٹیسر اور بکتیسر میں نے دیکھے ہیں۔ مگر توبہ لاحول ولاقوۃ پھول والوں کی سیر کی کیفیت اور تکلفات سے کیا نسبت ہے۔ ان میلوں میں گنوار دل فراہم ہوتا ہے یہ تعلیق پن کہاں اول تو وہ منظر ہی ایسا خوش نما اور فرحت افزا کہ صدہا صحرا و مرغزار و کوہسار و چشمہ سار میری نظر سے گزرے ہیں ایسا پُر فضا پُر بہار کوہسار دیکھنے میں نہیں آیا۔ نہ ایسا خوبصورت تالاب نہ ایسے درختانِ گنجان سایہ دار نہ ایسا تار مینو نگار۔ یہ میلہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پہ ہوتا ہے مزار مبارک دہلی سے سات کوس کے فاصلہ پر جانب جنوب موضع مہرولی میں واقع ہے۔ یہ موضع زمانہ سلطنت راجگان ہندوستان میں دارالخلافہ ہندوستان تصور کیا جاتا تھا۔ چنانچہ مہاراجہ پرتھی راج فرمانروائے ہندوستان اسی مقام پر اورنگ آرائے سلطنت تھا۔ اس کی بنیاد قلعہ اور محلات اور معبد کتبہ و شکستہ و ریختہ تا الی الآن موجود ہیں اور نیز بنیاد مسجد نیم تیار بادشاہ قطب الدین[1] فاتح ہندوستان بھی اسی محل پر مسمار شدہ یادگار روزگار ہے بُت خانہ

---

[1] سلطان قطب الدین ایبک۔ جن کا مزار لاہور میں ایبک روڈ پر ہے۔

ٹوٹتا جاتا تھا اور مسجد تعمیر ہوتی جاتی تھی۔ نصف بُت خانہ ٹوٹا تھا اور نصف مسجد تعمیر ہوئی تھی کہ بادشاہِ اسلام نے وفات پائی مسجد کی تعمیر ناتمام رہ گئی۔

کارِ دنیا کسے تمام نکرد۔ اس میں شک نہیں کہ اگر یہ مسجد تیار ہو جاتی تو روئے زمین پر اس تعمیر کا نظیر نہ نکلتا۔ اس مسجد کا ایک مینار تیار ہو گیا تھا اور دوسرا ہنوز ناتمام تھا فقط ایک کھمن اُٹھنے پایا تھا مسجد کے دالان کے در نصف تعمیر ہوئے تھے مینارِ مسجد کا ارتفاع اسّی گز کا ہے۔ سات منزلیں اسی کی قرار دی گئیں۔ وہ مینار کی عمارت مثمن کمر کی نہایت خوش نما و مطبوع ہے اور یہ مشتش عمارت سنگ سرخ سے ہے اور اُس پر کلام مجید چار اُنگل کے جلی قلم سے کندہ کیا ہوا ہے حروف اُبھرواں ہیں لیکن کس خوشنویس کے ہاتھ کی تحریر ہے کہ آنکھوں سے لگانے کو جی چاہتا ہے علیٰ ہٰذا القیاس مسجد کے در عل اور محرابوں پر بھی اُسی قلم سے کلام اللہ ثبت ہے اس مسجد کے صحن میں وہ بُت خانہ شکستہ ہے۔ بُت خانے کی عمارت سب عمارات سے جداگانہ ہے۔ فقط پتھروں پر پتھر چُن دیئے گئے ہیں۔ مگر کس ترکیب سے چُنے گئے ہیں کہ آج تک برقرار ہیں۔ بُت خانہ کے صحن میں وہ ستون آہنی جس کو کیلی کہتے ہیں وہ نصب ہے۔ اور اُس پر بخطِ شاستری کچھ عبارت کندہ ہے اُس کی کیفیت اس طور پر ہے کہ پرتھی راج کو منجموں نے خبر دی تھی کہ تیرے محلات کی زمین میں راجہ باسک جو زمین کا راجہ ہے اُس کا گذر ہو گیا ہے تو اُس کے سر پر کیلی ٹھونک دے۔ کہ وہ یہاں سے جانے نہ پائے پھر تیرا راج اٹل ہو جائے گا۔ قیامت تک تیری اولاد میں سے سلطنت نہ جانے پائے گی۔ منجموں کو زمین و آسمان کی تو خبر تھی۔ مگر خدا کے گھر کی خبر سے بیخبر تھے ؎

شانِ قدرت دم کے دم میں کیا سے کیا پیدا کرے
جو نہ ہو وہم و گماں میں برملا پیدا کرے

غرضکہ حسبِ ہدایت منجمان میخ آہنی کا دم تیار کرائی گئی اور بموجب نشان دہی منجمان زمین میں ٹھونکی گئی۔ جب زمین پر نصب ہو گئی راجہ کو منجمان کے قول کا اعتبار نہ آیا کہا کہ اس لاٹھ کو باہر کھینچ لو کہ میں اپنی نظر سے دیکھ لوں۔ ہر چند برہمنوں نے منع کیا اور سر پٹکا مگر راجہ کب مانتا تھا مثل ہندی ہے راج ہٹ تریا ہٹ بالک ہٹ ایک نہ سنی اور کیلی کو اکھڑوا کر دیکھا تو ایک ہاتھ کیلی خون میں ڈوبی ہوئی تھی۔ حکم دیا پھر اسی جا پر نصب کر دو۔ منجموں نے کہا اب کیا ہوتا ہے وہ کہیں کا کہیں پہنچا وہ پتال کا راجہ تھے کیا اب تک یہاں بیٹھا رہا ہزاروں کوس پہنچ گیا۔ غرضکہ وہ کیلی آج تک اسی جا موجود ہے۔ اسی محل سے آبادی موضع مہرولی شروع ہوئی ہے اور مقام جھرنہ اور اولیا مسجد پر جا کر ختم ہو گئی ہے اور اسی مسجدِ ناتمام کے گوشۂ شمال و مشرق میں سنگ سرخ کا حجرہ ہے اس میں بادشاہ علاء الدین کا مزار ہے۔ موضع مہرولی کی آبادی بالائے سطحِ کوہ ہے یہ پہاڑ چنداں بلند نہیں ہے بلکہ زمین دوز ہے اسی عمارت مسمار شدہ کے آگے بڑھ کر عمارتِ مزارِ مبارک خام ہے۔ مزار کا چبوترہ چار گز سے چار گز مربع ہوگا۔ ارتفاع ایک بالشت سے کم پر چبوترہ کیا، ایک حد بندی مزار ہے۔ مزار پر مٹی کی ٹوکریوں کے اور جا بجا نشان نا ہنوز موجود ہیں حالانکہ ہزارہا بارشیں ہوئیں مگر یہ تصرف حضرت کا ہے کہ ان ٹوکریوں کے نشانات کو تبدل اور تغیر نہ ہوا۔ حضرت نے قبلِ وفات مریدان کو وصیت فرمائی تھی کہ میرا مزار زمین دوز زیر آسمان رہے سقف اور گنبد وغیرہ کی تکلیف نہ کرنا۔ درگاہ ہی کے ملحق عمارات محلات

بادشاہاں ہے اور سامنے کے رُخ کو جانبِ مغرب مکانات رعایا و امیراں ہیں اور بازار ہے اور آبادی ہے اور سرائے پختہ ہے اور دورویہ مکانات اور کمرہ جات اور دکانیں وغیرہ تعمیر ہوتی ہوئی جھرنے تک چلی گئی ہیں۔ آبادی کے گوشۂ مغرب اور جنوب میں تالاب عظیم الشان ہے اور وسطِ تالاب میں ایک پختہ چبوترہ ہے اور اُس پر ایک برج نما مکان ہے اُس کے در سب کھلے ہوئے ہیں وہ تالاب حوضِ شمسی کے نام سے موسوم ہے اس کو بادشاہ شمس الدین التمش نے کندہ کرایا ہے۔ یہ روایت اس طور پر مشہور ہے کہ بادشاہ شمس الدین کو خواب میں جناب سرورِ کائنات کی زیارت ہوئی اور اُس نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم گھوڑے پر سوار ہیں اور اُس محل پر تشریف رکھتے ہیں اور ارشاد ہوا کہ شمس الدین یہاں حوض بنوا دے۔ چنانچہ بادشاہ جب خواب سے بیدار ہوا اور اُسی موقع پر پہنچا اور دیکھا کہ گھوڑے کے چار سموں کے نشان موجود ہیں۔ اُسی وقت وہاں چبوترہ اور برج تیار کرانے کا حکم دیا اور گرد اُس کے حوض کرا دیا۔ پہاڑ کا پانی جانب مغرب سے موسم برشگال میں بہ بہ کر اُس میں فراہم ہوتا ہے اور مشرق کی جانب پشتہ ہے اور پشتہ پر عمارات دکانیں بازار و مکانات ہیں اور بازار کے عقب میں جانبِ مشرق نشیب ہے اور تالاب کے جنوب میں درختان گنجان آم کے ہیں جو امریوں کا اندھیری باغ مشہور ہے۔ بازار کے اختتام پر جانبِ مشرق نشیب ہے اس کا ارتفاع قریب دس گز کے ہوگا اس محل پر جھرنے کی عمارت ہے۔ تالاب کے کنارے کی جو سڑک ہے اُس کے نیچے ہی جھرنا ہے۔ چونکہ زمین تالاب کا پانی جھر کر جھرنے میں جاتا ہے جھرنے کے نشیب پر دیوار پشتہ ہے اور پشتہ سے ملحق ایک دالان سنگِ سرخ کا ہے اور دونو پہلو میں زینہ ہے۔ اور آگے اُس دالان کے ایک حوض چوڑا چکلا قدِ آدم سے زیادہ عمیق ہے۔ اور

صحن وسیع پختہ چبوترہ کا ہے اور حوض ہیں سے ایک نہر رواں ہے کہ حوض میں پانی چل کر نہر میں جاتا ہے اور نہر میں سے پانی کی چادریں چلتی ہیں اور چبوترہ پر سے نیچے گرتا ہے اور سامنے اُس چبوترہ کے ایک پہاڑ کا ٹکڑا ہے کہ وہ ڈھلوان ہے اور اُس کے پہلو میں زینہ ہے اُس پر آدمی چڑھ کر اُس پہاڑ کے ڈھلان پر بیٹھتے ہیں تو پھسل کر نیچے زمین پر آرہتے ہیں۔ اُسے پھسلنا پتھر[1] کہتے ہیں اور جھرنے کے دالان کے دونوں جانب شمال اور جنوب میں عمارت کے دو مکان دالان در دالان ہیں اور اُن مکانات اور صحن جھرنا پر درختانِ انبہ سایہ دار ہیں جھرنے کے حوض میں پانی تالاب کا بکثرت جھرا کرتا ہے اور جھرنے میں چھلک کر نہر میں جاتا ہے اور نہر میں چادریں چھلک کر بہ جاتی ہیں۔ میلہ کے ہنگام میں اس مقام پر عجب کیفیت ہوتی ہے کہ قابلِ دید ہے۔ ہزارہا آدمی جھرنے کے دالان کی سقف پر سے حوض میں کودتے ہیں اور تیر کر باہر نکلتے ہیں اور پھر چڑھتے ہیں اور پھر کودتے ہیں ایک تار بندھا رہتا ہے بعضے پہلوان پانچ آدمی کو لے کر کودتے ہیں اور پھسلنے پتھر سے سینکڑوں آدمی پھسلتے ہیں۔ جھرنے کے مکانات میں پھول والے بیٹھے ہوئے پنکھا تیار کرتے ہیں اِدھر تماشائیوں کا وہ ہجوم ہوتا ہے۔ پانی کا اک شور ہوتا ہے کہ کان پڑی آواز نہیں آتی ہے ہزارہا آدمیوں کا اژدحام اس محل پر فراہم ہوتا ہے۔ راہ چلنے کو خالی نہیں ملتی۔

---

[1] یہ پتھر اس بلا کا چکنا اور پھسلنا ہے کہ ذرا کوئی اس پر بیٹھا اور پھسلا پھول والوں کی سیر میں لوگوں کا اس پر چڑھنا اور پھسلنا تماشا ہو جاتا ہے اُستاد ذوق نے اس مطلع میں اسی پتھر کا حوالہ دیا ہے ؎

میں کہاں سنگِ درِ یار سے ٹل جاؤں گا

کیا وہ پتھر ہے پھسلنا کہ پھسل جاؤں گا

یہ میلہ ساون کے مہینے میں ہوتا ہے۔ جمعرات کے دن پنکھا چڑھتا ہے چار روز برابر یہ میلہ رہتا ہے تمام شہر کی خلقت ہندو مسلمان امیر غریب ادنٰے اعلےٰ شہر سے سب چلے جاتے ہیں شہر میں دکان کوئی شاذ و نادر کھلی رہتی ہے ورنہ تمام حلوائی۔ نانبائی۔ طباق۔ کبابی سب خواجہ صاحب میں جا کر دکانیں لگاتے ہیں۔ حلوائیوں کی دکانوں کا ہجوم العظمۃ للہ ایک ایک دکان سولہ سولہ گز زمین مربع میں لگائی جاتی ہے۔ دکان کے اندر بڑے بڑے کڑھاؤ گھی کے چڑھے ہوتے ہیں اور کچوریاں پوڑیاں۔ بیوریاں شیرینی وغیرہ تیار ہوتی ہے بازار کی جانب آٹھ آٹھ بیچنے والے بیٹھ جاتے ہیں۔ تاہم وار نہیں آتا ہے۔

مکانوں کا کرایہ سینکڑوں روپے ہو جاتا ہے جا بجا ڈیرے خیمے استادہ ہو جاتے ہیں۔ شہر کی خلقت شبانہ روز ناچ رنگ دیکھتی ہے اندھیری باغ میں جھولے پڑ جاتے ہیں۔ شاہدانِ بازاری اس میں جھولتی ہیں۔ ملہار کی تانیں اڑاتی ہیں جنگل اور پہاڑ سب سبز ہوتا ہے ابرِ تیرہ و تار چھایا ہوتا ہے۔ ہلکی ہلکی بوندیاں پڑتی ہوتی ہیں۔ عجب کیفیت ہوتی ہے کہ بیان نہیں ہو سکتی۔

دن کے دو بجے جھرنے پر سے پنکھے اٹھتے ہیں۔ آگے آگے تو اور اقوام اہلِ حرفہ کے پنکھے ہوتے ہیں اور سب کے پیچھے پھول والوں کا پنکھا ہوتا ہے اس وقت کا اژدحام دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے اگر سیر میں کسی آدمی کا پاؤں زمین سے اٹھ گیا تو آدمیوں کی چپقلش میں سو سو قدم تک ادھر چلا جاتا ہے ہر پنکھے کے آگے روشن چوکی بجتی جاتی ہے۔ اور جا بجا تھمتے جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ پنکھا روانہ ہوتا ہے۔ نفیری والے ستم کرتے ہیں۔ ایسی سریلی نفیروں میں ملار گاتے ہیں کہ آدمی بے اختیار اور سہو محو ہو

جاتے ہیں کچھ ہوش تن بدن کا نہیں رہتا ہے اور عالم بے اختیاری میں جو ہاتھ میں آیا پھینک دیتے ہیں۔ کوٹھوں اور مکانوں پر سے صدہا روپیہ برستا ہے۔ نفیری والے برس دن کی روٹی پیدا کر لیتے ہیں۔ ہر کمرہ کے نیچے دس دس پندرہ پندرہ منٹ توقف کرتے تھے رات کو نو بجے جاکر درگاہ میں پنکھا پہنچتا تھا۔ دو گھڑی کامل تو بادشاہی محل کے نیچے نفیری بجاتے تھے اور محل کی چلونوں میں سے روپے اشرفیاں اور ٹوڑے برستے تھے۔ بعدہٗ جاکر درگاہ میں پنکھا چڑھاتے تھے۔ پنکھے کے دوسرے روز جمعہ کو سب خلقت بدستور جمع رہتی تھی اور جھرنے کی کیفیت اور میلے کے تماشے میں اور خرید و فروخت اشیاء تحفہ جات میں مشغول رہتی تھی۔ درگاہ کے دروازہ کے آگے نیا بازار لگایا جاتا تھا۔ ہر قسم کا سوداگری مال موجود ہوتا تھا خصوصاً سادہ کاری چاندی سونے کا ہلکا زیور بہت فروخت ہوتا تھا۔ بساطیوں کی دکانیں بکثرت ہوتی تھیں لاکھوں روپیہ کی خرید و فروخت ہو جاتی تھی۔ دو تین شب تک شہر کے بازار میں مرد کا نام تک نہ ہوتا تھا۔ شہر کی مستورات پردہ نشین شب کو بازار میں نکلتی تھیں اور مسجد جامع میں جاکر سیر کرتی تھیں۔

ہفتہ کے روز خواجہ صاحب کی درگاہ سے خلقت رخصت ہوکر شہر کو آتی تھی۔ سات کوس تک برابر خلقت کا تانتا بندھا رہتا تھا اور جابجا دکانیں لگی ہوتی تھیں اور کھلونے والے بیٹھے رہتے تھے۔ اب لوگ گھر کو آتے وقت گھر والوں کے واسطے انگوٹھی چھلے بچّوں کے واسطے کھلونے لیتے جاتے ہیں اور چلتے جاتے ہیں۔ حضرت بادشاہ موسم بارش میں چار ماہ کامل یہیں رہتے تھے۔[۱]

---

[۱] پھول والوں کے میلے کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ ریذیڈنٹ سٹین صاحب (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ)

شاہانِ مُغلیہ کی رعیّت نوازی

یہ امر بھی خاندانِ تیموریہ پر ختم ہو گیا۔ جیسی رعیّت پروری سلطنتِ مغلیہ نے کی ہے کسی تاریخ کی رُو سے کسی عہدِ سلطنت میں نہیں پائی گئی رعیت کو بجائے اولاد سمجھا گیا ہے چنانچہ ایک بار قومِ ہنود نے اہلکارانِ سرکارِ انگریزی سے ساز باز کر کے شہر سے اخراج گاؤ قصابان کا حکم جاری کرا دیا۔ اور سرکار سے دکانداران گاؤ قصاب پر تاکید ہوئی تھی کہ تم اپنی دکانیں شہر سے باہر لے جاؤ۔ اور تمام شہر کی دکانیں بند کرا دی تھیں۔ ان غریبوں نے جب سوائے تعمیل حکم کے کوئی چارہ نہ دیکھا تو سب کے سب فراہم ہو کر اپنے بال بچوں کو اور تمام گھر بار اپنا ہمراہ لے کر محل شاہی کے نیچے زیر جھروکہ آ کر ڈنڈا ڈیرا ڈال دیا اور جھروکہ کے نیچے جا کر فریاد مچائی کہ ہم اپنا گھر چھوڑ کر شہر سے کہاں جائیں۔ بادشاہ رعیّت پناہ نے بمجرد سننے نالہ و زاری اُن غریبوں کے حکم دیا کہ ہمارا ڈیرہ خیمہ بھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۰) پر شاہزادہ جہانگیر نے گولی چلا دی تھی۔ بدیں وجہ الہ آباد میں قید کر دیئے گئے۔ ملکہ ممتاز محل نے منت مانی کہ جہانگیر رہا ہو کر آئیں تو حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے مزار پر پھولوں کی مسہری چڑھاؤنگی۔ چنانچہ شاہزادہ جہانگیر جب رہا ہوئے۔ تو ملکہ نے بڑی دھوم دھام سے منت چڑھائی تقریب میں شہر بھر کے ہندو مسلمان شریک ہوئے۔ قطب میں کئی روز میلا لگا رہا۔ پھول والوں نے جو مسہری بنائی اس میں خوبصورتی کے لئے پھولوں کا ایک پنکھا بھی لگا دیا۔ بادشاہ کو یہ میلا بہت پسند آیا۔ حکم ہوا کہ ہر سال بھادوں کے شروع میں یہ میلا ہوا کرے۔ مسلمان درگاہ شریف پر پنکھا چڑھائیں۔ ہندو جوگ مایا جی پر چڑھائیں۔ اس طرح اس میلے کی بنیاد پڑ گئی۔ بادشاہ اور شہزادے قطب جاتے۔ وہاں رہتے اور میلے میں شریک ہوتے۔ (نظیر)

ریتی میں لب دریائے جمن اُن کے برابر لگا دو۔ جو حال رعیّت کا وہ ہمارا۔ شاگرد پیشگان نے بمجرد اصدارِ حکم بارگاہِ سلطانی لے جا کر لب دریا استادہ کر دیئے۔ یہ خبر صاحب رزیڈنٹ بہادر کو ہوئی وہ خبر سنتے ہی بادشاہ کی خدمت میں دوڑے ہوئے آئے اور حضور میں عرض کی کہ حضور یہ کیا کرتے ہیں۔ حضور کے ہمراہ تمام رعیّت شہر سے نکل کھڑی ہو گی!

بادشاہ سلامت بھئی جہاں میری رعیّت وہاں ہیں۔ رعیّت میرے بال بچّے ہیں میں اُن کو کیونکر اپنے سے جُدا کر دوں کہیں گوشت سے ناخن بھی جُدا ہوئے ہیں آج تو قصابوں کو شہر بدر کرنے کا حکم ہوا ہے کل کسی اور قوم کو ہو گا پرسوں کسی اور قوم کو ہو گا نرسوں کسی اور قوم کے واسطے حکم جاری کیا جائے گا رفتہ رفتہ سب شہر خالی کرا لیا جائے گا۔ اگر تم صاحبوں کو شہر خالی کرانا منظور ہے تو صاف مجھ سے کہہ دو میں شہر کی رعیّت کو ہمراہ لے کر خواجہ صاحب میں جا بیٹھتا ہوں شہر کا تم کو اختیار ہے جو جی چاہے وہ حال کرو۔

صاحب رزیڈنٹ بہادر۔ حضور ہرگز ہرگز ایسا خیال نہ فرمائیں اسی وقت ان فریادیوں کی دادرسی کرتا ہوں اور سب کو شہر میں آباد کیئے دیتا ہوں۔ حضور اپنا خیمہ ڈیرہ اُٹھوا منگائیں۔ صاحب رزیڈنٹ بہادر نے اُسی وقت زیر جھروکہ جا کر قصابان کو حکم دیا کہ جاؤ اپنے گھروں میں جا کر آباد ہو اور ڈیرہ خیمہ بادشاہ کا اٹھوا دیا۔

فریادِ شبانان

ایک بار گھوسیوں کو سرکار انگریزی نے حکم فرمایا کہ تم لوگ اپنی گائیں بھینسیں لے کر شہر سے نکلو اور بیرونِ شہر پناہ جا کر آباد ہو جاؤ۔ تمام شہر میں ایک غلغلہ برپا ہو گیا تمام گھوسی اپنے بال بچوں کو اور مویشی کو لے کر ریتی میں آ پڑے اب یہ حال ہوا اُدھر تو مویشی حیران پریشان گھبرائے ہوئے اِدھر فریادیوں کے

بال بچوں کی گریہ وزاری کی پکار یہ حال دیکھتے ہی بادشاہ رعیت پناہ کو کہاں تاب تھی۔ کہ یہ زیادتی دیکھ سکیں۔ بطور سابق پھر اپنا خیمہ ریتی میں بھجوادیا۔

پھر اُسی طرح ریذیڈنٹ بہادر آئے اور عرض معروض کی اور گھوسیوں کو حکم بھیجا کہ جاؤ بدستور قدیم شہر میں جاکر آباد ہو۔

ایک بار بادشاہ سلامت نے صاحب ریذیڈنٹ سے کہا کہ دیکھو بھئی میری موجودگی میں تم رعیّت کو گھر سے بے گھر نہ کرو اور بعد میرے تم کو اختیار ہے دلّی کی اینٹ سے اینٹ بجادینا۔ چنانچہ ایسا ہی ظہور میں آیا کابلی دروازہ سے لے کر قلعہ تک اور دریبہ سے لے کر قلعہ تک اور جامع مسجد سے لے کر دہلی دروازہ تک بلاقی بیگم کا کوچہ خانم کا بازار۔ خاص بازار خان دوران خاں کی حویلی سے دریا گنج تک ہزارہا مکانات منہدم اور مسمار کر کے دلّی کا چبوترہ بنا دیا گیا۔ اور چٹیل میدان کر دیا گیا ۔

تیسرا باب

ہنگامۂ غدر کا آغاز

ماہ رمضان کی پہلی

انقلابِ دہر نے دکھلائیں وہ نیرنگیاں

جب زباں پر لایئے اپنا نیا افسانہ ہے

اُف اُف کس قیامت کی گرمی ہے کہ جگر کباب ہوا جاتا ہے الحفیظ، الامان دھوپ کی تیزی العظمۃ للہ آسمان سے آگ برستی ہے گویا آفتاب سوا نیزہ پر اتر آیا ہے۔ پیاس کے مارے زبان نکل نکل پڑتی ہے حلق میں کانٹے پڑے جاتے ہیں زمین کا طبقہ کرۂ نار ہو رہا ہے وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار منہ سے بات تک نہیں نکلتی۔ نو بجے سے ٹٹیاں چھڑکی جاتی ہیں۔ پنکھا کھنچتا ہے مگر پسینوں میں شرابور ہوئے جاتے ہیں۔ دن کیا ہوتا ہے۔ حشر کا دن ہوتا ہے۔ پہاڑ کی طرح کاٹنا پڑتا ہے۔ ہونٹوں پر جان آ جاتی ہے رات کی گھمس اَللّٰھُمَّ احفظنا مِن کُلِّ بلاء الدُّنیا۔ چھڑکاؤ ہوتے ہیں۔ پنکھے جھلے جاتے ہیں پلنگ تر کئے جاتے ہیں۔ تاہم کسی طرح نیند نہیں آتی۔ کروٹیں لیتے لیتے صبح ہو جاتی

ہے ع بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار۔

ابھی سلامتی سے جیٹھ کے ۳ دن گزرے ہیں۔ پندرہ روزے پندرہ برس کی برابر تصور کرنے چاہئیں۔ خدا خدا کر کے سولھویں شب نصیب ہوئی۔ رات کے دو بج چکے ہیں تیسرے کا عمل ہے ہوا میں کسی قدر خنکی آگئی ہے جس قدر صبح قریب آتی جاتی ہے رات بھینی بھینی ہوتی جاتی ہے۔ روزہ دار سحری کو بیدار ہو کر خورد و نوش میں مشغول ہیں۔ پچھلا پہرہ سہانا وقت ہے۔ مسجد جامع کا نقارہ گونج گونج کر بیدار باش کی آواز لگا رہا ہے خفتہ گان خوابِ غفلت کو جگا رہا ہے۔ چوکیدار گھر گھر جاگو کی آواز لگاتے پھرتے ہیں محلہ محلے جگاتے پھرتے ہیں۔ سولھویں رات کا چاند وسطِ سما سے ڈھل کر قریب غروب پہنچ گیا ہے۔ روزہ داروں کے گھروں میں عجب چہل پہل ہے۔ گھر گھر ارتجگے کا سامان نظر آتا ہے۔ اب وہ وقت قریب آتا جاتا ہے کہ روزہ دارانِ شب بیدار روزے کی نیت باندھ کر خورد نوش سے دست بردار ہوں۔ گھڑی دو گھڑی بستر راحت پر دراز ہو کر استراحت فرمائیں۔ تناولِ طعام سے فارغ البال ہو کر پان کی گلوریاں کلوں میں دبا کر قلیان کے گھونٹ کھینچ رہے ہیں۔ اکثر جوان شرا شر سلفوں کے دم لگا رہے ہیں۔ آنکھوں میں نیند کا خمار ہے۔ بیٹھے بیٹھے اونگھے جا رہے ہیں۔ اودھر آسمان کا رنگ بدلنے لگا ہے۔ آثارِ صبح نمودار ہوتے جاتے ہیں صبح کا تارہ برآمد ہو چکا ہے مگر چاندنی کھل کھل کر اپنا روپ دکھا رہی ہے۔ دام تزویر بچھا رہی ہے عاشقانِ جمال کبریا با وضو ہو کر سر سجادہ بکمال خشوع و خضوع تسبیح و تہلیل حمد الٰہی میں محو حال و قال میں ہیں کہ یکایک توپ کے زناٹے کی آواز کانوں میں آئی تین منٹ تک برابر زناٹا رہا۔ جلدی جلدی پان تھوک کر غرارے کئے۔ و انت ما نجے اور البصوم غدا من شہر رمضان المبارک کہہ کہہ کر پلنگوں پر دراز ہوئے۔

ابھی کسی کو یہ خبر نہیں کہ صبح کو قیامت نمودار ہونے والی ہے ۔ مصنف

نہ رکھو آج کی کل پر کہ کل کس کو خبر کیا ہو مریض جاں بلب کو صبر امید سحر کیا ہو

اب مشرق کی جانب سے سفیدی کے بادل آسمان پر پھیلتے چلے آتے ہیں مطلع خورشید کا رنگ جو گیا متغیر فق ہوتا جاتا ہے قرص ماہتاب لب بام پہنچ کر تانبے کی تھالی کی طرح بدقلعی نظر آنے لگا ہے ۔ جھاڑ فانوس کی روشنی جھلملی جھلملی نظر آتی ہے ۔ چراغ سحری بیمار جاں بلب کی طرح ٹمٹماتا ہے ۔ دروازہ شہر پناہ کے دیدہ حیرت کی طرح نگراں ہیں کو چہ بندی کے پھاٹک چشم انتظار کی طرح حیراں ۔ صبح کا تڑکا نور ظہور کا وقت سہانا سماں ادھر گجر کی آواز ادھر مسجدوں میں اذانوں کا شور ادھر مندروں سے ناقوس کی پکار نقار خانوں سے دھیمی دھیمی نوبت کی ٹکور میں شہنائیوں کی سہاتی بھیرویں کی دھنیں جی کو بیکل کیے دیتی ہے نسیم سحری کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے نرم نرم چل کر جاگنے والوں کو تھپک تھپک کر سلا رہی ہے ۔ بیگم کے باغ کے ہوا کے جھونکے بناس کی پتی خوشبو میں لپٹ لپٹ کر عطر مجموعہ کے کھلنے سونگھا رہی ہے ۔ چوکیدار شب بیدار دوکانوں کے چبوتروں پر مُردوں سے شرط باندھ کر بے خبر سو رہے ہیں ؎

چو صبح از دم گرگ بر زد زبان بخفتند در آمد سگ و پاسباں

خروس غنودہ مرد کوفت بال دہل زن بزد بر تبیرہ دوال

لاہوری دروازہ سے نگر موت کے گھاٹوں تک حُسن کا دریا لہریں لے رہا ہے ۔ چاندنی چوک کی سڑک کہکشاں بنی ہوئی ہے ۔ ہزاروں چاند کے ٹکڑے سیاروں کی طرح جگمگاتے چلے آتے ہیں جس کو دیکھو آفت کا پرکالہ ہے ۔ ایک سے ایک اعلےٰ ہے ۔ سینکڑوں پرستان کی پریاں ۔ سو تواں نقشے چاند سے چہرے ۔ چھریرے بدن

نازک اندام۔ گلفام سرو قامت سیاہ پتلی سیاہ بال اُبھرے اُبھرے ہوئے سینے مرگ کیسی آنکھیں، چیتے کیسی کمریں۔ سر سے پاؤں تک چاندی سونے میں لدی پھندی چلی آتی ہیں۔ کامدانی اور تن زیب کے دوہرے دوپٹوں میں سے کندن سی بدن کی رنگت پھوٹی پڑتی ہے ؎

کیا تنِ نازک ہے جاں کو بھی حسد جس تن پہ ہے
کیا بدن کا رنگ ہے تہ جس کی پیراہن میں ہے

اودی اور سرمئی اطلسوں کے گھیر دار لہنگے۔ چوڑی چوڑی ٹھپے کی سنجاف۔ پور پور چھلّائی انگوٹھی چھلّے نازک نازک پتلی پتلی حنائی اُنگلیوں میں، ہیں وہی جیسی کنگنا جلیاں ؎

کیا چاہیے انہیں سرِ انگشت پر حنا
جس بگینہ کے خون میں چاہیں ڈبولیاں

گوری گوری پیشانیوں پر کچھ کچھ بکھرے ہوئے بال، نیند بھری آنکھوں میں پھیلا ہوا کاجل پتلے پتلے سرخ سرخ ہونٹوں پر بھینی بھینی مسّی کی دھڑی لاکھ لاکھ بناؤ دے رہی ہے

یہ شہر وہ ہے کہ غنچہ تھا حسن والوں کا
یہ شہر وہ ہے کہ تختہ تھا نونہالوں کا

یہ شہر وہ ہے کہ مجمع تھا مہ جمالوں کا
یہ شہر وہ ہے کہ مرجع تھا ذی کمالوں کا

یہ وہ زمیں ہے زمیں جس کی زر اُگلتی ہے
یہ خاک وہ ہے کہ اکسیر ہاتھ ملتی ہے

دریائے چمن میں نازنینان گلبدن کے جمگھٹوں سے تختۂ چمن نظر آتا ہے۔ دریا میں دوسرا دریائے پر نور موجیں مار رہا ہے۔ چاند دریا کی موجوں میں جھکولے لے رہے ہیں آسمان کے ستارے پانی میں دکھائی دے رہے ہیں۔ دریا کی موجیں شوقِ ہمکناری سے بیتاب دوڑی ہوئی چلی آتی ہیں۔ دریا کے حباب چشم بن کر ایک ایک کی صورت کو تاک رہی ہیں۔ ہزاروں آسمانِ خوبی کے ستارے مہین مہین ریشمی ساڑھیاں اوڑھے ہوئے

کمر کمر پانی میں غوطے لگا رہی ہیں۔ اکثر شوخ کم سن الھڑ پنے کے دن آپس میں چھینٹم چھینٹا ہو رہی ہیں ؎

کچھ نرالا ہے جوانی کا بناؤ
شوخیاں زیور ہیں اس سِن کیلئے

کوئی پری پیکر مہ جمال جمنا کا اشنان کر کے گھڑے گھڑے بالوں کو مروڑی دے کر نچوڑ رہی ہے۔ کوئی خشک ساڑھی باندھ کر گیلی ساڑھی کو مروڑی دے رہی ہے ؎

فشردہ پنجۂ مرجاں زابرِ مروارید
قمر زجیب شبِ اشکبار پیدا شد

گھاٹ میں ایک مصری مہاراج موٹے تازے چوڑے چکلے ننگ دھڑنگ ٹانگوں میں لنگوٹی سر پہ چوٹی جٹا لٹکائے توند پھیلائے آلتی پالتی مارے ہوئے براج رہے ہیں ایک پتھر کے چھوٹے سے چکلے پر ایک ہاتھ سے صندل گھستے جاتے ہیں۔ ایک جانب مہادیو کی بٹیا دھری ہے۔ مقابل میں اُس کے گورا پاربتی کی مورت رکھی ہے۔ اور سنگ مرمر کا ایک ناد یا بیل بیٹھا ہوا ہے۔ ایک کمل کے آسن پر کچھ پوجا پتری کا سامان سنکھ وغیرہ دھرا ہوا ہے۔ مہادیو پر کچھ دودھ کچھ پانی لنڈھا ہوا ہے۔ کچھ پھولوں کی پنکھڑیاں بکھری ہوئی ہیں۔ ایک جانب کوڑی پیسوں کا ڈھیر ہوتا جاتا ہے۔ اور ایک جانب اناج کا انبار ہے۔ نازنینانِ پری پیکر جو نہا دھو کر دریا سے نکلتی ہیں تو لباس پہن پہن کر پہلے آکر مہادیو کے درشن کرتی ہیں اور مصر جی مہاراج کو پا لاگن کہتے ہیں۔

مصر جی مہاراج ایک ہاتھ کی انگوٹھی سے پیشانی پر صندل کا ٹیکہ لگا دیتے اور ایک پنکھڑی تلسی کی مُنہ میں دے دیتے اور وہ روانہ ہوتی جاتی ہیں۔

میرٹھ میں غدر کی ابتداء

صبح ہوئی۔ گجر بجا۔ مرغِ سحر کا غل ہوا
کرنے لگے چمن چمن مرغِ چمن نواگری ؎

مسجد و خانقاہ سے شور اُٹھا صلوٰۃ کا
دَیر میں جا کے برہمن کرنے لگے ہری ہری

مرغانِ خوش الحان درختوں پر بیٹھے ہوئے حمدِ الٰہی چہچہا رہے ہیں۔ ہیڑی کے باغیچے میں چڑیوں کے چوں چوں کا وہ غُل شور ہے کہ کان پڑی آواز نہیں آتی مستانِ بادۂ توحید عالمِ وجد میں جھوم رہے ہیں۔ عجب کیفیت کا وقت ہے۔ سُرخیِ شفق اُفقِ آسمان پر پھوٹتی چلی جاتی ہے۔ مطلعِ خورشید گلناری ہوتا جاتا ہے۔ دامانِ سفیدہ چاک ہو کر آسمان کی رنگت نیلی نظر آنے لگی ہے۔ سورج کی گنگا جمنی کرنیں سنہرے روپہلے تاروں کی طرح پھیلی جاتی ہیں۔ آفتاب کی شعاعیں قلعۂ معلّٰے کے بلند منظروں کے سنہرے کلسوں پر پڑ پڑ کر اپنی چمک دمک دکھا رہی ہے۔ بیٹھک کا سنہری بُرج عکسِ شفقی سے سُنہری نظر آتا ہے۔ اس برج کو مثمن برج کہتے ہیں۔ یہ بادشاہانِ تیموریہ کی خاص نشستگاہ ہے اس کے نیچے چھت بھی اور چھتہ میں سیڑھیاں ہیں۔ اور دیوانِ خاص میں سے نیچے دریا کی طرف رستہ اُترتا ہے اور نیچے اُتر کر دریا کے کنارہ پر بطور پُشتہ ایک چبوترہ ہے جس کو ہیڑی کہتے ہیں اُس پر باغیچہ ہے جس کو پائین باغ دیوانِ خاص کہنا چاہیئے جس کا عرض تخمیناً بیس پچیس گز کے قریب ہوگا۔ سطحِ دریا سے پانچ چار گز کا ارتفاع ہے۔ مثمن برج وقتِ طلوعِ آفتاب مجازی آفتاب ہیں مشرق کی جانب سے آفتابِ دیگر کے قریب نظر آتا ہے۔ یا یوں کہنا چاہیئے کہ چودھویں تاریخ کا چاند وقتِ غروب طلوعِ آفتاب کے مقابل میں دوسرا آفتاب ہو جاتا ہے۔ یہ بُرج اندر سے بہت چوڑا چکلا ہے۔ اور ہشت پہلو ہے۔ اس لئے اس کا نام مثمن برج رکھا گیا ہے جس کو اب مثمن برج کہتے ہیں۔ بادشاہ شاہجہاں بعد نمازِ صبح اسی کے جھروکوں میں بیٹھ کر درشنیوں کو درشن دیا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ

قاعدہ مستمرہ آج تک جاری ہے۔ اُس کے شمالی۔ شرقی۔ جنوبی طرف کو پُرتکلّف نفیس خوش نما غرفے ہیں اُن کو جھروکے کہتے ہیں نیچے داہنی جانب کو ایک جنگلہ ہے جس میں میر فتح علی داروغہ کہاروں کا نشیمن ہے اور برابر میں دوسرا بنگلہ ہے اس میں حمید خاں رامپوری جمعدار خاص برداراں کا قیام ہے اور اُس کی برابر میں چھوٹا چھپر اور ہے اُس میں سیدی قمر جمعدار حبشیوں کا اور اُس پٹری کا طول قلعہ معلّٰی کی طول کے برابر ہے۔ اس پر پہرہ داروں کے خس پوش مکان بنے چلے گئے ہیں حضرت ظلِّ سبحانی خلیفۃ الرحمانی سراج الدین ابوظفر بہادر شاہ ثانی فریضہ صبح سے فارغ ہو کر جھروکوں میں بیٹھے ہوئے وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ سواری کی تیاری ہے تخت رواں جس کا سنہری ہودا ہے۔ اور چار ڈنڈے ہیں اُس پر زربفت کی مسند تکیے لگے ہوئے ہیں۔ اور کاشانی مخمل کا غلاف پڑا ہوا ہے وہ تسبیح کے صحن میں پڑا ہے۔ ڈیوڑھی کے دروازہ پر باناتی پردہ پڑا ہے تسبیح خانہ کے صحن میں خواجہ سرا اور خواص بادشاہی وغیرہ اور چند معززین دربار حاضر ہیں انتظار برآمد حضور ہے تسبیح خانہ کے چبوترہ کے نیچے پچاس ساٹھ کہار جن کی نوکری ہے سُرخ بانات کی وردیاں اور سُرخ پگڑیاں باندھے ہوئے کمر بستہ استادہ ہیں ثمن برج کے نیچے پٹری پر کوئی دو سو خاص بردار سرمئی دستار اور سرمئی پٹکے باندھے ہوئے بغلوں میں تلواریں دبائے دست بستہ کھڑے ہیں ایک جانب کو بیس جوان حبشی نوعمر گراں ڈیل سرخ کمخواب کی وردیاں سُرخ مندیلیں سُرخ پٹکے باندھے دست بستہ مؤدّب کھڑے ہیں نیچے پٹری کے پار رسالہ سواروں کا پرا جمائے ہوئے استادہ ہے جھدیلوں کے تختہ میں میر فتح علی اور حمید خاں اور سیدی قمر مسلّح دست بستہ کھڑے ہیں۔ جھروکہ کی جانب سب کی نگاہ ہے کہ یکایک بالائے جھروکہ سے کھنکارے کی آواز آئی میر فتح علی

ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھا۔ اشارہ سبابہ سے دریا کے پل کی جانب ایما ہوا۔ اب جو دریا کے پل کی جانب نگاہ کی تو دیکھا کہ دریا پار جو میر بحری کا بنگلہ ہے اُس میں آگ لگ رہی ہے اور شعلے اُڑ اُڑ کر آسمان کو جاتے ہیں۔ دریا کا کنارہ گرد وغبار اور دودِ آتش سے ہوا دار و تیرہ و تار ہو رہا ہے۔ میر فتح علی نے رسالدار کو حکم دیا کہ سوار بھیجکر خبر منگاؤ کہ یہ روشنی کیسی ہے۔ رسالہ سے نکل کر دو سواروں نے جو گھوڑوں کی باگیں لیں تو گرد باد ہو کے گھوڑے زمین سے لپٹ گئے آناً فاناً میں یہاں تھے یا وہاں تھے۔ ہنوز یہ موقع واردات پر نہ پہنچے تھے سلیم گڑھ کے نیچے پُل پر پہنچے تھے کہ دیکھا اُدھر سے بے تحاشا لوگ اور ملاح پل کے چپراسی بھاگے ہوئے چلے آتے ہیں۔ سوار ہیں خیر تو ہے کیا آفت نے جو اس طرح سراسیمہ منتشر الحواس بھاگے آتے ہو۔ چپراسی۔ اجی جناب خیر تو بخیر فوج اُتر آئی۔ میر بحری صاحب کو مار ڈالا۔ بنگلہ کو آگ لگادی۔ مال کا صندوق اور گولک لوٹ لی۔ ہم لوگ اپنی جان بچا کر بھاگے ہیں سواران بادشاہی نے یہ سنتے ہی اُلٹی باگیں پھیر دیں۔ کوئی پانچ منٹ میں واپس آکر خبر دی کہ کوئی غنیم دلی پر چڑھ آیا ہے۔ اُس کی فوج نے تاخت و تاراج پر کمر باندھی ہے۔ بنگلہ پھونک دیا۔ میر بحر کو مار ڈالا[1]۔

---

[1] ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے آغاز سے بہت پہلے دہلی میں انقلاب کی پیش گوئیاں ہوتی رہتی تھیں۔ لیکن اس انقلاب کی تفصیل سے کوئی شخص آگاہ نہ تھا تاہم عام طور سے یہ خیال تھا کہ اس انقلاب کا نتیجہ انگریزوں کے حق میں برا ہوگا۔ کوئی کہتا تھا ایران ہندوستان پر حملہ کرے گا۔ ایک مرتبہ شور اٹھا کہ ایرانی اٹک تک آچکے ہیں۔ پھر یہ افواہ پھیلی کہ ایرانی فوج درۂ بولان کے راستے سے آرہی ہے۔ کہا جاتا تھا کہ شاہ فارس پانچ لاکھ فوج اور سامانِ حرب تیار کر رہا تھا تاکہ ہندوستان کو فتح کرے اور کہ زار روس شاہ ایران کا ساتھ دے گا۔ ایک طرف شاہ نعمت اللہ ولی کی مشہور پیش گوئی کا چرچا تھا (باقی آئندہ صفحہ)

بیشگاہ حضور پر نور سے امیر فتح علی اور حمید خاں کو حکم ہوا کہ اپنی جمیعت لیجاؤ پُل توڑ دو کشتیاں کھینچ لو۔ کہ فوج اُترنے نہ پاوے۔ دروازہ شہر پناہ کے بند کرادو سواروں کو روانہ کرو کہ بری صاحب کو لے کر جلد حاضر ہوں اور تمام ملازمانِ شاہی اندکو نامہ کو حکم حضوری دربار پہنچ جائے۔ کوتوال شہر کو حکم پہنچے کہ دروازہ شہر کا پورا پورا بندوبست رکھے۔ کلکتہ دروازہ پر بذاتِ خود حاضر ہے۔ قلعہ دار صاحب کو حکم پہنچا دو کہ دروازہ قلعہ کی پوری پوری حفاظت رکھیں۔ سوار کو رخصت نوکری والے جلد گھوڑے دوڑا کر شہر میں داخل ہو کر دروازہ راج گھاٹ معمور کرا دیں۔

حسب الحکم تماشیم فوراً تعمیلِ حکم ہو گئی۔ سوار جابجا روانہ ہو گئے مگر یہاں سے جو جمیعت شکستِ پُل کے واسطے روانہ ہوئی تھی اُس کو حصولِ مطلب میں ناکامی حاصل ہوئی اور بے نیل مرام واپس آنا پڑا۔ ہنوز یہ سلیم گڑھ کے نیچے تھے کہ سامنے ملک الموت کی طرح سوار آتے دکھائی دیئے۔ یہ پُل تک نہ پہنچنے پائے اور وہ پُل کے ادھر اُتر آئے وہاں سے بہزار خرابی اُفتاں وخیزاں گریزاں سوارانِ باغیہ کے آتے آتے انہوں نے جھروکہ کی ڈیوڑھی کا دروازہ لیا چھتہ میں داخل ہو کر دروازہ ڈیوڑھی معمور کر دیا اور دیوانِ خاص اور تسبیخانہ میں حاضر ہو گئے مگر حضرت قدر قدرت ظلّ اللہ بادشاہ رعیت پناہ کمالِ جرأت و تہور کو فرما کے نہایت اوسان اور استقلال سے بجائے خود جس طرح

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷) مارچ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کو بھی شبہ ہوا کہ اہلِ قلعہ کا تعلق شاہ فارس سے ہے۔ انہیں ایام میں جامع مسجد دہلی کے دروازے پر ایک اشتہار چسپاں کیا گیا جس میں شاہ فارس کے حملہ کی اطلاع دی گئی تھی۔ اشتہار دہندہ کا نام محمد صادق لکھا تھا اخبارات میں اس اشتہار کا بہت چرچا ہوا۔ آخر مئی ۱۸۵۷ء میں میرٹھ چھاؤنی میں بہت جوش پھیل گیا (نظیر)

بیٹھے تھے بیٹھے رہے۔ ہرگز جنبش نہ کی، اور محل کی مستورات اور سراجات عصمت میں ایک تہلکۂ عظیم برپا ہو گیا۔ مگر حضرت بہ نفس نفیس سب کو کلماتِ صبر و تسکین فرما کے تشفی دیتے رہے۔

اِدھر سوارانِ باغیہ کشتیوں کے پل پر سے اتر کر سلیم گڑھ کے نیچے ہوتے ہوئے زیر جھروکہ پہنچے اور مردمانِ آئندہ و روندہ گریزاں ہو کر کلکتہ دروازہ میں داخل ہوئے دروازہ والوں کو اطلاع دی کہ دروازہ معمور کر دو

اِدھر مگنہ مو د دروازہ پر خبر ہو گئی نہانے دھونے والے گرتے پڑتے بھاگ کر شہر میں داخل ہوئے۔ وہ دروازہ بھی معمور ہو گیا۔ اسی اثنا میں محبوب علی خاں خواجہ سرا مختارِ بادشاہی اور حکیم احسن اللہ خاں آکر حاضر ہوئے حضورِ انور نے محل میں یاد فرمایا کہ یکایک سوارانِ نمک حرام بلائے آسمانی کی طرح نازل ہوئے اور زیر جھروکہ آکر پرا جما کر استادہ ہو گئے۔ اور حسب قاعدہ سلامی ادا کی حضورِ لامع النور نے حکیم احسن اللہ خاں کو حکم دیا کہ ان لوگوں سے دریافت کرو کہ تم کون لوگ ہو اور کہاں سے آتے ہو، اور کس کے نوکر ہو۔ اور یہاں کیوں آئے ہو۔

حکیم احسن اللہ خاں نے بموجبِ حکم تسبیح خانہ میں آکر سوارانِ باغیہ سے استفسار حال کرنا شروع کیا۔ چند افسر سواران گھوڑوں پر سے اتر کر پٹری پر آکر کھڑے ہو گئے اور زیر جھروکہ سے ہاتھ جوڑ کر عرض کرنا شروع کیا۔

باغی[1] سواروں کا بیان

حضورِ جہاں پناہ سلامت آپ دین و دنیا کے بادشاہ ہیں حق تعالےٰ نے آپ کو بائیس صوبہ کا

[1] یہ سوار ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو دہلی پہنچے تھے۔ (نظیر)

مالک کیا ہے۔ تمام ہندوستان آپ کا محکوم و فرمانبردار ہے۔ ہندوستان کی رعیّت آپ کی رعیّت شمار ہوتی ہے۔ آج تک ہندوستان میں جو منادی پھرتی ہے تو یہی بیان کیا جاتا ہے خلقت خدا کی ملک بادشاہ کا حکم کمپنی کا۔ انگریز لوگ آپ کی طرف سے مالک و مختار ہیں۔ ہم لوگ آپ کے پاس فریادی آئے ہیں۔ امیدوار انصاف ہیں۔ ہم لوگ ملازم انگریزی ہیں ہمیں لوگوں نے اپنی جانیں بیچ کر اور سر کٹوا کر کلکتہ سے لگا کر کابل کے ڈیرے تک فتح کر کے چودہ سو کوس میں عملداری انگریزی قائم کرا دی۔ اور ہمیں لوگوں کی استعانت و امداد سے تمام ہندوستان پر تسلّط ہو گیا۔ یہ ولایت سے کوئی فوج ہمراہ لے کر نہیں آئے تھے سب ہندوستانی فوج کی کارگزاری ہے۔ شہادت کے واسطے ہمارے پاس تمغے موجود ہیں۔ اب چونکہ تمام ہندوستان پر قبضہ اور تسلّط انگریزوں کا ہو گیا اور کوئی سرکش باقی نہ رہا۔ اب سرکار کی نیّت میں فتور واقع ہوا اور ہمارے دین و مذہب کے درپے تخریب ہوئے اور چاہا کہ تمام ہندوستان کو عیسائی کر لیں۔ اور ابتدا اس کی فرقۂ فوج سے ہونی چاہیے۔ چنانچہ باہم صلاح کر کے یہ تجویز قرار پائی کہ ایک قسم کی بندوق ایسی ایجاد کی گئی کہ جس میں ٹوٹا یعنی کارتوس دانتوں سے کاٹ کر بندوق کے منہ میں دینا پڑے اور اس ٹوٹے کو جانوروں کی جھلّی سے منڈھوایا گیا۔ اب نہ معلوم وہ جھلّی دراصل کس کس جانور کی ہے۔ وہ بندوقیں ہم لوگوں کو دی گئیں کہ تم کارتوسوں کو دانتوں سے کاٹ کر بندوقوں میں ڈالو ہم لوگوں نے بالاتفاق ہندو اور فرقۂ مسلمان نے تعمیل حکم سے انکار کیا کہ ہم ہرگز ہرگز ایسا امر نہ کریں گے خواہ سرکار نوکر رکھے یا نہ رکھے فرقۂ ہندو کو تو گئے کی جھلّی کا اشتباہ واقع ہوا اور اہل اسلام کو سوّر کی جھلّی کا۔ علاوہ ازیں ہندو نے یہ عذر کیا کہ ہم لوگوں میں اکثر برہمن، چھتری وغیرہ اعلیٰ قوم کے

لوگ ہیں وہ کسی جانور کے گوشت کو مُنہ نہیں لگاتے۔ مسلمانوں نے بھی یہ عذر پیش کیا کہ ہم
سوائے حلال جانور کے مُردار کو مُنہ نہیں لگاتے۔ خدا جانے یہ حلال جانوروں کا پوست
ہے یا مُردار ہمارے مذہب میں ہرگز جائز نہیں۔ ہم ہرگز تعمیلِ حکمِ سرکار نہ کریں گے۔ اس
پر سرکار کو یہ خیال ہوا کہ فوج نے عدولِ حکمی کی اگر ان پر تشدّد نہ کیا جائے گا تو ضعفِ حکومت
سرکار متصوّر ہے۔ سطوتِ شاہی میں فرق آتا ہے اور ہم لوگوں کو خیالِ دین و آئین دامنگیر
ہوا۔ نزاع بڑھ گئی۔ مقدمہ طول کھینچ گیا۔ چار مہینہ سے یہ تنازعہ درپیش ہے۔ حکام
میں کمیٹیاں ہو رہی ہیں اور ہم لوگوں میں بھی سوار پیادوں کی چھاونیوں میں جا بجا
چٹھیاں دوڑ گئی ہیں کہ یک قلم کُل فوج انکار کر جائے اور نوکری چھوڑ دے اور
زیادہ تشدّد ہو تو ایک دن ایک تاریخ بالاتفاق تمام ہندوستان میں غدر مچا دو۔
پھر دیکھو یہ کیا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ مفسدہ کا ظہور اب آکر ہوا اور تمام فوج یک قلم
جادۂ اطاعت سے منحرف ہو گئی۔ اور بنا اس بغاوت کی اس طور پر واقع ہوئی کہ حکام
کی کمیٹیوں میں یہ بات قرار پائی کہ پہلے بسم اللہ میرٹھ سے ہونی چاہیئے کہ یہ مقام صدر ہے
اور بہت بڑا بھاری کمپو یہاں مقیم ہے اور پڑنے بھروسہ کی فوج کی اسی جا پر چھاؤنی ہے۔
جب یہ کمپو ٹوٹا کاٹ لے گا تو کسی اور فوج کو مجال سرتابی کی نہ ہو گی۔ چنانچہ حسبِ صلاح بالا
ایک روز اور ایک تاریخ مقرر کر کے پریٹ پر فوج گورے کی جمائی گئی اور سولجروں
کا توپ خانہ اور رسالہ کھڑا کیا گیا۔ اور تیسرے رسالہ خاص ہندوستانی کو بلوا کر
پریٹ پر استادہ کیا گیا اور افسران رسالہ کو بندوقیں اور کارتوس دے کر حکم سنایا گیا
کہ تم اس ٹوٹے کو کاٹو۔ افسران نے معذرت کی کہ سرکار معاف فرمائیے۔ ہم دین سے
بے دین کبھی نہ ہوں گے۔ خواہ سرکار ہم کو توپ سے اڑا دے۔ جب افسروں نے

انکار کیا تو پھر دوبارہ ان کو حکم سنا دیا گیا کہ تم کو ٹوٹا کاٹنا پڑے گا پھر بالاتفاق سب نے اُسی طرح انکار کیا انجام کو سہ بارہ یہی حکم صادر ہوا۔ اس جانب سے وہی جواب صاف ملا اُس وقت حکم ہوا کہ ہتیار دے دو۔ ہم لوگوں نے ہتیار ڈال دیئے۔ پھر حکم ہوا۔ کہ گھوڑوں سے اتر پڑو ہم گھوڑوں سے اُتر پڑے۔ پھر حکم ہوا کہ افسر لوگ فوج سے علیحدہ ہو جائیں۔ ہم چودہ اسی افسر جھٹ کر رسالہ سے الگ ہو کر کھڑے ہو گئے پھر حکم ہوا کہ ان کے ہاتھوں میں ہتکڑیاں ڈال دو۔ جب بھی عدول حکمی نہ کی۔ خوشی خوشی ہتکڑیاں پہن لیں۔ کچھ عذر نہ کیا پھر حکم ہوا تم لوگوں کو عدول حکمی کی سزا دی جاتی ہے۔ تم جیل خانے جاؤ۔ ہم سلام کر کے جیل خانہ کو چلے گئے۔

تدبیر سے تقدیر مٹائی نہیں جاتی
بگڑی ہوئی قسمت کی بنائی نہیں جاتی

۱؎ ۱۸۵۷ء کے غدر کی بڑی وجوہ یہ تھیں کہ لارڈ ڈلہوزی نے جو ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۶ء تک ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات کے گورنر جنرل رہے۔ بہت سی اصلاحات کیں وہ تمام دیسی ریاستوں اور دہلی کی مغل شہنشاہی کو ختم کرنا چاہتے تھے اگرچہ کمپنی نے انکی اس تجویز کو نہیں مانا تاہم ڈلہوزی کی الحاق کی پالیسی سے تمام والیانِ ریاست ناراض ہو گئے تھے انہیں یہ فکر ہو گیا تھا کہ ان کی ریاستیں جاتی رہیں گی فیصلہ کیا گیا کہ موجودہ مغل بادشاہ کی وفات کے بعد شاہی خاندان کو قلعہ سے نکال کر قطب میں آباد کیا جائے۔ جھانسی کی رانی کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اس نے کسی کو متبنیٰ بنانے کی اجازت مانگی جو نہیں دی گئی۔ باجی راؤ کے متبنےٰ نانا صاحب کو پنشن دینے سے انکار کر دیا گیا۔ یہ ایسی باتیں تھیں جن میں والیانِ ریاست کو اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا۔ اسی زمانے میں ایک فوجی قانون منظور کیا گیا جس کی رو سے فوج کو دنیا کے ہر حصے میں لڑائی کیلئے روانہ کیا جا سکتا تھا۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

میرٹھ چھاؤنی کا حال

بیک گردش چرخ نیلوفری ہنہ نادر بجا ماند و نے نادری
جب ہم داخل جیلخانہ ہوئے تو کیمپ میرٹھ میں تہلکۂ
عظیم برپا ہو گیا اور گھر گھر کھچڑی پکنے لگی اور باہم صلاح و مشورہ ہونے لگے خصوصاً

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۶) ہندوؤں کے مذہب میں سمندر پار جانا گناہ تھا۔ اس لیئے ہندو اس قانون کو مذہب میں مداخلت سمجھتے تھے سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ہندوستانیوں کو بڑے عہدے نہیں دیئے جاتے تھے۔ حکومت میں اُن کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ اس وجہ سے ملک میں انگریزوں کے خلاف عام نفرت پھیل رہی تھی اور یہ سمجھا جا رہا تھا کہ انگریز رعایا کو زبردستی اپنا غلام اور عیسائی بنا رہے ہیں چونکہ مغلوں کے عہد میں ہندوستانیوں کو اعلیٰ ترین عہدے دیئے جاتے تھے لوگوں کو مذہبی آزادی حاصل تھی ملک کی دولت ملک ہی میں رہتی تھی سمندر پار نہیں جاتی تھی مغل اس ملک کو اپنا ملک سمجھتے تھے اس لئے انگریزی حکومت کے مقابلے میں لوگوں نے مٹی ہوئی مغل سلطنت کو زندہ کرنیکا ارادہ کر لیا

غدر کی ابتدا مئی ۱۸۵۷ء میں میرٹھ میں ہوئی (جیسا کہ باغیوں نے اوپر بیان کیا ہے بعد ازاں بغاوت کی آگ دوسری چھاؤنیوں میں بھی پھیل گئی۔ اور جہاں جہاں موقع ملا باغیوں نے انگریز افسروں کو قتل کر دیا۔ کانپور اور لکھنؤ باغیوں کے مرکز تھے لکھنؤ میں نواب واجد علی شاہ کے خاندان کے ایک شاہزادے کو باغیوں نے بادشاہ بنا دیا۔ ایک سال پیشتر انگریزوں نے نواب واجد علی شاہ سے اودھ کی حکومت لے کر انہیں مٹیا برج (کلکتہ) میں نظر بند کر دیا تھا)، باجی راؤ سابق پیشوا کا متبنٰے نانا صاحب انگریزوں کا جانی دشمن تھا۔ اس نے باغیوں کی قیادت اختیار کی اس کے مقابلہ کے لئے جنرل ہیولک کو بھیجا گیا جس نے نانا صاحب کو شکست دی، اور وہ روپوش ہو گیا۔

لکھنؤ میں سر کالن کیمبل نے باغیوں کو شکست دی۔ باغیوں کا اصلی مرکز دہلی تھا انگریزوں نے دہلی کا محاصرہ کرنے کے لئے کلکتہ بمبئی مدراس اور پنجاب سے فوجیں منگائیں۔ جنرل نکلسن نے دہلی میں

(باقی آئندہ)

فرقۂ مستورات میں ہمیشہ سے ناقص العقل کوتہ اندیش ہوتے آئے ہیں ان کو ہرگز اپنے انجام پر نظر نہیں ہوتی۔ اُن میں اکثر عورتیں تھیں کہ جن کے ورثا محبوس ہوئے تھے انہوں نے زبان طعن و تشنیع سے پنکھا جھل جھل کر نائرہ فتنہ و فساد کو بھڑکانا شروع کیا اور اُن کی چرب زبانی آتش فساد پر روغن کا کام کر گئی۔ اس محل پر دیوانہ را ہوئے بس است کا مضمون صادق آیا۔ ان عورات نے مردوں کو طعنے دینے شروع کئے کہ تم لوگ مرد ہو اور سپاہ گری کا دعویٰ کرتے ہو مگر نہایت بزدلے اور بے عزت اور بے غیرت ہو تم سے تو ہم عورتیں اچھیں۔ تم کو شرم نہیں آتی کہ تمہارے سامنے تمہارے افسروں کے ہتکڑیاں بیڑیاں پڑ گئیں۔ اور تم کھڑے کھڑے دیکھا کئے اور تم سے کچھ نہ ہو سکا۔ لو یہ چوڑیاں تو تم پہن لو اور ہتیار ہم کو دو ہم افسران کو چھوڑا کر لاتی ہیں۔ ان کلمات فتنہ انگیز نے اور اشتعال طبع پیدا کیا اور تمام فوج کے دلوں میں جوش و خروش مردی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۷) باغیوں کو شکست دی تاہم وہ خود اس لڑائی میں کام آیا۔ رانی جھانسی اور تانتیا توپی نے بڑی بہادری سے انگریزی فوج کا مقابلہ کیا۔ رانی تو میدان جنگ میں لڑتی ہوئی ماری گئی۔ تانتیا توپی کو گرفتار کر کے ۱۸۵۹ء میں پھانسی دے دی گئی۔

بمبئی اور مدراس کی فوجوں کا مقابلہ سیندھیا اور ہلکر کی مرہٹہ فوجوں سے ہوا جس میں مرہٹوں کو شکست ہوئی۔ اور انگریزوں نے کئی قلعے فتح کر لئے مگر سیندھیا اور ہلکر نے انگریزوں سے صلح کر لی۔

غدر کے ایام میں پنجاب میں امن رہا بلکہ پنجاب کی سکھ فوج کی امداد سے جنرل نکلسن نے دہلی کو فتح کیا۔ اور ہزاروں بے گناہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا خون بہایا۔

اور مردانگی کی آگ بھڑک اُٹھی اور مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔ اور باہم یہ صلاح قرار پائی کہ شب کو چل کر جیل خانہ توڑ کر افسرانِ فوج کو چھوڑ لاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ظہور میں آیا۔ وقتِ شب افواج پیادہ و سوار متفق کمر بندی ہو گئی اور جیل خانہ پر چڑھ گئے اور جیلخانہ توڑ کر چوراسی افسر جو قید تھے ان کو قید سے نکال لائے اور ان کی ہتکڑیاں اور بیڑیاں سب کاٹ لیں اور اُن کے ہمراہ جو اور بدمعاش بد پیشہ چونٹے اٹھائی گیرے ڈاکو، خونی، ٹھگ وغیرہ وغیرہ جو جیل خانہ میں قید تھے سب کو رہا کر دیا۔ اور بیڑیاں سب کی کاٹ دیں۔ اب تمام شہر میں غدر مچ گیا اور ہنگامہ جدال و قتال گرم ہوا۔ سرکار کی جانب سے گوروں کی کمر بندی ہوئی اور رسولجروں کا توپ خانہ لا کر لگا دیا گیا۔ اب وہاں سے وہاں توپ کے فیر ہونے لگے اور ہماری طرف سے جواب میں بندوقوں کی بار جھڑنے لگی۔ تمام شب گوروں کی اور ہماری جنگ ہوتی رہی۔ صبح کو ہم لوگ دہلی کو روانہ ہوئے۔ شبانہ روز میں تیس کوس کی مسافت طے کر کے آج اس وقت ہم یہاں پہنچے ہیں۔ بادشاہ سلامت ہمارے سر پہ ہاتھ رکھیں۔ اور ہمارا انصاف فرمادیں۔ ہم دین پر تجہ کر آئے ہیں۔

بادشاہ کا جواب سنو بھائی مجھے بادشاہ کون کہتا ہے میں تو فقیر ہوں ایک تکیہ بنائے ہوئے اپنی اولاد کو لئے بیٹھا ہوں۔ بادشاہت تو بادشاہوں کے ہمراہ گئی۔ میرے باپ دادا بادشاہ تھے جن کے قبضہ میں ہندوستان تھا۔ سلطنت تو سو برس پہلے میرے گھر سے جا چکی تھی۔ میرے جد و آبا کے نوکر چاکر اپنے خاندانِ نعمت کی اطاعت سے جداگانہ رئیس بن بیٹھے۔ میرے باپ دادا کے قبضہ سے ملک نکل گیا۔ قوتِ لایموت کو محتاج ہو گئے۔ خصوصاً میرے جدِ بزرگوار

حضرت شاہ عالم بادشاہِ غازی کو جب غلام قادر نمک حرام نے قید کرکے نابینا کیا ہے تو پہلے مرہٹوں کو طلب کیا گیا تھا اور انہوں نے اس نمک حرام کو کیفرِ کردار کو پہنچایا۔ حضرت بادشاہ کو قید سے چھڑایا۔ چند سال مرہٹے بادشاہ کی جانب سے مختار رہے۔ مگر بادشاہ کے صرف مطبخ کا بندوبست بھی نہ کرسکے۔ لاچار ہوکر میرے دادا نے منجانب سلطنتِ برطانیہ رجوع کی اور انگریزوں کو بلواکر اپنے گھر کا مختار فرمایا۔ اور ملک ہندوستان اُن کے تفویض کیا اور ان لوگوں نے حسبِ دلخواہ اخراجاتِ شاہی کا بندوبست کردیا اور ملک میں امن وامان کا ڈنکا بجادیا۔ اُس روز سے آج تک ہم لوگ بہ عیش وعشرتِ تمام بسر کرتے چلے آتے ہیں ہمیں کسی طرح کا فکر واندیشہ دامنگیر نہیں اور بکمال خوشحالی وفارغ البالی وعیش وعشرت سے بسر اوقات کرتے ہیں۔ لڑائی جھگڑے سے کچھ کام نہیں اُس کا انسداد اور انتظام انگریز لوگ خود کرلیتے ہیں ہیں تو اک گوشہ نشین آدمی ہوں مجھے ستانے کیوں آئے میرے پاس خزانہ نہیں کہ میں تم کو تنخواہ دوں گا میرے پاس فوج نہیں کہ میں تمہاری امداد کرونگا میرے پاس ملک نہیں کہ تحصیل کرکے تمہیں نوکر رکھوں گا۔ میں کچھ نہیں کرسکتا ہوں۔ مجھ سے کسی طرح سے توقع استعانت کی نہ رکھو۔ تم جانو یہ لوگ جانیں۔ ہاں ایک امر میرے اختیار میں ہے البتہ وہ ممکن ہے کہ میں تمہارے درمیان میں ہوکر انگریزوں سے تمہاری صفائی کراسکتا ہوں تم ابھی یہیں ٹھہرے رہو میں نے صاحب ریزیڈنٹ کو بلوایا ہے۔ وہ میرے پاس آنے والے ہیں پہلے میں اُن سے دریافت کرلوں اُن کی زبانی مجھے حالِ فتنہ وفساد معلوم ہوجائے گا۔ اور خدا چاہے تو میں اس فساد کو رفع دفع کرادوں گا۔ غرض کہ یہ گفتگو ہنوز ناتمام تھی کہ فریزر صاحب ریزیڈنٹ بہمراہی قلعدار صاحب داخل

دیوانِ خاص ہو گئے۔ خواجہ سرا جا کر آداب کورنش بجا لایا اندر سے حکم آیا کہ دونو صاحب محل میں حاضر ہوں اُس وقت صاحب ریذیڈنٹ بہادر قلعدار صاحب اور احسن اللہ خاں اور محبوب علی خاں ہر چہار اشخاص محل شاہی میں داخل ہوئے۔

ریذیڈنٹ کی باریابی

حضور پُرنور۔ کیوں بھئی۔ یہ کیا فتنہ و فساد برپا ہو گیا۔ یہ مذہب کا جھگڑا کیسا اُٹھ کھڑا ہوا۔ یہ مقدمہ دین آئین کا ہے تعصّب مذہبی بہت بُری شے ہے۔ اس میں اکثر سلطنتیں معرضِ زوال میں آ گئی ہیں۔ لاکھوں آدمیوں کا کُشت و خون ہو گیا ہے۔ اس فتنہ کا جلد انسداد ہونا واجب ہے۔ سرِ چشمہ شاید گرفتن بہ بیل چو پُر شد نشاید گذشتن بہ پیل مبادا فتنہ و فساد ہندوستان میں عالمگیر ہو جائے اور لاکھوں آدمیوں کا کُشت و خون ظہور میں آئے اور انتظامِ مالی و ملکی میں فرق واقع ہو۔ بنا بنایا کام بگڑ جائے جہاں تک ممکن ہو نرمی اور آشتی سے کام نکالا چاہیئے۔ یہ لوگ جاہل ہیں۔ فرقہ سپاہ جاہل ہوتا ہے۔ ان سے تھپک کر کام نکالنا چاہیئے اور ان کو ہدایت کرو کہ یہ لوگ اس فتنہ و فساد سے باز آئیں۔ جائے تعجب ہے کہ تم کو اس معاملہ کی اب تک خبر نہیں۔

صاحب رزیڈنٹ بہادر: حضور غلام کے پاس شب کے گیارہ بجے سوار نے چھٹی لا کر دی مجھ کو چونکہ اُس وقت نیند کا غلبہ تھا میں سمجھا کوئی معمولی چھٹی ہے اُس وقت کچھ خیال نہ کیا۔ پاکٹ میں ڈال کر سو رہا صبح کو جب حضوری سوار میرے پاس پہنچے اُس وقت میں نے چھٹی پڑھی تو حال معلوم ہوا حضور کچھ اندیشہ فرمائیں خاطر جمع رکھیں۔ بلوائی لوگ ہے کیا کر سکتا ہے حضور کے اقبال سے سب رفع دفع

ہو جائیں گے۔ غلام باہر جا کر ابھی اُن کو فہمائش کرتا ہے۔ خدا چاہے تو فساد بڑھنے نہ پائے گا۔ یہ عرض کر کے صاحب رزیڈنٹ بہادر محل سے برآمد ہوئے تسبیح خانہ کے صحن میں کٹہرے کے برابر کھڑے ہوئے حاضرین دربارِ شاہی سب برابر صف باندھے ہوئے کھڑے ہیں۔ دربار کی جانب سب کا رُخ ہے۔ حکیم احسن اللہ خاں بہادر کے لڑکے استادِ قلعہ دار صاحب بھی موجود ہیں۔

ریذیڈنٹ باغیوں کے سامنے

صاحب رزیڈنٹ بہادر:- کیوں بابا لوگ یہ کیا فتنہ و فساد تم نے برپا کر دیا۔ ہم لوگوں نے تم لوگوں کو سوال سے پوچھ کر تیار کیا ہے۔ ہم کو یہ دعوٰے تھا کہ اگر روس ہندوستان کی طرف پاؤں بڑھائے گا۔ تو ہم سرحد پر اُس کا سر توڑیں گے اور اگر ایران پیش قدمی کرنے کا ارادہ کرے گا۔ تو ہم اُس کو وہیں پسپا کر دینگے۔ اگر کوئی سلطنت ہندوستان کی طرف رُخ کرے گی تو اُس کو دنداں شکن جواب دیں گے یہ خبر نہ تھی کہ ہماری فوج ہمارے ہی مقابلہ کو تیار ہو گی۔ کیوں بابا لوگ شرطِ نمک خواہی یہی تھی کہ آج تم ہمارے مقابلہ کو تیار ہوئے ہو۔ ہم نے تم کو اسی واسطے کروڑہا روپیہ صرف کر کے تیار کیا تھا۔

سواران فوج باغیہ غریب پرور حضور سچ فرماتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں سرکار نے ہم لوگوں کو اسی طرح پالا اور پرورش کیا ہے سرکار کے حقوق نمک ہم نہیں بھولینگے مگر ہم لوگوں نے آج تک سرکار کی کوئی نمک حرامی نہیں کی۔ جہاں سرکار نے ہم کو جھونک دیا ہم آنکھیں بند کر کے آگ میں پانی میں کود پڑے کچھ خوف جوکھوں کا نہ کیا سر کٹوانے میں کہیں دریغ نہیں کیا۔ کابل پر ہمیں لوگ گئے۔ لاہور ہمیں لوگوں نے

فتح کیا۔ کلکتہ سے کابل تک ہمیں لڑے بھڑے سر کٹوائے جانیں دیں۔ اور حق نمک ادا کیا۔ اب جبکہ تمام ہندوستان پر سرکار کا قبضہ ہوگیا تو سرکار ہمارے دین آئین کے درپے ہوئی ہمیں کرسٹان بنانا چاہا۔ ہم سے ٹوٹا کٹوانے کو کہا تو ہم لوگ اپنے دین آبائی کو چھوڑ کر کس طرح بیدین ہو جائیں ہم کو مرجانا قبول ہے مگر دین سے بے دین نہ ہوں گے۔ اب سرکار جو چاہے ہمارا کرے۔ ہم سب مرنے پر تیار ہیں اور ہم اپنے کو اُس وقت تک مردہ تصور کر چکے ہیں کہ جس وقت جیل خانہ توڑ کر افسروں کو برآمد کیا۔

صاحب رزیڈنٹ بہادر گفتگو بابا لوگ تم اس خیال کو جانے دو اور ہمیں مارنے سے باز آؤ اب تم کو کوئی نہیں مارے گا۔ ہم بیچ میں پڑے ہیں اور ضامن ہوتے ہیں اور خدا کو گواہ کرتے ہیں اور خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ ہم تم سے دغا نہ کریں گے اور تمہارے حق میں انصاف کریں گے اور اُن لوگوں کو سزا دلوائیں گے۔ جنھوں نے یہ فتنہ برپا کرایا ہے اور وہ لوگ سزایاب ہوں گے اور سب کے سب ٹھیک کیئے جائیں گے۔ اب تم مار کٹائی ترک کرو اور لوٹ مار سے باز آؤ۔ اور بادشاہ سلامت کا بھی یہی حکم ہے کہ تم لوگ دین پر پکے ہو۔ ہم تمہارے دین کا بندوبست کرا دیتے ہیں تم کشت و خون سے باز آؤ اور بادشاہ صاحب خود درمیان میں پڑے ہیں (فوج باغیہ) غریب پرور ہم کو سرکار کے قول کا بھروسہ نہیں معلوم ہوتا۔ سرکار نے اکثر جا بجا دھوکہ دے کر ملک گیری کی ہے۔ آج تو ہم سرکار کی اطاعت قبول کریں کل سرکار ہم کو پکڑ کر پھانسی پر کھینچ دے۔ ایسی حالت میں ہم کو بھنگی کے ہاتھ سے پھانسی کھانے سے تلوار کے منہ سے مرنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔

صاحب ریذیڈنٹ بہادر نہیں نہیں تم لوگ ایسا ہرگز خیال نہ کرو ہم انجیل پر ہاتھ دھر کے کہتا ہے کہ ہم تم سے ہرگز دغا نہ کرینگے اور بادشاہ صاحب کا بھی فرمانا یہی ہے۔ اس میں اکثر جو سمجھدار تھے۔ انھوں نے کہا ہاں صاحب بہادر سچ تو فرماتے ہیں جس طرح صاحب بہادر فرمائیں قبول کرنا چاہیئے۔ مگر بعض جہال نافہم جن کے سر پر مظالم کا بھوت سوار تھا اور موت دامنگیر تھی وہ بولے کہ انگریز لوگوں کے قول و قسم کا اعتبار نہیں۔ یہ لوگ قول دے کر پھر جاتے ہیں۔ یہ لوگ عیسائی ہیں۔ ان میں باہم تکرار ہونے لگی۔ آدھے تو یہ کہتے تھے میاں صاحب کا کہنا مان لو۔ آخر یہ بھی حاکم وقت ہیں، دلی کے مالک ہیں یہ کبھی ہم سے فریب نہ کرینگے اور آدھے اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ ہم ہرگز ہرگز نہیں مانیں گے۔ آخر ایک نالائق سپاہی بولا کہ لو ہم فیصلہ ہی کئے دیتے ہیں۔ جھٹ بندوق چھتیا کر صاحب رزیڈنٹ بہادر پر فیر کر ہی دیا مگر اُس وقت قضا نہ تھی۔ وہ بندوق کی گولی صاحب بہادر اور حکیم احسن اللہ خاں کے برابر میں سے نکل کر تسبیح خانہ کے ستون پر جا کر لگی اور سنگ مرمر کا ٹکڑا ٹوٹ کر گر پڑا وہ ستون آج تک ٹوٹا ہوا موجود ہے۔ حکیم احسن اللہ خاں نے صاحب بہادر کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پیچھے کر لیا اور کہا یہ لوگ ہرگز نہ مانیں گے جو حق فہمائش تھا وہ ہو لیا اب اور تجویز کرنی چاہیئے۔

صاحب ریذیڈنٹ بہادر نے پھر محل میں جانے کی اجازت طلب کی اور محل میں جا کر بادشاہ سے عرض کی کہ جو حق سمجھانے کا تھا سمجھا لیا گیا۔ مگر یہ لوگ نہیں مانتے ہیں۔ ان لوگوں کے سر پر قضا سوار ہے ابھی جا کر ان کا بندوبست کرتا ہوں ابھی اُن کو اڑا دیا جائے گا ان کے انفصال کو تعیبان کوتوالی کی پلٹنیں کافی ہیں۔

اٹھارہ سو نجیب سے بہت ہے ۔

بادشاہ سلامت ۔ اچھا جو میرے آدمی موجود ہیں اپنی حفاظت کو ہمراہ لیجاؤ ۔

صاحب رزیڈنٹ بہادر مسکرا کر ۔ دربار کی سو بھا کے آدمی ہیں ڈیوڑھی کی حفاظت کو رہنے دیجئے حضور کا اقبال کافی ہے ۔ حضور خاطر جمع رکھیں ۔ حضور پراگندہ خاطر نہ ہوں بندوبست ہوا جاتا ہے ۔

ریذیڈنٹ کی واپسی

صاحب ریذیڈنٹ بہادر محل سے برآمد ہوئے ۔ قلعدار صاحب اور صاحب بہادر لال پردہ کے دروازہ سے نکل کر بخشی گری کے چوک میں ہوتے ہوئے جالی کے دروازہ میں آئے اور دیوانِ عام کا چوک طے کر کے نقار خانہ کے باہر آکر بگھی پر سوار ہوئے قلعدار صاحب ہمراہ میں یہ دونو صاحب بگھی پر سوار ہیں اور نقار خانہ کے آگے کا چوک طے کر کے قلعہ کے چھتہ سے گزر کر قلعہ کے دروازہ سے باہر ہوئے اور کھوکس میں بگھی کو روک کر دروازہ کی کمپنی کو کمر بندی کا حکم دیا اور کہا کہ تم کھوکس کی دیوار پر بندوقیں بھر کر تیار رہو اور جو باغی لوگ دروازہ پر آئیں ۔ اُن کو اُڑا دو اور کارتوس توشدان میں بھر داؤ ہم کلکتہ دروازہ کے بندوبست کو جاتے ہیں ۔ خبردار رہو دروازہ کھوکس کا بند رکھو ۔ کھڑکی کھلی رہنے دو ۔ یہ کہہ کر دونو صاحب بگھی پر سوار کھوکس کے دروازہ سے باہر آئے کلکتہ دروازہ پر پہنچے وہاں جا کر دیکھا کہ دروازہ معمور ہے کوتوال شہر اور تھانیدار اور جمعدار و سپاہی سب مستعد ہیں ۔ شہر پناہ کے ڈنڈے پر کلکتہ دروازہ سے موت دروازہ تک نجیب لین جمائے کھڑے ہیں ناکوں پر بھی موجود ہیں تک موت دروازہ اور کلکتہ دروازہ کے مابین جو ایک برج چھوٹا سا شہر پناہ کا ہے اُس پر ایک توپ

چڑھی ہوئی ہے۔ اور اُس کا رُخ پل کی طرف کے روزن میں سے پل کی طرف ہے اب احتمال یہ ہے کہ آخر فوجِ باغیہ جو دریائے جمن سے عبور کر کے آئے گی تو اُسی دروازہ سے آئے گی۔ اس انتظار میں ساری فوج نجیبان کی جمی کھڑی ہے یہاں تو انتظام ہو رہا ہے۔ سب کیل کانٹے سے درست ہیں۔ جنگ کا سامان ہے بر گشتگی تقدیر کی کسی کو خبر نہیں ہے

کہن چرخِ مشعبد حقہ باز است　　　پئے آزارِ مردم حیلہ ساز است

پانچ سوار

صاحب رزیڈنٹ بہادر تو ادھر رخصت ہو کر آئے چرخ شعبدہ باز نے اُدھر تازہ بازی آغاز کی۔ سوارانِ باغیہ واپس ہو کر کلکتہ دروازہ کی طرف تو گئے نہیں اُنہوں نے راج گھاٹ دروازہ کی طرف رُخ کیا اور راجگھاٹ دروازہ پہنچے اینجا روایاتِ مختلفہ گوش گذارِ راقم ہوئی ہیں۔ بعض کا بیان ہے کہ دروازہ بند تھا اور نجیب دروازہ پر موجود تھے۔ جمنا کے اشنان کرنے والے بہت سے منتظر تھے کہ دروازہ باز ہو تو ہم جا کر اشنان کریں مگر دروازہ بند تھا پانصد کے قریب آدمی جمع ہو گئے تھے۔ دروازہ والوں سے بحث کر رہے تھے کہ دروازہ کھول دو تو ہم جا کر اشنان سے فارغ ہوں تو روٹی ٹکڑا کریں۔ دروازہ والے انکار کرتے تھے۔ کہ ہر گز دروازہ بے حکم سرکار نہیں کھلتا ہے آخر نوبت زدوکوب کی پہنچی اور لوگوں نے بلوا کر کے پتھروں سے قفل دروازہ توڑ کر دروازہ کھول دیا۔ یا یہ کہ دروازہ دراصل پہلے سے کھلا ہوا تھا مگر یہ بھی قرینِ قیاس نہیں دروازے شہر کے سب معمور ہو چکے ہیں اور جب کلکتہ دروازہ پر تو اتنا بندوبست ہے تو اور دروازے کیسے کھلے رہ سکتے ہیں۔

غرضکہ اس روایت کی تحقیق پوری طور پر راقم کو نہیں کہ دروازہ کیونکر کھلا۔

قصہ مختصر سواران باغیہ راجگھاٹ کے دروازہ سے شہر میں داخل ہوئے اور دروازے کی سڑک جو کھاتی چوکی دریا گنج کی چوڑائی میں سنہری مسجد کے سامنے جا کر تمام ہوتی ہے۔ وہاں سنہری مسجد کے نیچے چوراہہ ہے ایک سڑک تو لال قلعہ کے نیچے ہوتی ہوئی لال ڈگی کو جاتی ہے اور ایک راستہ خاص بازار کو جاتا ہے اور یہیں سے قلعہ کے نیچے کا میدان شروع ہے اور جنوب کے جانب یہیں دو سڑکیں برابر دلی دروازہ کو جاتی ہیں۔ نہر مائل ہے اور ایک سڑک گوشہ جنوبیہ او رمشرقی میں دریا گنج کو جاتی ہے۔ اس میں اول ہی سڑک کے سرے پر پادری صاحب کا بنگلہ ہے۔ یہ پادری صاحب اوّل تو ہندو تھے پھر عیسائی ہو گئے تھے اوّل انہیں پر چوٹ ہوئی۔ پہلی بسم اللہ کشت و خون کی یہیں سے شروع ہوئی ہے۔

سواران باغیہ بنگلے کی قطع دیکھ کر بنگلہ کی غلام گردش میں آ کر کھڑے ہوئے

سواران باغیہ۔ تم کون۔

پادری صاحب۔ پادری۔ سواران باغیہ مسلمان یا ہندو۔

پادری۔ عیسائی۔ یہ سنتے ہی ایک سوار نے پستول کا گھوڑا دبایا ادھر طپنچہ کی آواز ہوئی اور ادھر مرغ روح نے آسمان کو پرواز کی۔ پادری صاحب تو غلام گردش میں دراز ہوئے اور دست غارتگری فراز۔ سواران بنگلہ کو آگ لگا کر آگے روانہ ہوئے۔

لال ڈگی کے سرے پر پہنچے اور ہسپتال میں داخل ہو کر ڈاکٹر صاحب کی مزاج پرسی کی۔ چمن لال ڈاکٹر ذات کے کایستھ تھے تھوڑے عرصہ سے وہ اور ماسٹر

رام چندر دونوں عیسائی ہو گئے تھے۔ اُس وقت شفا خانہ میں سوار جا کر بکیرین کی طرح چھاتی پر سوار ہو گئے اور سوال کیا کیا دین رکھتے ہو ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ عیسیٰ مسیح کا۔ فرقہ باغیہ نے اُن کو بھی ایک ضرب طپنچہ میں پادری صاحب کے پاس پہنچا دیا۔ شفا خانہ توڑ پھوڑ کر سب برابر کیا۔ ان دونوں شخصوں کے مارے جانے کی خبر تمام شہر میں پھیل گئی اور تمام بدپیشہ بدمعاش چوٹے اٹھائی گیرے کرکی باڑی بازمال مردم خور جو ایسے مواقعات کے منتظر رہتے تھے گھروں سے نکل نکل کر آن موجود ہوئے اور ایک جم غفیر اور ازدحام کثیر فرقہ باغیہ میں شامل ہو گیا۔ اب ایک سوار ہے پچاس بدپیشہ اُس کی اردلی میں دوڑے جاتے ہیں سوار کسی پر دست درازی کرتے ہیں بدمعاش لوٹ کھسوٹ کرنے لگتے اور سامان توڑ پھوڑ کر برابر کر دیتے ہیں۔ جو شے آتی ہے اُسے لے بھاگتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچی کہ سواران باغیہ قلعہ کے لاہوری دروازہ تک جا پہنچے۔ کوئی ان کا سدِ راہ نہ ہوا۔ وہاں پہنچ کر فرقہ باغیہ نے دریافت کیا کہ انگریز لوگ کہاں ہیں کسی نے کہہ دیا کہ انگریز لوگ اور تمام تھانہ دار کوتوال بجیباں وغیرہ سب کلکتہ دروازہ پر جمع ہیں۔ یہ سنتے ہی سواران باغیہ میں سے پانچ سواروں نے کلکتہ دروازہ کی جانب گھوڑوں کی باگیں اٹھا دیں اور سرپٹ گھوڑے بگٹٹ وہاں سے روانہ ہوئے۔ باقی سوار تمام زیر دیوار قلعہ لب خندق لال ڈگی کی سڑک پر کھڑے رہے۔ یہ پانچ سوار جو آندھی بگولے کی طرح سے گڑبڑ گڑبڑ کرتے ہوئے بلا تحاشا قریب کلکتہ دروازہ پہنچے اور اُن کے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز محافظان دروازہ جو بالائے دیوار شہر پناہ روزنوں میں بندوقیں نکالے ہوئے سواروں کے انتظار میں کھڑے ہوئے پل کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اُن کے

کان میں نہ پہنچی۔ اور پشت پھیر کر جو سواروں کو آتے ہوئے دیکھا یکبارگی سب کے اوسان خطا ہو گئے اور کسی کے منہ سے یہ نکلا کہ اے وہ تو یہ آ گئے۔ پس کہنا غضب ہو گیا ڈنڈی پر اور ڈنڈی کے نیچے جتنے انگریز اور کوتوال اور تھانہ دار عجیب کھڑے ہوئے تھے سب کے پاؤں اُٹھ گئے۔ اُس وقت ایسا ہیز اور نامردی طبیعتوں پر مستولی ہوئی کسی کی جرأت اور ہمّت نہ پڑی کہ ان پانچ سواروں پر حملہ کرے۔ اور ان پانچ سواروں کا رعب ایسا غالب ہوا کہ ڈنڈے پر سے کُود کُود کر سب مکند مود دروازہ کی جانب فرار ہو گئے اُس وقت اگر یہ لوگ مُٹھی مُٹھی بھر خاک ڈال دیتے تو وہ دب کر رہ جاتے مگر استغفر اللہ کس کی جرأت تھی کہ اُن کے مقابل ہوتا۔ جیسے بکریوں میں شیر آن پڑا بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہ سوجھا۔ اب میدان صاف ہو گیا۔ رہ گئے بے چارے ریزیڈنٹ بہادر اور قلعدار صاحب ان کے سوا چڑیا تک کا نام و نشان نہ پایا۔

اُن پانچوں سواروں نے صاحب ریزیڈنٹ بہادر کی بگھی کو آ گھیرا مگر واہ ری جرأت و ہمّت صاحب ممدوح کی کہ اُس وقت بیکسی میں ذرا انتشار طبیعت اور اضمحلال خاطر کو دل میں نہ آنے دیا اور بہ استقلال تمام بگھی کی گھوڑے کی باگ قلعہ کے دروازہ کی جانب پھیر دی اور چابک مار کر گھوڑے کو تیز کر دیا اور سوار بھی ساتھ کے ساتھ ہی شمشیر برہنہ کئے ہوئے بارادہ قتل چلے آتے تھے کہ ایک سوار نے گھوڑا بڑھا کر چاہا کہ تلوار کا وار کرے صاحب ریزیڈنٹ نے جیبی طپنچہ نکال کر اُس پر سر کیا اور طپنچہ کی گولی سوار کے سینہ پر کارگر ہوئی اور اس کا کام تمام کیا۔ باقی چار سواروں نے کہا کہ اب تو تم نے ہمارا ایک سوار بھی گرا دیا۔ اب ہم تم کو ہرگز جیتا

نہ چھوڑیں گے۔ غرض کہ جوں توں کر کے دروازہ قلعہ تک پہنچے اور بگھی میں سے جلدی جلدی کود کر کھڑکی کی راہ سے دروازۂ قلعہ میں داخل ہوئے اور کھڑکی پر بھی قفل ڈلوا دیا اور کپتان کو حکم دیا کہ ہاں کیا دیکھتے ہو ان باغیوں پر فیر کیوں نہیں کرتے یہ کہہ کر دونوں صاحب قلعہ کے چھتے میں داخل ہوئے اور چھتے سے گزر کر زینے پر چڑھتے تھے قلعہ دار صاحب تو دروازہ پر جہاں اُن کی سکونت کا مکان تھا جا پہنچے اور بڑے صاحب چونکہ جسیم تھے ہنوز راہ میں ہیں۔

سواران باغیاں نے نگہبانانِ دروازہ سے آ کر کہا کہ تم لوگ دین کے ساتھی ہو کہ ان کے؟ نگہبانِ دروازہ؟ دین کے۔ سواران۔ تو دروازہ کیوں بند کر رکھا ہے؟ سپاہیان دروازہ نے فوراً چوپٹ دروازہ کھول دیا۔

سواران۔ صاحب کہاں گئے۔ نگہبان دروازہ۔ بالائے دروازہ۔

سواران باغیہ فی الفور گھوڑوں پر سے کود کود کر گھوڑوں کو تو سپاہیانِ دروازہ کے حوالہ کیا اور چھتہ میں روانہ ہوئے اور زینہ کی راہ میں بڑے صاحب بہادر کو جا لیا۔

ریذیڈنٹ کا قتل

افسوس صد افسوس کہ باغیانِ کور نمک نے کچھ حقِ نمک پر خیال نہ کیا اور اُس حاکمِ ذوی الاقتدار نصفت شعار کے ساتھ گستاخی سے پیش آئے اور بضرباتِ شمشیر اُن کا کام تمام کیا اور اوپر دروازہ کے بنگلہ پر جا کر قلعدار صاحب اور قلعدار کی بیوی اور اُن کے بچوں کو مارے تلواروں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ڈال دیا۔

دنیا الحق مقامِ عبرت ہے اس لئے اہل اللہ جن کو خداوندِ عالم الغیب نے

چشمِ بصیرت اور نگاہِ معنی نگر عطا فرمائی ہے۔ وہ ہرگز ہرگز اس عروسِ گندم نمائے جو فروش کے حسنِ ابلہ فریب پر مائل نہیں ہوتے ہیں اور اس کے نقش ونگارِ ظاہری وبہارِ عارضی کے دامِ فریب پر التفات نہیں فرماتے ہیں ؎

دو در دارد ایں باغ آراستہ | در و بند ازیں ہر دو برخاستہ
درا از درِ باغ و بنگر تمام | ز دیگر درِ باغ بیروں خرام

اس کی ثروت وتمکنت اور دولت وحشمت سلطنت کا کچھ اعتبار نہیں ہزاروں بادشاہانِ عالی مقدار وسلاطین ذوی الاقتدار چشم زدن میں پامال نکبت وادبار ہو گئے ہیں۔ نام ونشان تک باقی نہ رہا۔

خیال فرمانا چاہئے، کہ یا تو سلطنتِ برطانیہ کا یہ رعب سطوت وسیاست تھا کہ آج کسی دول خارجہ کی یہ مجال اور حوصلہ نہیں کہ سرکار سے آنکھ ملا کر دیکھ سکے یا پانسہ پلٹا تو ایسا پلٹا کہ چند جہال نمس کھدوں نے آناً فاناً میں زیر وزبر کر دیا۔ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔

تجہیز وتکفین کا انتظام ؎

جہاں میں جتنے تھے اوباش بد نافرجام | دغا شعار جفا جو رذیل ومعاش تمام
ہوئے شریک سپاہِ شریر و بدانجام | کیا تمام شریفوں کے نام کو بدنام
دو چند آتش فتنہ کو سربلند کیا | کیا وہ کام کہ عالم کو دردمند کیا
شریر ومغوی وناابل سر اٹھانے لگے | کہ گمرہوں کو رہ گمرہی دکھانے لگے
چھپے ہوؤں کا سراغ ونشاں بتانے لگے | پکڑ پکڑ کے ستمگار خوں بہانے لگے

اُٹھائی گیرے اُچکّے گھروں سے دھر بھاگے

جو گِٹھ کٹے تھے وہ گٹھڑی لپک کے دھر بھاگے

ہمارے ہاں کمرے کے گھنٹے میں سات بج کر پچپیں منٹ پر سوئی آکر قائم ہوئی ہے۔ راقم روزے کی نیت باندھ کر جو چھپر کھٹ پر دراز ہوا تو جوانی کی نیند ہے۔ بائیس کا سن نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ چار مہینے شادی کو گزرے ہیں بلند مکانات سے جب آفتاب بلند ہو چکا ہے اور کمرے کی منڈیر سے دھوپ اُتر کر نصف دروں تک آپہنچی ہے اور چھپر کھٹ کے پردوں میں چھن چھن کر تمازتِ آفتاب بدن پر اثر کرنے لگی ہے۔ جب خواب سے بیدار ہوا ہے مکان کی سقف فراخ ہے تو کمرے کے آگے کا صحن وسیع ہے کمرہ شرق رویہ ہے۔ جنوب کی جانب دیوار بلند ہے شرق کی جانب قدِ آدم ہے۔ زینہ شرق کی جانب ہے۔ زینہ میں سے دو رستے ہیں ایک دیوان خانہ کے چھت کی جانب دوسرا کمرہ کے صحن میں کمرہ کے آگے چھپر کھٹ ہے اور چھپر کھٹ کے آگے چوکیوں کا فرش اُس پر دری چاندنی وغیرہ کا فرش ہے۔ گاؤ تکیہ جھرمٹ کی پٹی سے لگا ہوا ہے۔ حوائج ضروریہ سے فارغ ہو کر مونڈھے پر بیٹھا ہوں دوسرے مونڈھے پر سیلاپچی دھری ہوئی ہے۔ خادمہ کے ہاتھ میں آفتابہ ہے مُنہ دھو کر رومال سے ہاتھ مُنہ پاک کر چکا ہوں۔ سامنے کرسی دار مونڈھے پر آئینہ دھرا ہے کنگھی سے بالوں کو سُلجھا کر مروڑی دے رہا ہوں کہ یکایک کیا دیکھتا ہوں ایک خادمہ گھبرائی ہوئی سانس چڑھا ہوا ہوش حواس پراگندہ پسینے پسینے مُنہ فق۔ رنگ زرد ملیے اوسان زینہ پر سے چڑھی چلی آتی ہے آتے ہی دھم سے چوکیوں پر گر گئی

ہیں ہیں مبارک خیر باشد آج ایسی گھبرائی ہوئی کہاں سے آئی ۔گھر میں تو خیر ہے
مبارک سلام کر کے ہاتھ کے اشارہ سے ذرا سانس قائم ہو لے تو کہتی ہوں قریب
چار منٹ کے سر پکڑے بیٹھی رہی جب ہوش درست ہوئے تو کہا میاں مجھے نواب
صاحب اور تمہاری خوشدامن نے بھیجا ہے اور تمہاری خیر خیریت دریافت کی
ہے کہ تم گھر میں ہو یا قلعہ میں ۔راقم میں تو اچھا بھلا چنگا ہوں خدا کا فضل ہے ۔قلعہ
تو بہ سبب رمضان المبارک دوسرے تیسرے روز جاتا ہوں آج تو نہیں گیا ۔
اور میری بیوی بھی تندرست ہیں ۔یہ دیکھ لے چھپر کھٹ میں سوتی ہیں ۔

مبارک :۔ اور یہ تختوں پر چدر اوڑھے کون سوتا ہے ۔

راقم :۔ فہیم النسا مانی سوتی ہیں ۔

مبارک :۔ بی مانی ابھی تک اُٹھی نہیں ۔شہر کی تجھے کچھ خبر ہے ۔شہر میں تو
غدر ہو رہا ہے ۔تم پڑی سوتی ہو ۔

مانی :۔ اے چل کمبخت دُور پار غدر کیوں ہونے لگا تو ایسی ہی فال
زبان سے نکالا کرتی ہے ۔صبح ہی صبح کہاں سے آئی ہیں رات بھر کی جاگی ہوئی
ہوں ۔مجھے سونے دے ۔

راقم :۔ مبارک غدر کیسا میاں دکانیں شہر کی بند ہیں بازار میں سوار
پھر رہے ہیں ۔شہر میں خاک اُڑ رہی ہے ۔جب تو نواب صاحب نے تمہاری
خیریت منگائی ہے ۔

راقم :۔ مبارک کیا کہتی ہے ۔سوار کیسے کس کے سوار ۔ ؟

مبارک :۔ میاں میں تو عورت ذات مجھے کیا معلوم کس کے سوار ہیں

اگر میں مرد ہوتی تو اُن سے پوچھتی کہ تم کون ہو۔ کہاں سے آئے ہو۔

راقم:۔ مبارک سواروں کو تم نے آنکھ سے بھی دیکھا یا سُنی سنائی کہتی ہے۔

مبارک:۔ ہاں میاں میں آنکھ سے دیکھ کر آئی ہوں۔ جامع مسجد کے نیچے پانچ سات سوار پھر رہے تھے۔ بلکہ میرے پیچھے پیچھے شاہ بولا کی بڑک تک آئے۔ میں روشن پورہ میں چلی آئی اور وہ قاضی کے حوض کی طرف چلے گئے۔

راقم: کس وضع کے سوار تھے کیسے کپڑے تھے کیسے گھوڑے تھے۔

مبارک:۔ کپڑے تو اُن کے سفید ہی تھے۔ مگر گھوڑوں کا سامان انگریزی تھا۔

یہ واقعہ سُن کر مجھ پر ایک حیرت کا عالم ہوا اور چند منٹ تک سکوت میں گردن جھکائے ہوئے خاموش بیٹھا رہا اور خیالات فاسدہ میرے دماغ میں گردش کرتے رہے یکایک خیال نے پلٹا کھایا اور طبیعت میں یہ بات آئی۔ آہا وہ جو دو بزرگوار اولیاء اللہ نے تجھ سے چند کلمے بطور پیشینگوئی بیان کئے تھے۔ یہ اُس کا ظہور ہے۔

اس واقعہ سے پانچ چار ماہ بیشتر ایک روز میں بازار پایہ والوں میں ایک کتب فروش کی دُکان پر بیٹھا ہوا کتابوں کی سیر کر رہا تھا کہ یکایک ایک بزرگو ارجیم شحیم دراز قامت، فربہ اندام، دراز ریش سیہ فام، کترٔ بڑی داڑھی ساٹھ برس کا سن و سال ڈھیلا انگرکھا، شرعی پائجامہ گول ٹوپی ہاتھ میں عصا گلے میں تسبیح ڈالے ہوئے اِرد ہوئے اور دُکان پر آکر بولے۔ بھائی سلام علیک۔ مولوی عیسٰے کتب فروش نے اور میں نے تعظیم دی۔

مولوی عیسٰے:۔ آئیے حافظ صاحب۔ حافظ صاحب راقم کی برابر آکر بیٹھ گئے۔

حافظ صاحب (راقم سے مخاطب ہوکر) بھائی ان کتابوں میں کوئی کلام مجید

بھی ہے

راقم:- حضرت ہاں ہے۔ میں نے ایک لکھنؤ کے چھاپہ کا کلام اللہ اتار کر حافظ صاحب کے حوالے کیا۔ حافظ صاحب تلاوت میں مشغول ہوئے۔ ایک رکوع جب ختم ہو گیا تو حافظ صاحب پر حالتِ جذب طاری ہوئی اور آنکھیں سُرخ ہو گئیں اور چہرہ تمتما گیا گردن کی رگیں پھُول گئیں اور حالتِ غیظ و غضب میں بازار کی جانب ہاتھ اُٹھا کر فرمانے لگے۔ ایلو! ایلو وہ مار ڈالا وہ مار ڈالا وہ پھانسی دے دیا وہ پھانسی دے دیا واہ واہ کیا خوب تماشا ہے۔ ایک کو ایک مارے ڈالتا ہے۔ ایک کو ایک پھانسی دے رہا ہے۔ اور کوئی کچھ نہیں کہتا اور بارٹن صاحب بیٹھے ہوئے تماشا دیکھ رہے ہیں۔ یہ الفاظ فرما کر حافظ صاحب خود ہی فرمانے لگے۔ بس خاموش رہو۔ تم کو کس نے اذن دیا ہے کہ تم اسرارِ الٰہی کا پردہ فاش کرو۔ یہ کہہ کر حافظ صاحب نے گردن نیچے جھکالی اور پھر تلاوت میں مشغول ہو گئے۔ ایک رکوع پڑھ کر پھر وہی حالت طاری ہو گئی اور دوبارہ پھر اُنہیں الفاظ میں وہی کلماتِ سابق ادا فرمائے۔ غرضکہ مرّہ بعد اولیٰ وکرّۃً بعد اخریٰ تین بار یہ ظہور میں آیا اور بعد حافظ صاحب نے کلام شریف کو بوسہ دیا اور آنکھوں سے لگایا اور سر پر رکھا اور میرے حوالے کیا۔ میں نے الماری میں رکھ دیا۔ پھر حافظ صاحب راقم سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے تم شہر میں بیٹھے ہوئے کیا کرتے ہو باہر جواڑے کی سیر کیا کرو۔ دنیادار کو گھر میں بیٹھا رہنا نہ چاہیئے۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ مارے رعب کے کچھ نہ کہہ سکا۔ پھر فرمانے لگے تمہارے والد خطِ نسخ کے بہت بڑے خوشنویس ہیں۔ تم اپنے والد سے مجھے ایک کلام اللہ ایسا لکھوا دو کہ ایک ورق میں سیپارہ تمام ہو جائے اور تیس ورقی میں تیس سیپارے ختم ہو جائیں۔

راقم :- بہت بہتر میں عرض کر دوں گا۔

حافظ صاحب : بھائی میرے واسطے پراٹھے اور میتھی کا ساگ پکوا کر لانا۔

راقم :- بہت بہتر آپ کہاں ملیں گے۔

حافظ صاحب :- یہ برابر میں جو نانبائی کی دُکان ہے۔ یہ کہہ کر اور سلام علیک کہہ کر تشریف لے گئے۔ ہنوز یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ امیر خاں خدمت گار نے دروازہ پر ایک خادمہ کا نام لے کر آواز دی کہ میاں سوتے ہیں یا جاگتے ہیں۔ اگر سوتے ہوں تو جگا دو۔ ڈیوڑھی سے چوبدار حکم لے کر آیا ہے یہ آواز میرے گوش گزار ہوتی ہیں جس طرح بیٹھا ہوا تھا نیچے اُتر کر آیا۔ اور باہر دیوان خانہ میں پہنچا۔ چوبدار نے حکم سنایا کہ حضور کا حکم ہے ، زبانی محبوب علی خاں کے کہ جتنے ملازم سرکار ہیں سب آ کر ڈیوڑھی پر حاضر ہوں ۔ آپ جلدی سوار ہو کر جائیے مجھے اور کئی جگہ حکم پہنچانا ہے میں سُن کر آداب بجالایا اور چوبدار سے کہا کہ ابھی کپڑے پہن کر کمر باندھ کر روانہ ہوتا ہوں۔ گوردھن سے کہا گھوڑے پر چار جامہ رکھ۔ امیر خاں سے کہا تیار ہو جاؤ یہ کہہ کر گھر میں آیا۔ والد ماجد اللّٰھم اغفر وارحم باہر کے دالان میں تختوں کے فرش پر سوزنی بچھی ہوئی تھی۔ تکیہ لگا ہوا بعادت معہودہ بیٹھے ہوئے کلام مجید لکھ رہے تھے۔ اُن کی خدمت میں جا کر آداب بجالا کر دو زانو ہو بیٹھا۔ میری جانب مخاطب ہو کر پوچھنے لگے خیر باد میں نے تمام حال گزارش کیا۔ یہ کہہ کر جنبہ و کلام مجید کو ہاتھ سے رکھ دیا اور چند منٹ تک گردن جھکا کر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر گردن اُٹھا کر فرمانے لگے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ کہاروں سے کہو پالکی لگا لیں میں جاتا ہوں

راقم :- دست بستہ ہو کہ جناب آپ تشریف رکھیں۔ غلام نوکری میں جاتا

ہے اور چوبدار نے آپ کا نام نہیں لیا مجھے ہی حکم سنایا ہے۔ آپ کی نوکری تو حضور
سے معاف ہے۔ آپ گھر سے خبردار رہیئے۔ آدمیوں کو ڈیوڑھی پر چھوڑے جاتا ہوں
فقط امیر خاں اور گوردھن چاکر کو ہمراہ لے جاتا ہوں اور باقی پانچوں خدمتگار یہاں
موجود ہیں۔ یہ عرض کر کے میں اوپر کوٹھے پر آیا اور کپڑے بدلے پگڑی باندھی اور
جب چلنے لگا تو میرے گھر کے آدمی میری طرف دیکھ کر آبدیدہ ہونے لگے۔ میں
کلمات تسلی آمیز کہہ کر نیچے آیا ارادہ ہوا کہ کچھ ہتھیار ہاتھ میں لے چلنا ضرور ہے۔
تلواریں چھری وغیرہ جو سالہا سال سے بے غور پڑے ہوئے تھے اُن کو دیکھنے لگا
کہ اگر کوئی کام کی ہو تو لیتا چلوں۔ اس میں والد بزرگوار نے منع فرمایا خبردار ایسی حرکت
نہ کیجو۔ انگریزی عملداری ہے خدا جانے کیا معاملہ ہے سیدھا ڈیوڑھی پر چلا جا جب
کچھ حکم ہو اور حضور اجازت دیں تو جب ہتھیار کو ہاتھ لگائیو۔ غرضکہ میں سوار ہو کر آیا
جس وقت چھوٹے دریبہ کے پھاٹک سے باہر نکلا ہوں تو دیکھا کہ تین چار سوار
کُرتے پہنے اور دھوتیاں باندھے ہوئے سر سے ایک چھوٹا سا انگوچھہ لپٹا ہوا
فقط ایک کرچ ڈاب میں اور وہ پیپل کے درخت کے سایہ میں نہر کی دیوار سے لگے
کھڑے ہیں اور ہندو لوگ اُن کی سربراہی کر رہے ہیں۔ کوئی پوریاں لے آیا ہے کوئی مٹھائی
کا دونہ لئے آتا ہے کوئی لوٹا پیتل کا پانی سے بھر کر لا دیتا ہے میں نے کچھ اُن کی طرف
توجہ نہ کی اور قلعہ کی جانب روانہ ہوا وہاں سے چند قدم گھوڑا آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ گامی
بدمعاش پہلوان نہر والا آگے آگے کرتہ پہنے ہوئے لنگر لنگوٹہ بندھا سر پر ٹوپی کاندھے
پر لٹھا اور پیچھے اس کے پچاس سو شہدوں کا انبوہ سب کے لنگر لنگوٹے کسے ہاتھ
میں بانڈیاں لئے چلے آتے ہیں۔ اشرف بیگ کے کمرے کے نیچے آ کر اُس نے

ایک لٹھ سڑک کی لالٹین پر مارا اور لالٹین چھن دیسی ہو کر گر پڑی اور منہ سے کہا کہ یہ ایک کافر اور مارا اور پھر ایک بزاز کی دکان کا قفل توڑنے لگا میں گھوڑا بڑھا کر آگے چلا گیا پھر آگے اور دو چار سوار پھرتے چلتے دیکھے۔ نہ میں نے ان سے کچھ کہا۔ نہ انھوں نے میری مزاحمت کی میں سیدھا کوتوالی ہوتا ہوا خونی دروازہ کے آگے پہنچا تو دیکھا کہ انبوہ کثیر بدمعاشان کا ہے اور صرافوں کی دو کانیں لُٹ رہی ہیں۔ امیر خاں میرا خدمتگار ساتھ آتے آتے ٹھٹک رہا جب قلعہ کے دروازہ پر پہنچا ہوں تو یہ تماشا دیکھا کہ قلعہ کی کھائی کی برابر کوئی پچاس سوار جمع ہیں اور انگریزی کتابوں کے اوراق پھٹے ہوئے اُڑتے پھرتے ہیں۔ ہوا بہت تیز چل رہی ہے۔ کاغذ اُڑ اُڑ کر قلعہ کے دروازہ کی طرف آتے ہیں اور قلعہ کے دروازہ کے فاصلہ سے چار کروڑی کھائی کے کٹہرے سے لگا ہوا ایک مست ننگ دھڑنگ بیٹھا ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک پُرانا مونڈا انگریزی جوتا ہے اور کاغذ اُڑ اُڑ کر اُس کے پاس آتے ہیں اور وہ مجذوب غصہ میں اُن کاغذوں پر جوتے مارتا جاتا ہے اور بُرا بھلا کہہ رہا ہے۔ خیر یہاں سے گھوڑے کو بڑھا کر میں نقار خانہ کی ڈیوڑھی پر پہنچا اور گھوڑے سے اُتر کر ڈیوڑھی سے گزر کر دیوان خانہ خاص کے صحن میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ دیوانِ خاص کے در میں ایک ستون کے سہارے سے لگے ہوئے مجبوب علیخاں بیٹھے ہیں اور سامنے ان کے دوسرے در سے لگے ہوئے حکیم احسن اللہ خاں[1] بیٹھے ہیں اور سب درباری دو رویہ دو صفیں

[1] حزام الدولہ عمدۃ الحکماء معتمد الملک۔ حاذق الزمان حکیم محمد احسن اللہ خاں ثابت جنگ بہادر وزیر اعظم تھے۔ غدر کے بعد بہادر شاہ ظفر پر جو مقدمہ چلایا گیا۔ اس میں ان کی بھی شہادت ہوئی تھی۔

باندھے بیٹھے ہیں۔ میں نے جا کر سلام علیک کی اور ایک سمت میں بیٹھ گیا۔ ان دونو صاحبوں کے بیچ میں ایک مسلمان پنجابی بزاز جس کی دکان قلعہ کے سرے پر تھی اور سب شاہزادے اور بیگمات کے یہاں وہی کپڑا دیا کرتا تھا بیٹھا ہے اور اس کے آگے نین سکھ لٹھے کے تھان اور طاقے سیاہ بانات کے دھرے ہیں اور سکھا خیاط خانسامانی والا بیٹھا ہے۔ حکیم احسن اللہ خاں بتاتے جاتے ہیں اور وہ کفن بیونتا جاتا ہے۔ میری عقل حیران ہوئی کہ یہ کیا معاملہ ہے اور کس کا کفن تیار ہو رہا ہے ایسا کون شخص مارا گیا جس کے تجہیز و تکفین کی اتنی تیاری ہو رہی ہے۔ میری برابر میر فتح علی اور ایک جانب مرزا احمد بیگ داروغہ آبدار خانہ بیٹھے ہوئے تھے اُن سے چپکے چپکے دریافت کرنے لگا وہ کچھ تھوڑا سا حال بیان کرنے پائے تھے کہ حکیم احسن اللہ خاں کے کان میں کچھ بھنک پہنچی۔ انہوں نے بآواز بلند کہا کہ کیوں نہیں کہتے کہ صاحب رزیڈنٹ بہادر مارے گئے ہیں اور بادشاہ کا حکم ہے کہ میرے سب ملازم جائیں اور صاحب کی تجہیز و تکفین کریں۔ اور قلعہ دار صاحب کی لاش بھی ان کو دفن کریں اور حضور کو اُن کے مارے جانے کا نہایت قلق ہے۔ سات آدمی مارے گئے ہیں۔ دروازۂ قلعہ پر لاشیں پڑی ہیں یہ کلمات سُن کر میرے ہوش و حواس باختہ ہو گئے۔ پانچ چھ منٹ تک تو مجھے کاٹو تو خون نہ تھا اور دماغ میں ایک سناٹا چکر کھایا کیا۔ آخر کچھ ہوش درست ہوئے تو ساری کیفیت از ابتدا تا انتہا حقّار دربار کی زبانی گوش گذار ہوئی۔

ہنوز کفن تیار ہونے نہ پایا تھا انتظار تھا کہ کفن تیار ہو جائے تو چل کر اُن کی تجہیز و تکفین کریں کہ یکا یک کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت عزرائیل روح قبض کرنے کو

سامنے سے نمودار ہوئے اور وہی سواران محسن کش لال پردے کے دروازہ سے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ حکیم احسن اللہ خاں نے اُن کی شکل دیکھ کر کہا کہ سب صاحب فاتحہ خیر پڑھیں قضا آن پہنچی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ سب لوگ فاتحہ خیر پڑھنے لگے۔ اس اثنا میں وہ دیوان خاص کے دالان کے نیچے آن پہنچے اور گھوڑوں سے اوتر اوتر کر گھوڑے توجالی کے کٹہرے سے اٹکائے اور آپ اندر آئے۔ آتے ہی بیٹھ گئے تو اُس وقت قریب ۳۰ آدمیوں کے ہوں گے اور اکثر اُن میں افسر تھے وضع اُن کی وہی پوربیوں کی تھی نہ افسر معلوم ہوتا تھا نہ سوار سب کی ایک وضع تھی۔ گلے میں سیٹھے کے کرتے پاؤں میں ڈھیلے لٹھے کے غرارے دار پانجامے سر پہ چھوٹا سا انگوچھہ لپٹا ہوا چندیا کھلی ہوئی کسی کے پاس قرابین کسی کے پاس بندوق کسی کے پاس تمنچہ اور کرچیں سب کے پاس موجود ہیں۔ وہ کپڑے کے تھان پھیلے ہوئے دیکھ کر حکیم احسن اللہ خاں سے مخاطب ہو کر پوچھنے لگے یہ کیا سامان ہے۔

حکیم۔ احسن اللہ خاں آپ صاحبوں نے جو اعمال کیئے ہیں اُس کی تلافی ہم بھگت رہے ہیں آپ نے آگ لگائی ہے ہم بجھا رہے ہیں۔

سواران باغیہ۔ ارے ..... تم لوگ سب بے ایمان کرشٹان ہو۔ ارے تم سب عیسائی بے دین کرسٹین ہو۔ تم نے انگریزوں کا جوٹھا کھایا ہے یہ کہہ کر وہ جو تھان کفن کے پڑے ہوتے تھے وہ سب لوٹ لیئے اور پھاڑ پھاڑ کر سروں سے باندھ لیئے اور ایک سوار نے بڑھ کر محبوب علیخاں خواجہ سرا کی توند پہ تمنچہ رکھ دیا۔ محبوب علی خاں بیچارہ استسقے کی بیماری میں مبتلا سوجا ہوا پڑا تھا۔

مگر جی کا مردانہ تھا۔ گو خواجہ سرا تھا تو کیا ہوا۔

سوار:۔ ہم کو رسد دلواؤ۔

محبوب علیخاں:۔ ہمارے پاس رسد کہاں سے آئی۔ ہمارے ہاں کوئی فوج ہے لشکر ہے جس کے واسطے رسد جمع رہے ہمارے پاس رسد وسد کچھ نہیں ہم کو جان سے مار ڈالنا ہے تو مار ڈالو میں تو مرنے کو بیٹھا ہوں۔ بہت اچھا ہے جو کسی کے سر ہو کر مروں۔

شریف علیخاں داروغہ:۔ محبوب علی خاں نے سوار کا ہاتھ پکڑ کر کہا اُن سے کیا کہتے ہو۔ تم ہم سے کہو ہم دیں گے۔

حکیم احسن اللہ خاں:۔ ہمارے حضور خود اپنی زبان سے کہہ چکے ہیں کہ ہمارے پاس روپیہ نہیں۔ مال نہیں۔ ملک نہیں۔ خزانہ نہیں ہم تو فقیروں کی طرح سے تکیہ بنائے بیٹھے ہیں۔ ہم رسد کہاں سے لائیں۔ ہاں بادشاہ کے گھوڑوں کے اصطبل کے واسطے مہینہ بھر کی خوراک کے چنے آتے ہیں تو وہ موجود ہیں۔ اُس کے سوا ایک دانہ ہمارے پاس موجود نہیں۔ بادشاہ کے گھوڑے بھوکے مریں گے۔ مگر تم اپنا پیٹ بھرلو مگر وہ کب تک وفا کریں گے۔ تم لوگوں کے ایک دن کی خوراک کو مکتفی نہ ہوں گے۔ جاؤ شریف خاں دانہ کا کوٹھا کھول کر چنے تلوا دو۔ تین تین سیر کے حساب سے فی کس تقسیم کرادو۔

غرضکہ جوں توں کر کے ایک بلا کو ٹالا انہوں نے جا کے مہتاب باغ میں گھوڑے باندھے دو سو سے اوپر آدمی موجود ہوتے۔ اب کے بار کوئی پچاس ساٹھ سوار کا اژدحام ہوگا۔ وہ بھی رسد طلب کرتے ہوئے آتے اُن کو بھی یہی کہہ کر ٹالا۔ اور پچاس ساٹھ

سوار کا اژدحام ہوگا۔ وہ بھی رسد طلب کرتے ہوئے آئے۔ اُن کو بھی یہی کہہ کر ٹالا
اور پچاس جان کھانے کو موجود ہوئے۔ غرضکہ اڑھائی سو تین سو کے قریب سوار مہتاب
باغ میں جمع ہو گئے۔ اب جو آتا ہے وہ مہتاب باغ میں اُتر جاتا ہے۔ اس اثنا میں
قریب گیارہ بجے کے دن چڑھ گیا ہے۔ کسی قدر پیدل بھی آتے جاتے ہیں تین چار
سو پیدل بھی داخلِ شہر ہو گئے ہیں اور شہر میں غدر مچ رہا ہے۔ شہر کو بدمعاشانِ شہر
لوٹ رہے ہیں کو بہت سے سوار گھوڑے باندھ کر دیوانِ خاص میں محبوب علیخاں
اور احسن اللہ خاں کے پاس آئے اور کہا کہ رسد اور ہمارے کھانے پینے کا بندوبست
کرو۔

ملازمانِ شاہی۔ ہم کیا بندوبست کریں جن لوگوں سے شہر کا بندوبست
تھا۔ اُن کو تم نے مار ڈالا۔ شہر میں غدر مچا دیا۔ شہر لُٹ رہا ہے۔ دوکانیں بند ہیں اب
کھانے پینے کا کیا بندوبست ہو۔ جہاں سے ممکن ہے کھاؤ پیو اور تمہارے سبب
سے ہمارا کھانا پینا بھی بند ہوا۔

سوارانِ باغیہ۔ بادشاہ سلامت سے عرض کرو بازار کھلوائیں۔ جو چیز دست
یاب آئے، کھانے پینے کا سر انجام ہو۔

ملازمانِ شاہی۔ دوکانیں تو تم نے پہلے ہی لوٹ لیں اب اُن میں کیا دھرا ہے
جو کھلواتے ہو اور دوکاندار کس موقعہ پر دوکانیں کھولیں۔ شہر میں لوٹ مار موقوف ہوا
اور امن چین ہو تو دوکانیں کھلیں۔

سوارانِ باغیہ۔ ہم لوٹ مار کا بندوبست کرتے ہیں۔ اب ہم کسی کو دست درازی بھی
نہیں ہونے دیں گے جا بجا پہرے سپاہیوں کے بٹھائیں گے۔ بادشاہ سلامت کی

منادی پھروادیں، اور دوکانیں کھلوادیں۔

ملازمانِ شاہی۔ اچھا تم عہد کرو کہ اب ہم کسی قوم کے آدمی کو جان سے نہیں ماریں گے نہ بازار لوٹیں گے۔ ہم امن کی منادی پھرواتے ہیں۔ تم اپنے سپاہی جابجا بٹھا دو۔

قیام امن کی تدبیر

سواران نے اقرار کیا اور کہا کہ اپنے آدمی ہمارے ساتھ کردو۔ ہم جابجا ناکہ بندی کردیتے ہیں اور دوکانوں کی حفاظت کے واسطے پہرہ بٹھا دیتے ہیں کہ لوٹ کھسوٹ نہ ہونے پائے۔ اور جو دست درازی کرے وہ گرفتار کیا جائے۔ چنانچہ تین چار آدمی معززین اور چند سرکاری آدمی اُن سواروں کے ہمراہ کئے گئے اور کوتوال شہر کے آگے ڈھنڈورچی کو بلوا کر حکم سنایا گیا کہ شہر میں منادی پھیر دے خلق خدا کی ملک بادشاہ کا حکم بادشاہ کا کوئی کسی پر ظلم و زیادتی نہ کرنے پائے۔ اب جو شخص کسی کے جان و مال پر دست اندازی کریگا تو گنہگار سرکار ہوگا اور سرکاروں نے گھروں سے بلا بلا کر حلوائیوں کی دوکانیں کھلوا دیں اور بقالوں کی دوکانیں بھی کھل گئیں اور اُن پر مُہریوں کے پہرے بیٹھ گئے اور کچھ دوکانیں بھی کھل گئیں۔ حلوائیوں نے بڑے بڑے کڑاہ گھی کے چڑھا دیئے پوریاں تلی جانے لگیں۔ بقالوں نے دوکانیں کھول دیں۔ روزہ دار کھانے پینے کا سامان لے جانے لگے۔ اُس وقت احسن اللہ خاں نے راقم کو اور صوفی مظہر اللہ بیگ رسالدار بادشاہی کو حکم دیا کہ تم جاکر دیکھو شہر کی کیا کیفیت ہے۔ اب تو لوٹ مار نہیں ہوتی بموجب حکم ہم دونوں آدمی سوار ہو کر بازار میں آئے اور فتحپوری کی مسجد تک پہنچے تو امن امان پایا۔ کہیں لوٹ مار نہ تھی خالی دکانیں کھلی تھیں۔ دوکانوں پر پہرے لگے ہوئے تھے

خرید و فروخت ہو رہی تھی ۔ سپاہی قیمت دیتے تھے اور جنس تلوا لیتے تھے ہم واپس آ رہے تھے کہ دیکھا کوتوالی کے سامنے کچھ ہجوم ہو رہا ہے ۔ جال کے پیڑ کے سایہ میں بہت سے پوربی جمع ہیں اور بدمعاشان شہری بھی موجود ہیں ۔ ان بدمعاشان نے یکبارگی ان پوربیوں سے کہا کہ یہ کوتوال شہر بڑا انگریزوں کا خیر خواہ ہے ۔ یہ سُننا تھا کہ پوربیوں نے ایک باڑھ بندوقوں کی سامنے سے کوتوالی کے برآمدے پر سر کی جس سے کوتوالی کا دروازہ گرا اور کچھ لوگ کوتوالی کے اندر سے عقب کی دیواریں کود کر فرار ہو گئے ۔

اس اثناء میں ہم نے دیکھا کہ ایک ہجوم اور کوڑیا پل کی طرف سے آ رہا ہے ہم ٹھیر رہے جب قریب آئے تو دیکھا کہ دو عورتیں جوان خوبصورت میموں کو گرفتار کیے ہوئے لاتے ہیں ۔ راقم نے ان کو دیکھ کر اُن سب سواروں سے جو بندوبست کا اقرار کر کے آئے تھے اور کوتوالی کے سامنے نیم کے درخت کے نیچے کھڑے تھے گھوڑا بڑھا کر کہا ابھی تو تم لوگ دست درازی کا انکار کر کے آتے ہو اور ابھی پھر دست درازی ہونے لگی یہ کیسے عہد و پیمان ہیں تو اُن سواروں نے ان دونوں عورتوں کو پوربیوں سے لے کر ہمارے حوالہ کر دیا ۔ بعد اُن کے کہا گیا کہ یہاں تو تم ہمارے حوالہ کرتے ہو آگے پھر سپاہی لوگ ہم سے چھین کر مار ڈالیں گے تو دو سوار بندوبست کے لئے ہمراہ ہو گئے جب ہم قلعہ کے دروازہ کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ پوربیوں کی ایک جماعت کثیر اور اُن کے ہمراہ اور ہندو مسلمان قریب پانچ ہزار آدمی کے چلے آتے ہیں ۔

راقم :۔ یہ انبوہ کثیر کیسا ہے ۔

سواران :۔ یہ ہمارے ممد و معاون ہیں جو میرٹھ میں ہمارے شریک حال تھے

غرضکہ ہم ڈیوڑھی پر بخیر و عافیت پہنچے اُس وقت نہ محبوب علی خاں تھے نہ احسن اللہ خاں

میں نے خواجہ سرا کے ہمراہ اُن دونوں عورتوں کو اندر محل میں بھجوا دیا۔ خواجہ سرا نے کہا۔ کہ حضور انور اس کارگذاری سے بہت خوش ہوئے۔ جہاں تک ممکن ہو رفاہِ عام پر نظر رہے کسی آدمی کی جان ضائع نہ ہونے پاتے۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ ان میں وہ بدمعاش ہیں جو جیل خانہ سے رہا ہوئے ہیں۔

واقعہ:- مجھے اُس وقت تشنگی کا نہایت غلبہ تھا۔ پیاس کے مارے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے کیونکہ میں روزہ دار تھا اُس پر یہ تکالیف شاقہ میں وہیں تسبیح خانہ کے سائبان کے نیچے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ ایک اور ہنگامہ برپا ہوا۔ کیا دیکھا کہ تسبیح خانہ کی سیڑھیوں پر ایک جوان ولایتی چڑھتا آتا ہے اور پوربی اُس کو لئے ہوتے ہیں۔ اور ولایتی کے سیدھے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پیتل کی لُٹیا اور موٹھ تلوار کی ہے مگر تلوار ٹوٹ کر آدھی رہ گئی ہے۔ اور وہ نصف تلوار قبضہ تک خون میں سُرخ ہو رہی ہے اور بائیں ہاتھ میں ایک نوجوان حسین مہ جبین نازنین مس کا ہاتھ ہے۔ اس لڑکی شکیلہ جمیلہ کی عمر سترہ اٹھارہ برس کی معلوم ہوتی ہے۔ دراز قد۔ کتابی چہرہ باریک کمر سفید براق سایہ اُس کے گلے میں ہے مگر اُس پر کچھ کچھ خون کی بوندوں کے نشان معلوم ہوتے تھے۔ اور لڑکی کا شفق رنگ سفید چہرہ پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں اور سانس ٹھکانے نہیں۔ پسینے پسینے ہو رہی ہے۔

راقم یہ کیفیت دیکھتے ہی فوراً بیتابانہ اُس کے پاس پہنچا اور دل میں خیال آیا کہ اُس کے ہاتھ میں شمشیر برہنہ خون آلودہ ہے اور سر پر خون سوار ہے مبادا مجھ پر ہی وار کر بیٹھے یا اس نازنین پر ہاتھ چھوڑے گا تو اُس کا کام تمام ہو جائے گا۔ پہلے اُس کے ہاتھ سے تلوار چھین لی جائے۔ پھر اُس لڑکی کا ہاتھ چھڑا لینا۔ یہ سوچ کر میں نے

پہلے جاتے ہی دائیں ہاتھ سے اُس کی کلائی خوب طاقت سے پکڑی اور بایاں ہاتھ تلوار کی کنوری پر ڈالا اور زبانی یہ الفاظ کہے کہ ہیں یہ ادب تو نہیں جانتا یہ بادشاہ کی ڈیوڑھی ہے یہاں ہتیار باندھنے کی ممانعت ہے۔ اس میں اور آدمی بھی اُٹھ کر جھپٹ گئے اور اُس نازنین لڑکی ستم رسیدہ نے جو اس طرح کا ترحم اور حامی و مددگار اپنا پایا تو وہ میری اوٹ میں ہو گئی اور میری کمر میں اپنا ہاتھ ڈال دیا جب اُس کا جسم میرے جسم سے مس ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ مارے خوف کے مانند بید کے لرزاں و ترساں ہے۔ کلیجہ اُس کا دھڑک رہا تھا۔ غرضکہ میں نے تلوار تو اُس کے ہاتھ سے چھین لی اور پوچھا کہ تیرا کیا مطلب ہے منہ سے بیان کر۔

جوان ولایتی۔ بھائی خدا کی قسم ہے ہم نے کچھ نہیں لوٹا۔ دنیا لاکھوں روپیہ کا مال لوٹ کر لے گئی۔ ہم نے کسی کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ہم نے فقط یہ مال لوٹا ہے ہم کو یہ مال مل جاوے اور ہم کو کچھ نہیں درکار۔

راقم:۔ وہ شمشیر شکستہ اُس کے حوالہ کی اور کہا ابھی تم کو یہ مال نہیں ملسکتا ہے اگر اس عورت کو کہا جاتے تو تمہاری جان بھی جائیگی اور یہ غریب بیکس بھی جائے گی۔ تمہاری کوششیں و جانفشانی ضائع جائے گی۔ یہ سپاہی لوگ ابھی تم کو اور اس عورت کو ہلاک کر دیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ تھوڑے روز تم صبر کرو۔ جب ہنگامہ فرو ہو جائے گا اور غدر مٹ جائے گا اُس وقت یہ امانت تمہاری تم کو مل جائے گی ابھی تمہارے بادشاہ کے پاس رہے گی اس میں اور خواجہ سرا وغیرہ جو ڈیوڑھی پر موجود تھے سب راقم کے ہمزبان ہوئے اور سمجھا سمجھو کر یہاں سے روانہ کیا اور اُس نوجوان نازنین کے ذرا جان میں جان آئی اور مجھ سے الگ ہوئی

کھڑی ہوئی۔ اب میں نے اُس مس سے اُس کا حال دریافت کیا کہ تم کو یہ کیونکر لایا۔

نوجوان مس نے منہ کو ہاتھ لگا کر پانی کا اشارہ کیا میں نے آبدار خانہ میں سے پانی منگا کر اُسے پلوایا جب ذرا ہوش درست ہوئے۔

نوجوان مس۔ اس آدمی نے صاحب کو مار ڈالا۔ اور ہمارا ہاتھ پکڑ کر لے چلا راستہ میں سپاہی لوگ ہم کو چھیننے لگے۔ اس نے نہ دیا مرنے مارنے پر تیار ہوا۔ لڑتا بھڑتا یہاں تک آیا۔ مال و اسباب ہمارا دنیا نے لوٹ لیا۔ کیا اب ہم کو تم اس آدمی کو پھیر دے دو گے۔

راقم۔ نہیں نہیں ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا۔ اب بادشاہ کی پناہ میں آگئی ہو۔ جیسا بادشاہ کا حکم ہوگا۔ وہ کیا جائیگا ابھی تم کو حفاظت میں بہ آسایشِ تمام رکھا جائیگا۔ کوئی تم پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا جب وقت غدر مٹ جائے گا پھر تم کو اختیار ہے جہاں چاہو رہو تم مختار ہو تمہاری زندگی تھی کہ تم زندہ سلامت یہاں پہنچ گئیں اب تم کو کوئی نہیں مار سکتا۔

ٹھنڈا سانس بھر کر دیکھا چاہیے ''

راقم نے خواجہ سرا سے کہا کہ ان کو محل میں بھجوا دو۔ اور خواجہ سرا نے ڈیوڑھی کا پردہ اٹھایا اور باری دار کو آواز دی بی باری دار میم صاحبہ آتی ہیں۔ انہیں حضور میں پہنچا دو۔ ڈیوڑھی کا پردہ اٹھا اور وہ نوجوان نازنین خاتون اندر داخل ہوئی۔

بینک لوٹ لیا

اب دو بج چکے ہیں تیسرے کا عمل ہے۔ بدمعاشانِ شہر نے جو دیکھا کہ اب لوٹ مار کی ممانعت ہوگئی۔ اب دال

گلنی دشوار ہے۔ اغوائے باغبان پر کمر باندھی مثل مشہور ہے ایک تو کڑوا کریلا اس
پر چڑھا نیب حسب تحریص و ترغیب مغویان شیطان سرشت فرقہ باغیہ ہمراہ ہوئے
اور بد پیشگان نے اُن کو لے کر بنک گھر کے دروازہ پر کھڑا کر دیا۔ بنک سرکاری
شمرو کی بیگم کے باغ کی کوٹھی میں جو خونی دروازہ کے محاذ میں اور دروازہ باغ جنوب
رویہ لب سڑک اُردو بازار واقع ہے۔ غارتگران بے پروا نے جو دروازہ باغ میں قدم
رکھا۔ محافظان خزانہ بنک نے جو انگریز تھے نیز چند عورات معہ بچوں کے پناہ گزین
تھیں اُن انگریزوں نے سررشتہ حزم و احتیاط خزانہ ہاتھ سے نہ دیا اور بہ استقلال
تمام و جرأت مالا کلام مقابلہ سے پیش آئے اور سقف کوٹھی سے بندوقیں سر کیں ادھر
سرومان باغیہ نے جواب ترکی بہ ترکی دیا لڑائی کا سامان ہو گیا۔ باہم بندوق چلنے لگی۔
تھوڑی دیر یہ ہنگامہ برپا رہا۔ بعدہٗ دو چار بد معاشوں نے دیوار باغ سے کود کر کوٹھی
کی چھت میں آگ لگا دی۔ کوٹھی کے سقف میں بڑے بڑے طویل اور جسیم شہتیریں
جب جل کر گرنے لگیں تو شعلہ ہائے آتش سر بفلک کشیدہ ہو گئے اور افراط دخان
سے آسمان تیرہ و تار ہو گیا۔ حاصل کلام سقف کوٹھی جل کر بیٹھ گئی اور وہ بہادر رستم
دل اُس میں جل کر خاک ہو گئے اور پوربی کوٹھی میں داخل ہوئے۔ اول تو جو یورپین
عورتیں اور بچے اُس میں پناہ گزین تھے اُن کو بیرحمی سے ہلاک کیا چونکہ کوٹھی مذکور
کا باہر کا درجہ گر ا تھا اندر کے کمرے سب سلامت تھے جن میں خزانہ کے صندوق
تھے۔ یہ کوٹھی کے عقب سے اُس میں داخل ہوئے اور صندوق خزانہ کے قفل توڑ توڑ
کر توڑے روپیوں کے لوٹنے شروع کئے۔ ان غارتگروں میں وہ لوگ ہیں جو میرٹھ سے
باغی ہو کر پلٹن اور سوار آتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ والے جو بد معاش ہمراہ ہوئے ہیں

اور اُن کے شہر کے کولی۔ چمار۔ دھوبی سقے۔ کنجڑے۔ قصاب۔ کاغذی محلہ کے کاغذی اور دیگر بدمعاشانِ شہر۔ پہلوان۔ بانڈی باز۔ اُٹھائی گیرے۔ جیب کترے وغیرہ وغیرہ سب رذیل ہیں۔ کوئی شریف خاندانی اُن کے شامل نہیں ہے جو نیک معاش واشرفہ ہیں وہ اپنے گھروں کے دروازے بند کئے بیٹھے ہیں اُن کو یہ خبر تک نہیں کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے مردمانِ باغیہ سے جس قدر لوٹا گیا۔ خوب روپیہ لوٹا کہ اس کے اٹھانے سے عاری ہو گئے۔ علی ہذا القیاس ایک ایک چمار جوڑہ تین تین تھیلیاں روپوں کی اٹھا کر گھر لے گیا خصوصًا کاغذی محلہ کے باشندے کہ زیر دیوار سکونت پذیر تھے نہال ہو گئے۔ روپوں سے گھر بھر لئے مثل مشہور ہے۔ مال مفت دلِ بے رحم مگر کہاں تک لوٹیں چودہ لاکھ روپیہ ہے تاہم روپیہ سی شئے کو کون چھوڑتا ہے۔ ایک گھنٹہ کے عرصہ میں سب لوٹ لاٹ کر برابر کر دیا۔ خزانہ کے صندوق تک اٹھا کر لے گئے۔ دو گھنٹہ کامل یہ ہنگامہ رہا۔

میگزین اُڑا دیا

پانچ بج چکے ہیں۔ دن ڈھل گیا ہے ہنوز قیامت برپا ہے۔ گرمیٔ ہنگامہ طلوع پہ ہے۔ باشندگانِ شہر میں نفسی نفسی کی پڑی ہوئی ہے۔ عجب ایک تلاطم فتنہ و فساد ہے کہ نیچے کی زمین اوپر ہو رہی۔ دریائے کشت و خون جوش مار رہا ہے لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہے ظالمانِ بے خوف خرگرانِ ناخدا ترس نے حشر برپا کر رکھا ہے۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں۔ اپنی اپنی سب کو پڑی ہوئی ہے۔

سوادِ ہند میں غرقِ احتشام تھی دہلی ۔۔۔ بیاضِ مردمکِ خاص و عام تھی دہلی
زمینِ چرخ کی قائم مقام تھی دہلی ۔۔۔ جب آبِ عہدِ جوانی تمام تھی دہلی

یہ وہ زمیں ہے زمیں جس کی زرد و گلتی ہے
یہ خاک وہ ہے کہ اکسیر ہاتھ ملتی ہے

جہان آباد لقب تھا یہ عزوشاں کیلئے ۔ جہاں کا لفظ بنا تھا اسی مکاں کیلئے
یہ درجے اسکے لیئے تھے نہ آسماں کیلئے ۔ کہ اس سے کام زمانہ نے دو جہاں کیلئے

فلک سے رتبہ میں رتبہ دو چند تھا اس کا
مقامِ عرش سے پایہ بلند تھا اس کا

دلِ زمانہ تھا دلّی پہ یہ تباہی ہے ۔ نہ سمجھے دل میں تا کجا مرِ جفائی ہے
کہ دل کو لوٹتے ہیں خانۂ خدائی ہے ۔ خدا کے گھر کو بگاڑ استم کمائی ہے

نہیں جہاں میں واللہ اس جفا کی پناہ
جو انتقام ہو اس کا تو بس خدا کی پناہ

یہ شہر وہ ہے کہ غنچہ تھا مہ جمالوں کا ۔ یہ شہر وہ ہے کہ تختہ تھا نونہالوں کا
یہ شہر وہ ہے کہ مجمع تھا حسن والوں کا ۔ یہ شہر وہ ہے کہ مرجع تھا باکمالوں کا

یہ وہ مکاں ہے مکیں جسکے قیصر و جم سے تھے
یہ خطّہ وہ ہے گدا جسکے فخر حاتم تھے

ہرکاروں کی ڈاک لگ رہی ہے ۔ داد فریاد کی خبریں چلی آتی ہیں ۔ بدمعاشانِ ابلیس بنیاد ۔ ظالمانِ شرزادہ زادہ کو ساتھ لگائے لگائے پھرتے ہیں ۔ ملازمانِ شاہی معہ حکیم احسن اللہ خاں خانساماں کی کے دالان میں بیٹھے ہوئے یا بدیع العجائب بالخیر کی تسبیح پڑھ رہے ہیں ۔ الاماں کا وظیفہ سب کی زبان پر جاری ہے ۔ کہ یکایک اس اندر کی مہیب آواز ہوئی کہ اگر ہزار توپ کا برابر ایک فیر ہوتا تو اتنی

گرج نہ ہوتی۔ خانسامانی کا مکان شاہجہانی عمارت ہے جس کا آثار چہار فٹ کے برابر ہے۔ چونہ گچ کی عمارت ہے اُس کے دالان کا سقف سنگ سرخ و سنگ بانسی کے ٹیسوں کا ہے۔ جن کا طول اور ضخامت ایک بالشت کا ہے اور عرض بارہ گز کا اور طول پانچ گز ہے اُس میں سے چونہ اور مٹی اِس درجہ گری کہ سب گرد آباد ہو گئی اور زمین کو اس درجہ لرزہ ہوا کہ زلزلہ محسوس ہوتا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم پر مکان آرہا۔ سب نکل کر باہر صحن میں بھاگ کر کھڑے ہو گئے اور آثار اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا کے پیدا ہوئے مغرب کی جانب جو نگاہ کی تو دیکھا کہ ایک ستون گرد و غبار اور دھوئیں کا زمین سے لگا کر آسمان تک بندھا ہوا ہے اور لاشیں آدمیوں کی زاغ و زغن کی طرح منڈلا رہی ہیں تین منٹ نہ گزرے تھے کہ آسمان سے سنگ باری وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ زمین پر برسنے لگے۔ بھاگ بھاگ کر پھر دالان میں پہنچے اب عقل حیران ہے کہ یا الٰہی یہ کیا معاملہ ہے۔ موقع واردات کا معاملہ مکان خانسامانی سے ایک میل سے کچھ زیادہ ہو گا۔ ہرکاروں کی جوڑی نے منکر و نکیر کی طرح آکر خبر دی کہ میگزین (یا مود واسلحہ خانہ) اُڑا دیا گیا۔

تفصیل اِس اجمالی کی اس طور پر گوشگزار و واقعہ نگار ہوئی ہے جب باغیانِ غلاد شقاوت آثار نے جا کر میگزین کا محاصرہ کیا ہے تو چند مردمانِ یورپین نگہبانانِ میگزین میگزین میں موجود تھے اور اکثر عورتیں بچے وغیرہ جا کر پناہ گزین ہوئے پہلے تو محصوران مجبور بمقابلہ پیش آئے اور حفاظت اختیاری کے طور پر بندوقیں سر کرتے رہے اور جب بلوائیان کا غلبہ حد سے گزر گیا اور چار دیواری میگزین کے اطراف و جوانب میں لوگ بھر گئے اور کوئی صورت جان بچنے کی نظر نہ آئی۔ اور

زندگانی سے یاس کامل ہو گئی۔ تو بموجب اس مثل کے کہ مرتا کیا نہ کرتا۔ جانِ شیریں سے ہاتھ دھو کر مرنے پر کمر باندھی ناچار آپ ڈوبوں گا مگر تجھ کو بھی لے ڈوبوں گا۔ پر عمل کیا اور کارتوسوں کے تہ خانے میں جا کر اُن کارتوسوں کو آگ دے دی۔ آپ بھی اُڑ گئے اور ایک ہزار کے قریب کو ہمراہ لے کر راہئ عدم آباد ہوئے اور کیفیت اُس کی اس طور پر ہے کہ کچھ لوگ تو دریا کی جانب کی دیوار فصیل پر کھڑے ہوئے تھے اور تین جانب خلائق کا مجمع تھا۔ اور تہ خانہ کارتوسوں کا زیرِ دیوار شہر پناہ تھا جب وہ تہ خانہ اُڑا ہے تو پچاس گز دیوار شہر پناہ کی اُوڑ گئی۔ جس قدر آدمی ڈنڈی پر تھے۔ وہ اُڑ گئے۔ کچھ تو اس طرح ضائع ہوئے اور اکثر صدماتِ سنگساران سے سنگسار ہوئے وہ عورتیں اور بچے جو اور کمروں میں چھپے ہوئے تھے اور پانچ چار بوڑھے جوان جو بچ رہے تھے۔ مگر وہ بھی زخمی ہو گئے تھے ان کو پوربیوں نے گرفتار کر لیا۔

قیدیوں کی رہائی کی کوشش

اس اثنا میں علاوہ اِن شاہی معہ حکیم احسن اللہ خاں مکان خانسامانی میں سے اُٹھ کر سب دیوانِ خاص میں آ گئے۔ چھ بجنے میں کچھ منٹ ہیں یا بج چکے ہیں روزہ کشائی کا وقت قریب آ گیا تشنگی کے مارے جان پر بنی ہوئی ہے آفتاب لبِ بام پہنچ گیا ہے۔ بلند مکانوں کے کلسوں پر زرد زرد دھوپ چمکتی معلوم ہوتی ہے۔

کہ یکایک لال پردہ کے دروازہ سے جمِ غفیرِ خلائق نمودار ہوا اور جب وہ اجماعِ کثیر دیوانِ خاص کے صحن میں پہنچا تو دیکھنے میں آیا کہ پچاس پچپن عورتیں اور بچے اور چار یا پانچ مرد زخمی چلے آتے ہیں، اور گرد اُن کے ایک حلقہ پوربیوں کا ہے اور

خلائق کا ہجوم ہے۔ اُن قیدیوں کو پوربیوں نے تسبیح خانہ کی سیڑھیوں پر بیٹھا دیا۔ ہم اُن کو اُٹھ کر دیکھنے لگے تو اُن کی اُس وقت یہ کیفیت تھی کہ سر سے پا تک اٹے ہوئے تھے اور پریشان حواس پراگندہ احوال تھے۔ اُن لوگوں نے جو تسبیح خانہ کی سیڑھیوں کی طرف مُنہ کر کے ہم کو کھڑے دیکھا تو گڑگڑا کر پانی کا اشارہ کیا۔ آبدار خانہ سے دو سقوں کو بلوایا گیا وہ دو مشکیں پانی کی بھر کر لائے اور اُن لوگوں کے ہاتھ مُنہ دھلوائے اور اوک سے سب کو پانی پلوایا مگر بعض چھوٹے بچے تھے کہ وہ اوک سے نہ پی سکتے تھے۔ مجھے اُن کے حال پر ترس آیا میں نے دو آبخورے کا غذی آبدار خانہ سے طلب کر کے اُن کی ماؤں کو دلائے کہ ان بچوں کو پانی پلواؤ۔ جب لوگوں نے پانی پیا اور ہوش درست ہوئے تو متفق اللفظ اُن سب نے کہا کہ بھائی مسلمانو! لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہم سب مسلمان ہوتے ہیں۔ ہم کو جان سے نہ مارو جب یہ بات اُن لوگوں کی زبان سے اپنے کانوں سے سنی تو بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے اور جو چار آدمی تھے سب آبدیدہ ہو گئے۔ یہ خبر اندر حضور کو پہنچ گئی اندر سے بادشاہ کا حکم آیا کہ فوج والوں کو تم لوگ سمجھاؤ اور ان کی حراست سے اپنی حراست میں لے لو۔

اُس وقت جو سپاہی سوار وافسر وغیرہ موجود تھے مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ ازاں جملہ یہ دو شخص بھی تھے ایک تو گلاب خاں رسالدار رسالہ سوم انگریزی۔ دوسرا قادر بخش صوبیدار صفر مینا پلٹن یہ دونوں رسیدہ معتبر تھے اُن کے سن پچاس سے تجاوز کر گئے تھے۔ پچاس اور ساٹھ کے بین بین میں تھے اور بہ نسبت دیگراں کسی قدر رقیق القلب اور رحمدل بھی معلوم ہوتے تھے۔ اُن

کا ہاتھ پکڑ کر دیوان خاص کے اوّل در میں جہاں ہم لوگ بھی تھے اُن سے گفتگو شروع کی گئی۔

تقریر ملا زمان شاہی۔ سنو بھائی مسلمانو تم لوگوں کا بیان ہے کہ تنازعہ کی بنا دین پر پڑی ہے اور دینِ اسلام پر ہم لوگ بگڑ کر آئے ہیں۔ پس تم کو واجب اور لازم ہے کہ اتباعِ شرعِ شریف اور پیروی بزرگانِ دین متین کی کرو اور جو احکامِ دینِ اسلام اور شریعتِ محمدی کے ہیں اُن پر عملدرآمد رکھو۔ جب تم پورے مسلمان ہو اگر اُس میں نفسانیت اور تعصب کو راہ دو گے تو دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاؤ گے۔ تمہارے پیغمبر رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یا اُن کے خلفائے کرام کے زمانے میں جو اقوام یہود و نصاریٰ و دیگر کفار سے دین پر لڑائیاں ہوئی ہیں تو اوّل اُن لوگوں سے تین شرطیں پیش کی جاتی تھیں۔ اُن میں جونسی وہ منظور کر لیتے تھے اُسی کو قائم کیا جاتا تھا۔

شرطِ اوّل۔ اگر تم لوگ دینِ اسلام اور دینِ برحق قبول کرو اور کلمہ پڑھو اور وحدانیت خدا اور نبوتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ تو تم ہمارے بھائی بند ہو۔ جو ہم ہیں وہ تم ہو۔ ہم میں تم میں کچھ فرق نہیں۔ تمہارا مال اسباب ملک زمین جورو بچوں سے ہم کو کچھ تعرض نہیں۔

دوم:۔ یہ ہے کہ اگر دینِ اسلام قبول نہیں کرتے تو جزیہ دینا قبول کرو پھر تم لوگ ہماری حمایت میں ہو۔ کبھی تم سے عہد شکنی نہ کریں گے۔

سوم:۔ اگر ان دو نو شرائط میں سے کوئی شرط تم کو منظور نہیں تو ہمارے تمہارے درمیان تلوار ہے وہ فیصلہ کر دے گی۔ پھر وہ لوگ اگر بمقابلہ پیش آتے تھے اور نوبت

جدال قتال کی نوبت پہنچی تھی تو اُن کو کیفر کردار کو پہنچایا جاتا تھا۔ مگر عورت اور بچے پر ہاتھ کسی نے نہیں اُٹھایا۔ عورات اور اطفال قتال سے مستثنٰے کر دیئے جاتے تھے یا جو کفار ذمی ہو کر اہل اسلام کی راہ میں آجاتے تھے پھر کسی کو حوصلہ دست درازی کا نہ ہوتا تھا۔ جائے تعجب ہے کہ یہ لوگ اسلام قبول کرتے ہیں اور کلمہ پڑھتے ہیں اور تم لوگ اُن کے درپئے قتل ہو اور ان کو قتل کرتے ہو۔ یہ کہاں کی دینداری ہے اور کونسا دین ہے جس کی تم پیروی کرتے ہو۔ عورت اور بچوں کا قتل کسی مذہب میں روا نہیں۔

فریق باغیہ:۔ اچھا تو پھر ہم کو ان کے ساتھ کیا کرنا چاہیئے۔

ملازمان شاہی:۔ ان کو بادشاہ اسلام کے سپرد کرنا چاہیئے وہ ان کو مسلمان کرینگے اور جس کے ساتھ ان کی خوشی ہو گی انکے عقد کر دیئے جائینگے۔ غرضکہ بعد گفتگوئے بسیار وہ ہمارے سپرد کرنے کو راضی ہوئے کہ اچھا تم ان کو اپنے پاس رکھو۔ یہ عرض حضور میں کرائی گئی۔ حکم ہوا کہ ان سے ان لوگوں کو لیکر اپنی تحویل میں رکھو اور اُن کے کھانے پینے کی اچھی طرح خورد پرداخت کرو اور جو زخمی ہیں اُن کی مرہم پٹی کرو۔ غرضکہ اُن سب کو جو تسبیح خانہ کی سیڑھیوں کے نیچے دیوانِ خاص کے صحن میں زمین پر بیٹھے ہوئے تھے اُن میں پانچ چار مرد ہوں گے اور باقی عورات اور اطفال خورد سال لڑکے لڑکیاں تھے۔ میرے قیاس کے بموجب قریب ساٹھ کے اُن کا شمار ہو گا۔ میں نے اُس وقت تسبیح خانہ کے چبوترہ پر کھڑے ہو کر کہا کہ تم سب دیوانِ خاص میں آجاؤ۔ وہ سب وہاں سے اُٹھ کر تسبیح خانہ میں ہو کر دیوان خاص میں آتے تھے تو اُس وقت کسی شخص نے اُن سے کہا کہ اس شخص نے بڑی کوشش کر کے تمہاری جانیں بچائی ہیں تو وہ سب لوگ مجھ کو دعائیں دینے لگے اور اسی اثنا میں ڈیوڑھی کا پردہ اُٹھا اور وہ خوبصورت نوجوان

لڑکی جس کو میں نے اُس ولایتی کے ہاتھ سے چھینا تھا اور پوربیوں کے ہاتھ سے بچایا تھا، محل سے باہر آئی اور پیچھے اُس کے دو عورتیں تھیں تینوں نے آکر مجھ سے پوچھا کہ اب کہاں جائیں میں نے جواب دیا اور سب تمہارے ہم قوم دیوانِ خاص میں موجود ہیں تم بھی اُن میں شامل ہو جاؤ۔ چونکہ وہ یہ جانتی تھیں کہ میں نے پوربیوں اور ولایتی کے ہاتھوں سے چھوڑا کر اندر بھیجدیا تھا اور اُس کے دل میں خوف خدا ہے اور ایسی حالتِ یاس میں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ مجھ سے کہنے لگی کہ اب تم کہاں جاؤ گے میں نے کہا کہ اب گھر جاؤں گا اور صبح کو نوکری میں پھر حاضر ہوں گا اس نے کہا تم مجھے اپنے گھر لے جاؤ میری جان بچ جائے گی میں نے کہا کہ اب تم کو کوئی نہیں مارے گا تم بادشاہ کی حفاظت میں ہو اُس نے جواب دیا دیکھا چاہیئے۔ تم اپنے ساتھ لے چلو میں نے کہا کہ میں کیونکر لے چلوں تمہیں دیوانِ خاص کے باہر نکلتے ہی یہ لوگ مجھے اور تمہیں دونوں کو مار ڈالیں گے۔ اِس پر وہ آبدیدہ ہو کر دیوانِ خاص میں چلی گئی۔ میں اپنے گھر کو روانہ ہُوا۔ دیوانِ عام کے چوک میں ہوتا ہُوا نقار خانہ کے دروازہ سے نکل کر قلعہ کے لاہوری دروازہ سے باہر آیا۔ شام کی تاریکی پھیل گئی جب میں اُردو بازار کی سڑک پر آیا ہوں تو شہر میں سناٹا تھا۔ سڑک پر ایک چڑیا نہ تھی۔ ایک عجیب بے رونقی تھی۔ شہر کا شہر کھانے کو دوڑتا تھا جابجا دوکانیں لوٹی پڑی تھیں۔ مکانوں کے دروازے بند تھے روشنی کا نام نہ تھا۔ لالٹینوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے میں خونی دروازہ کے آگے ہوتا ہُوا کوتوالی کے سامنے سے گذر کر چھوٹے دریبہ کے پھاٹک پر پہنچا اور چھوٹے دریبے میں چھپرے والوں۔ مٹھائی والوں اور بزازی کی دوکانیں سب ٹوٹی ہوئی پاتیں اور صراف کی دکان پر ایک افیونی فقیر

برہمن زخمی پڑا ہوا تھا وہ ہائے ہائے کر رہا تھا۔ اُس کی پشت کے اوپر تین زخم ہلکے ہلکے تلوار کے تھے۔ وہاں سے آگے بڑھ کر ماڑی وارے میں ہوتا ہوا اپنے مکان پر آیا۔ گھڑی بھر رات آگئی تھی۔ ابھی دروازہ نہیں کھلا تھا مارے پیاس کے میری زبان باہر نکلی ہوئی تھی اور حلق میں کانٹے پڑے ہوئے تھے۔ مجھ کو دیکھ کر والد نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ زندہ سلامت گھر میں آگیا۔ اسی وقت میں نے شربت پیا۔ روزہ کھولا۔ کھانا کھایا۔ والد نے مجھ سے حال پوچھا میں نے ساری حقیقت بیان کی کہ اس طرح سے میں نے فہمایش کر کے اُن لوگوں کو بچایا ہے۔ میرے والد نے فرمایا کہ خدا تجھ کو جزائے خیر دے تو نے بہت اچھا کام کیا میں نہایت خوش ہوا ہم سادات ہیں ہماری سرشت میں رحم و ترحم خمیر ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور اُن کی اولاد نے کیسے کیسے رحم کئے ہیں۔ جناب علی مرتضٰے کرم اللہ وجہہ نے اپنے قاتل کو کاسۂ شیر بھیجا ہے۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ قلعہ کی جانب سے توپوں کی آواز آئی میں نے سمجھا انگریزوں کی فوج پیچھے سے آپہنچی۔ میں نے آدمی کو بھیجا کہ جاؤ خبر لاؤ۔ یہ توپیں کیسی چلتی ہیں۔ آدمی نے واپس آکر جواب دیا کہ چھاؤنی کی پلٹنیں شہر میں آگئی ہیں۔ اس کی سلامی کی توپیں چل رہی ہیں میں دن بھر کا مارا تھکا پلنگ پر لیٹتے ہی سو گیا۔ صبح کو منہ ہاتھ دھو کر پھر قلعہ کو روانہ ہوا۔ دن بھر وہاں حکم احکام کی تعمیل کرتا رہا۔ اس روز بادشاہ سلامت کی طرف سے شہر کا انتظام ہوا اور کوتوال مقرر کیا گیا۔ مجھے حکم ہوا کہ سقوں کو لے جاؤ اور میگزین میں آگ لگ رہی ہے اس کو بجھاؤ۔ اور اگر بارود میں آگ لگ گئی تو تمام شہر اڑ جائے گا۔ غرض کہ کوتوال کی معرفت دو تین سو سقے میرے پاس پہنچے اور جن مکانوں میں آگ لگ رہی تھی وہ بجھوائی۔ دریا کی طرف کا شہر کا ڈنڈا

گرا ہوا پڑا تھا۔ گولوں کے پہاڑ لگے ہوئے تھے۔ دو سو توپ کے قریب چھتیس ہی تو پھڑوں پر تیار تھیں۔ سا سی قدر توپ کی نالیں زمین پر پڑی تھیں۔ بندوقوں کا کچھ شمار حساب نہ تھا۔ تینچے لاانتہا تھے۔ غرضکہ سارا میگزین آلاتِ حرب سے معمور تھا۔ میں تو اس کو اسی طرح چھوڑ کر آیا تھا۔ دو تین روز کے بعد سنا کہ بدمعاش اُس سامان کو لوٹ کر لے گئے۔ مگر توپ کے گولے باقی رہ گئے۔ شہر کی یہ کیفیت تھی کہ بدمعاش شہر کے پوربیوں کو ہمراہ لئے ہوئے بھلے مانسوں کے گھر لٹواتے پھرتے تھے اور جس کو مالدار دیکھا اُس کے گھر پہ پوربیوں کو لے جا کر کھڑا کر دیا کہ یہاں میم چھپی ہوئی ہے صاحب لوگ ہیں۔ اس بہانے سے گھر میں گھس گئے۔ اور لوٹ لیا۔ بادشاہی ملازموں کی یہ حقیقت تھی کہ ہر وقت اجل سر پہ کھڑی تھی۔ ہر دفعہ لوگ آ کر ہم کو گھیر لیتے تھے اور سینہ پر بندوقیں دھر دیتے تھے۔ ایک دن ہم بیس پچیس آدمی خانسامانی میں حکیم احسن اللہ خاں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ پوربیوں نے آکر ہم کو گھیر لیا۔ اور بندوقیں پایوں پہ کھینچ کر کھڑے ہو گئے اور کہا تم سب بے دین ہو۔ ایسے تم سب کرسچین ہو تم انگریزوں کو چٹھیاں لکھتے ہو۔ ہم لوگوں نے حیران ہو کر اُن سے کہا کہ ایک دفعہ تم ہم سب کو اڑا دو روز کے جھگڑے سے تو فیصلہ ہو جائے۔ اُن میں سے ایک دو افسر سمجھدار بھی تھے وہ اُن کو سمجھا کر لے گئے۔ اُن کے ظلم سے ہم لوگوں کی جان ناک میں تھی اور دھر فوج کا یہ حال تھا کہ روز دو چار سو آدمی فوج کے بھاگ بھاگ کر آتے تھے اور دلّی میں جمع ہوتے تھے۔ چار کمپنیاں کوئل جیسر سے آئیں اور پانچسو جوان سفر مینا کی پلٹن کے اور آ گئے اب کوئی سات آٹھ ہزار آدمیوں کے قریب جمعیت پوربیوں کی ہو گئی۔

بدی کے تخم شقی کشت دل میں بونے لگے　　کہ بے گناہ زن و بچہ قتل ہونے لگے

جو اہلِ درد تھے رو رو کے جان کھونے لگے　　مسیح و خضر بھی منہ ڈھانپ ڈھانپ رونے لگے

ستونِ خانۂ نصفت گرا دیئے یکسر

چراغ بزمِ عدالت بجھا دیئے یکسر

قیدیوں کا قتل

ایک دن صبح کا وقت ہے۔ کوئی گھڑی بھر دن چڑھا ہوگا۔ میں گھر سے نکل کر قلعہ کی طرف روانہ ہوا اور نقار خانہ میں داخل ہو کر دیوانِ عام کے نزدیک پہنچا وہاں مجھ کو خیال آیا کہ خانسامانی میں چل کر حکیم جی سے ملتے چلو شاید حضور میں سے کچھ احکام صادر ہوئے ہوں اس خیال سے جالی کا راستہ چھوڑ کر خانسامانی کے دروازہ سے اندر داخل ہوا۔ جب مہتاب دروازہ کے آگے پہنچا دیکھا کہ پوربئے ان قیدیوں کو باغ سے لے کر باہر آتے ہیں میں نے پوچھا کہ تم ان کو کہاں لے جاتے ہو وہ بولے کہ ہم ان کو قلعہ کے باہر لے جا کر رکھینگے پھر میں نے کہا کہ یہ تو ہماری تحویل میں ہیں۔ تم ان کو نہ لے جاؤ۔ مگر وہ کب سنتے تھے مجھ کو اندیشہ ہوا کہ مبادا یہ کچھ اور حرکت ہی کر بیٹھیں میں قدم بڑھا کر جلدی سے احسان اللہ خاں صاحب کے پاس پہنچا وہ خانسامانی کے کوٹھے پر لیٹے ہوئے تھے میں نے جا کر ان سے کہا کہ خان صاحب آپ کو کچھ بھی خبر ہے وہ بولے کیا میں نے کہا کہ وہ بدمعاش ان قیدیوں کو لئے جاتے ہیں۔ مبادا وہ ان کو لے جا کر قتل کر ڈالیں آپ اس کا بندوبست کیجئے تو مجھے جواب دیا کہ ہم کیا کر سکتے ہیں پھر میں نے کہا۔ کہ خان صاحب وقت نمک حلالی کا یہ ہے کہ اگر بادشاہ کو بچایا چاہتے ہو تو سمجھا سمجھو کر ان قیدیوں کو بچا لو ورنہ یاد رکھو انگریز لوگ دلی کا چبوترہ بنا دیں گے احسان اللہ خاں

نے جواب دیا کہ میاں تم بچے ہو۔ تم کیا جانو کہ انسان زحمت بالفعل پر زحمت بالقوۃ کو ترجیح دیتا ہے۔ ابھی جو ہم اُن سے کہتے ہیں تو یہ اُن سے پہلے ہم کو قتل کرینگے اور پیچھے اُن پر ہاتھ ڈالیں گے پھر میں نے جواب دیا اچھا ہے اگر ہم دو چار آدمی مارے جائیں مگر بادشاہ کی سرکار تو بچ جائے گی۔ یہ کہہ کر میں وہاں سے روانہ ہوا اور ڈیوڑھی پر آیا۔ خواجہ سرا سے عرض کرائی کہ وہ پوربئے انگریزوں کو نکال کر لے گئے۔ جن کو حضور نے بڑے خاصے میں رکھا تھا۔ بادشاہ نے اسی وقت حکم دیا کہ حکیم جی کو لاؤ۔ وہ اس کا بندوبست کریں۔ خواجہ سرا نے اندر سے آکر ہرکارے کو دوڑایا کہ جلدی حکیم جی کو لے کر آؤ۔ غرض ایک ہرکارہ تھوڑی دیر کے بعد دوسرا گیا پھر تیسرا ہرکارہ روانہ ہوا اس عرصہ میں گھڑی ڈیڑھ گھڑی کا زمانہ گذر گیا۔ حکیم جی کسی طرح وہاں سے نہ ہلے بعد ڈیڑھ گھڑی کے حکیم جی تسبیح خانہ پہنچے۔ اور اندر محل میں حضور کے پاس پہنچے بادشاہ نے حکم دیا کہ تم افسروں کو بلا کر سمجھاؤ اور اُن لوگوں کو بچا لو۔ غرضکہ بہت اچھا کہہ کر باہر آئے اور دیوانِ خاص میں آکر بیچ کے در میں کٹہرے سے لگ کر ہو بیٹھے اور شاید ایک دو آدمی افسروں کے بلانے کو بھیجا۔ کہ ناگہاں ہم دیکھتے کیا ہیں کہ لعل پردہ کے دروازہ سے دو کمپنیاں پوربیوں کی بندوقیں کاندھے پر رکھے ہوئے چلی آتی ہیں اور آتے ہی انہوں نے دیوانِ خاص میں گھُسکر ہم لوگوں کا محاصرہ کیا اور بندوقوں کے پیانے چڑھا کر ہمارے سامنے کھڑے ہو گئے اُس وقت ہم لوگ خدا کو یاد کرتے تھے اور سب بیٹھے ہوئے کلمہ پڑھ رہے تھے۔ ہم کوئی دس بارہ آدمی کے قریب تھے ہم کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب لمحہ دو لمحہ میں یہ ہم کو اُڑا دیں گے۔ گھڑی بھر تک یہ کیفیت رہی۔ بعد دو سواروں کے ہاتھ میں سرخ رومال لعل پردے کے دروازہ سے دیالی

کا جھلا دیا۔ اُن سپاہیوں نے جو ہم پر بندوقیں بھرے ہوئے کھڑے تھے۔ اُنہوں نے بندوقوں کے پلئے اوتار دیئے اور کاندھے پر رکھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں ہرکارے نے آکر خبر دی اُن قیدیوں کا کام تمام کر دیا گیا۔ یہ سُنکر مجھ کو اس وجہ صدمہ ہُوا کہ بیان نہیں کر سکتا جس قدر مجھے اپنی اولاد کے مرنے کا غم ہُوا۔ اسی کے برابر اُن بچوں کے مارے جانے کا الم ہُوا میں حیران ہوں کہ وہ کمبخت کیسے سنگدل تھے کہ جن ظالموں نے ہاتھ ان بچوں پر اور اِن حور طلعت عورتوں پر اٹھائے تھے۔ پھر میں اُسی وقت اس رنج میں وہاں سے اُٹھ کر اپنے گھر کو آیا۔ جب نقار خانہ کے دروازہ میں آیا تو میں نے دیکھا کہ دروازے کے دائیں جانب کو وہ کٹے ہوئے پڑے تھے۔ مجھ سے یہ حال دیکھا نہ گیا اور مُنہ پر رومال ڈال کر چلا آیا۔ حوض کے برابر میرا چاکر گھوڑا لئے ہوئے کھڑا تھا میں گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے مکان پر آیا تو پراگندہ حواس منتشر الحال تھا میرے والد نے دریافت کیا۔ خیر باشد آج ایسا پریشان کیوں ہے میں نے وہ ماجرائے قیامت انگیز بیان کیا۔ اس واقعہ ناگزیر کو سُنکر وہ بھی بہت متالم اور متاسف ہوئے اور فرمایا تیرے نامہ اعمال میں تو جوائے خیر اس کی تحریر ہو گئی۔ مگر ان بے گناہوں کی قضا تھی۔ مشیتِ ایزدی یوں ہی تھی۔ مجھے آج تک جو اُس واقعہ کا خیال آتا ہے تو میرے آنسو نکل آتے ہیں۔ کئی روز تک مجھے صدمہ رہا تھا۔ اس واقعہ کے بعد کی یہ کیفیت ہے کہ شہر میں پوربیوں کا راج ہو رہا تھا۔ جو چاہتے تھے کرتے تھے اندھیر نگری چوپٹ راج۔ اندھے کی داد فریاد۔ رعیت کا ناک میں دم تھا خدا سے ست بدعا تھے کہ خداوندا اس بلائے ناگہانی کو جلدی دفع کر یہ کمبخت ظالم کہیں شہر سے نکلیں تو قصہ پاک ہو اور ہم کو ان جفاکاروں کے ہاتھ سے رستگاری ہو اور اُن غداروں

کی یہ کیفیت تھی کہ تمام خزائنِ انگریزی اور سرمایۂ ابتک اور مال بادار لوٹ کر مالامال ہو رہے تھے۔ روپیہ رکھنے کو جائے نہ تھی۔ روپیوں کی اشرفیاں کرا کر کمروں میں باندھ رکھی تھیں۔ اور اشرفی کا بھاؤ ایسا گراں ہوا تھا۔ کہ تیس روپیہ کو ملتی تھی۔ اور رعیت بھوکی مرتی تھی۔ تمام کارخانے بند تھے۔ دستکار اور اہل حرفہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے ہوئے بیٹھے تھے ✦

چوتھا باب

انگریزی فوج آگئی

ریس وھادہ چہ معنی دارد۔ ہینڈن ندی کے اُس طرف غازی آباد میں گوروں کی فوج آگئی ہے اب چہار طرف سے بگل کا شور دھتو دھتو ہو رہا ہے۔ اور جلدی جلدی فوج کی کمر بندی ہو رہی ہے۔ توپ خانہ تیار لیس ہے۔ میگزین کی گراچیاں لدی ہوئی ہیں۔ پلٹنیں الگ جمی ہوئی کھڑی ہیں۔ رجمنٹیں ایک جانب ہیں کہ بگل میں کوچ کی بولی بولی گئی اور فوج مسلح اور مکمل ہو کر پل کے دروازہ سے سلیم گڑھ کے نیچے ہوتی ہوئی دریائے جمن کے پُل پر سے عبور کر کے شاہ درے کی سڑک پر روانہ ہوئے۔ دن کے دس بج چکے ہیں۔

پہلی لڑائی

غرضکہ پورے بارہ کا وقت تھا کہ توپ کی آواز کان میں آئی۔ احتمال ہوا کہ دوپہر کی توپ چلی ہے کہ ایک منٹ کے بعد دوسری توپ سَر ہوئی۔ ہاں دوپہر کی توپ نہیں جنگ کی توپ ہے۔ لڑائی شروع ہو گئی۔ اب متصل توپ کے فیر ہونے لگے۔ لگاتار توپ کی آواز چلی آتی تھی۔ پھر یک بارگی باڑ کی آواز آنے لگی

اب توپ بھی چل رہی ہے اور بندوقوں کی باڑیں جھڑ رہی ہیں۔ دو گھنٹہ کامل یہ صدا آتی رہی بلعد توپ اور بندوق بند ہوئی۔ اور فٹ فیر کی آواز متفرق آنے لگی اب مقام حرب قلعہ سے بارہ تیرہ میل کے فاصلہ پر ہوگا۔ اور دن کے تین بج گئے ہیں ظاہرا معلوم ہوتا ہے کہ دو گھنٹے کے عرصہ میں ڈبل کوچ کر کے پہنچ گئے اور لڑائی شروع ہوئی اور تین گھنٹہ میں فیصلہ ہوگیا۔ ابھی فتح شکست کا حال کسی کو معلوم نہیں کہ کون جیتا اور کون ہارا۔ اس کا انتظار ہے۔ غرضکہ پانچ بجے کے قریب میں قلعہ سے سوار ہوکر جاتا ہوں۔ جب لاہوری دروازہ کے چھتے میں پہنچا تو مجھے فوج واپس آتی ہوئی ملی۔ آگے آگے توپخانہ تھا ـــــ میں نے دیکھا کہ ایک جوان میگزین کی کراچی پر صندوق سے لگا ہوا بیٹھا ہے۔ مگر بیہوش۔ آنکھیں بند ہیں میں سمجھا زخمی ہے۔ گھوڑوں پر جو بیشتر سوار تھے میں نے اُن سے پوچھا کہ اس کے زخم کہاں آیا ہے۔ اُنھوں نے کہا زخم نہیں آیا۔ اس کے ٹھنڈا گولہ لگا ہے۔ اُس کے صدمہ سے بیہوش ہوگیا ہے اُس کے بعد میں نے دیکھا کہ سوار اور پیدل ہنستے کودتے ہیں باجا بجاتے چلے آتے ہیں۔ قلعہ کے دروازہ میں سے میں نے نکل کر ایک سوار سے پوچھا کہ تم اتنی جلدی کیونکر واپس چلے آئے اُس نے بیان کیا کہ ہماری فتح ہوگئی۔ گورے مقابلہ پر سے بھاگ گئے ہم واپس چلے آئے پھر میں نے پوچھا کہ لڑائی کی کیا شکل ہوئی۔ اُس نے بیان کیا کہ بنڈ ہی ندی کے اس پار ہم تھے اور وہ اُس پار وہ تھے۔ جانبین سے توپیں چلتی رہیں۔ ہمارے توپخانہ نے بڑا کام دیا۔ آدمی آدمی کے پیچھے گولہ لگا دیا۔ دوسرے یہ بات بھی ہوئی کہ گورے دھوپ کی تیزی اور حرارت آفتاب کی تاب نہ لاسکے ہم دور سے دیکھتے تھے کہ وہ ندی کے پانی کے اندر کھڑے

تھے اور اُن کے گھٹنوں تک پانی تھا۔ جب ہمارے سواروں نے دھاوا کیا تو وہ کلبلا کر بھاگ کھڑے ہوئے لیکن اپنی توپیں وغیرہ سب سامان اپنے ساتھ لے گئے۔

دوسری لڑائی یہ بہت بڑی خونخوار جنگ ہے۔ غازی آباد کے بعد ایک مہینہ بھر تک کچھ لڑائی بھڑائی کا ذکر تک نہیں ہے، پوربیئے امن و امان سے بے غل و غش چین اوڑاتے ہیں۔ خوب بھنگیں پیتے ہیں اور لڈو پیڑے کھاتے ہیں۔ رسوئی کرنی چھوڑ دی ہے۔ دونو وقت پوری کچوری مٹھائی چکھتے ہیں اور پاؤں پسار کر نیند بھر کر سوتے ہیں اور چاروں طرف سے مدد چلی آتی ہے۔ لکھنؤ کا رسالہ آگیا اور جلندر والی پلٹن کے جوان بھاگ کر چلے آتے اب قریب دس بارہ ہزار کی جمعیت پیدل سوار جنگی کی فراہم ہوگئی ہے اس کے علاوہ میرٹھ کے جیلخانہ کے بدمعاش جو رہا ہو کر ہمراہ فوج باغیہ کے آئے ہیں سو وہ ساتھ ہیں اور دلّی کے جیل خانہ کے چور اٹھائی گیرے سب فوج کے ہمراہ ہیں

جہاں کے جتنے تھے اوباش و رند نافرجام ۔۔۔ دغا شعار چغلخور بدمعاش تمام
ہوئے شریک سپاہِ شریر و بد انجام ۔۔۔ کیا تمام شریفوں کے نام کو بدنام

اٹھائی گیرے اوچکے گھروں سے دھر بھاگے
جو گٹھ کٹے تھے وہ گٹھری لپک کے گھر بھاگے

سولھویں رمضان کی ڈیڑھ ماہ کے بعد ایک دن پانچ بجے دن کے میں گھوڑے پر سوار قلعہ سے گھر آتا ہوں تو قلعہ کے چھتے میں مجھے دو سوار نیلی وردی کے ملے اور ان کی نیلی جھنڈیاں تھیں۔ مجھے بظاہر اُن کی وجاہت اور چال کر چ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید کسی رسالے کے افسر ہوں مسلمان تھے۔ صاحب سلامت ہوئی۔ چونکہ اُس وردی کا کوئی اور سوار میری نظر سے نہیں گذرا تھا مجھے شک ہوا کہ شاید

نئے سوار ہیں میں نے پوچھا تم کون سے رسالہ کے سوار ہو انھوں نے بیان کیا چھٹے رسالہ کے میں نے کہا چھ تھا رسالہ تو یہاں کوئی نہیں۔

سوار:۔ چوتھا رسالا انگریزوں کی نظربندی میں ہمراہ آیا ہے میں نے پوچھا انگریزوں کی فوج کہاں ہے۔

سوار۔ علی پور۔

میں ۔ علی پور سے تم کیونکر چلے آئے۔

جواب:۔ ہم نگاہ بچا کر چلے آئے اور اپنے بھائی بند فوجیوں کو اطلاع دینے آئے ہیں کہ وقت دغا دے کے ہم تم میں آملیں گے ایسا نہ ہو کہ تم ہم کو آتے ہوئے دیکھ کر گوروں کے شبہ میں گراب مار کر اُڑا دو۔ خبردار اس بات کا خیال رکھنا۔ پھر سواروں نے مجھ سے پوچھا کہ فوج کے افسر کس طرف ہیں میں نے بتایا کہ تم چھتے میں سے نکل کر بائیں ہاتھ کی جانب ترپولیہ سے اور نہر سے ادھر سیدھے چلے جاؤ۔ اخیر کو قلعہ کا دروازہ آئے گا اور پرانا پل جمنا کا اُس کے اوپر سے گزر کر سلیم گڑھ کا دروازہ آئے گا اس دروازہ کے اندر چلے جانا وہ سب افسر تم کو موجود پائیں گے غرضکہ وہ تو ادھر کو گئے اور میں اپنے گھر کو روانہ ہوا۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی لب شام کے چھ بجے تھے کہ تیاری کا بگل ہوا اور فوج کی کمربندی ہوگئی اور میگزین سے بڑی بڑی چھتیس پنی منڈیاں کھینچ کر دس دس بارہ بارہ جوڑی بیل لگا کے لے چلے اور میگزین کی کراچیاں جداگانہ میں سب کو ایک دوست کے کوٹھے پر بیٹھا ہوا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ چاندنی رات تھی کوئی پانچ گھڑی رات گئے یہ سب فوج باہر ہوگئی۔ بڑی توپیں تو انہوں نے پہاڑی پر چڑھا کر مورچے باندھ لئے آٹھ دس توپیں وہاں چھوڑیں۔ اور کوئی دو ہزار کی جمیعت تو وہاں اس مورچے پر رہی باقی کل

فوج ملی پور پہنچ گئی اور پیک سے ذرا آگے بڑھ کر انھوں نے مورچہ بندی کر دی
ایسا سنا گیا ہے کہ درمیان ہر دو لشکر ایک میل یا زائد کا فاصلہ ہوگا۔ بہر حال رات تو
انہیں مورچہ بندیوں میں گذری۔ پوربیوں نے بڑی توپیں اپنے بائیں بازو پر رکھی تھیں
وہ تین توپیں تھیں اور باقی گھوڑ چڑھی توپیں قلبِ لشکر میں تھیں کہ چار گھڑی
رات باقی رہے توپ چلنی شروع ہو گئی۔ سننے میں آیا ہے کہ اُن کی بڑی توپوں نے
بڑا کام دیا اور افواجِ انگریزی کا بہت نقصان ہوا۔ اب نماز کے وقت سے پہلے
سوبجروں کے رسالوں نے ان بڑی توپوں پر دھاوا مارا اور اُن کے پاس نیلی جھنڈیاں
اور نیلی وردیاں تھیں ان کو یہ دھوکا ہوا کہ شاید یہ وہی چوتھا رسالہ ہے جس کے لئے
ہم سے آکر شام کو کہہ گئے تھے کہ وقتِ جنگ میں ہم تم میں آکر شامل ہو جائینگے۔
انھوں نے اُن پر فیر نہیں کی اور وہاں اَلحربُ خُدعَۃٌ کا مقابلہ تھا۔ یہ دھوکا کھا گئے
اور وہ جب فریب معلوم ہو گیا کہ یہ سوبجروں کے سوار ہیں تو انہوں نے تین توپوں میں
گراب ڈالا اور وہ قریب آ گئے تھے۔ جب فیر کئے اُس وقت راوی کا بیان ہے کہ
سوار اور گھوڑوں کا یہ حال ہوا کہ جس طرح نداف روئی دھنتا ہے اور روئی کے
ریشے اُڑ کر اُڑ کر زمین پر گرتے ہیں۔ سوار اور گھوڑے اُڑ اُڑ کر گرے اور گوروں نے
جھرسٹ کھایا۔ مگر واہ ری جرأت وہمت اُس بہادر افسر کمانیر فوج کی کہ اُس نے
اُس وقت اِس زور سے بولی بولی کہ تمام صحرا گونج اُٹھا اور نعشوں پر سے گھوڑے
کودا کر توپوں پر جا پڑے اور باہم جنگ مغلوبہ۔ بلم اور سنگین کی ہونے لگی۔ غرض یہ کہ
گالوں سے توپیں چھین لیں اور وہی توپیں بھر کر جماعتِ باغیہ پر فیر کرنے شروع کئے
پیدلوں کی جو پلٹنیں طرفین کی تھیں اُن میں مقابلہ ہو گیا اور دونو طرف سے باڑیں

چلنی لگیں اُس وقت باڑوں کی مار سے ——— کان پڑی آواز نہ آتی تھی۔ برابر جھڑّا جاری تھا۔

زُسُمِ ستوراں دراں پہن وشت زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

دودِ باروداور گردِ سواران سے آسمان و زمین تیرہ و تار ہو رہا تھا۔ اُس وقت یہ نہ معلوم ہُوا کہ اُس معرکۂ رُستخیز محاربۂ قیامت انگیز میں کس قدر ادھر سے مرے اور کس قدر اُدھر سے ضائع ہوئے۔ غرضکہ کتنی دیر تک یہ ہنگامۂ جدال و قتال گرم رہا۔ کیونکہ بندوقوں کے باڑوں کی صدا متصل دو گھنٹے کے قریب تک آتی رہی اور بعد اُس کے مختلف فٹ فیر کے طور پر آوازیں آنے لگیں آٹھ بجے کا عمل ہو گیا تھا میں قلعہ اپنی نوکری پر جاتا تھا جب جوہری بازار کے پھاٹک سے سڑک پر آیا ہوں تو میں نے دیکھا کہ زخمی بکثرت شہر میں آ رہے ہیں۔ ایک ایک زخمی کے ہمراہ تین تین چار چار پوربیے لپٹے ہوئے اور اُسے لئے چلے آتے ہیں۔ سڑک پر خون گرتا چلا جاتا ہے۔ تمام سڑک گلرنگ ہو رہی ہے اور خون کی افشان ہوتی چلی آتی ہے۔ جیسے ہولی میں زمین پر رنگ گرتا ہے دو سوار میری برابر سے نکلے میں نے دیکھا کہ ان کے سینوں پر گولیاں لگی ہوئی ہیں۔ اور چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے اور پشت پر بھباقے کھلے ہوئے تھے اور کلیجے اور پھیپھڑے کے ٹکڑے اور خون کے لختے پر چپے پڑے تھے۔ دائیں ہاتوں میں اُن کے تمنچے اور بائیں ہاتھوں میں گھوڑوں کی باگیں تھیں۔ اور کسی طرح کا کرب اور بدحواسی اُن کے بشرے سے ظاہر نہیں تھی۔ اچھی خاصی طرح اُن کے ہوش و حواس قائم تھے اور آپس میں باتیں کرتے چلے آتے تھے۔ مجھے آج تک اس امر کا تعجب ہے کہ اتنی دیر تک وہ زندہ اور سلامت کیونکر رہے اور پانچ کوس تک زندہ

کیونکر چلے آئے اُن کے عقب میں تین سوار اور آئے کہ اُن کے ہاتوں میں نیلی جھنڈیاں
تھیں اور گھوڑے بھی اُن کے تیار تھے۔ اُن سے لوگوں نے پوچھا کہ تمہارے
پاس یہ جھنڈیاں کہاں سے آئیں اُنہوں نے بیان کیا کہ سواروں کی جھنڈیاں ہیں
اور یہ گھوڑے بھی اُنہیں کے ہیں چنانچہ صداقت اُن کی یہ وی کہ اُن کے گھوڑوں
کے سموں پر انگریزی نمبر پڑے ہوئے ہیں۔ چنانچہ میں نے جھک کر بچشم خود دیکھے نمبر
موجود تھے اور بیان اُن کا یہ تھا کہ جو سوار سرکار انگریزی مارے گئے ہیں اُن کے
یہ گھوڑے ہیں اور ہمارے لشکر کی فتح ہوگئی۔ مگر دراصل وہ جھوٹے تھے۔ مقدمہ
برعکس تھا آگے اُس کا حال بیان ہوگا۔ اُس کے بعد ایک سوار گھوڑے کو سرپٹ
دوڑائے چلا آتا تھا اور گھوڑے کی پیشانی پر گرابہ کے کاری زخم تھے اور خون اُس
میں سے اس طرح گرتا ہوا آتا تھا جیسے کہ لوٹے کی ٹونٹی سے پانی گرتا ہے اور اُس کا
تمام ماتھا اور تھوتھنی وغیرہ خون میں سرخ تھی۔ اُس کے پیچھے ایک زخمی کو دیکھا۔ کہ
اُس کا ہاتھ کہنی پر سے اُڑ گیا تھا اور کٹے ہوئے بازو سے خون گرتا چلا آتا تھا اور
اپنے پاؤں سے چلا آتا تھا۔ اور دو ایک پوربیے اُس سے کہتے ہوئے آتے تھے
کہ کہیں ہم تم کو ہاتوں پر اُٹھا کر ڈیرے پہنچا دیں تو وہ کہتا تھا کہ نہیں میرے پاس نہ
آؤ غرضکہ اسی طرح مجھے قلعہ پہنچنے تک صدہا زخمی سوار پیدل ملے۔ جب میں پہنچا تو
حکیم احسن اللہ خاں اور محبوب علی خاں خواجہ سرا اور چند آدمی ملازمین شاہی بیٹھے
ہوئے تھے۔ لڑائی کا ذکر ہو رہا تھا مگر مفصل کیفیت کسی کو معلوم نہ تھی کہ نتیجہ کیا برآمد
ہوا۔ اسی اثنا میں گیارہ بج گئے اور محبوب علی خاں اور احسن اللہ خاں کھانا کھانے
کے واسطے اپنی نشستگاہوں میں اُٹھ کر گئے میں بھی کھانا کھانے کے واسطے گھر کو

روانہ ہوا۔ جب میں نقارخانہ کے دروازے پر پہنچا تو دیکھتا کیا ہوں کہ چند پوربیے
ایک شخص کو پکڑے ہوئے لئے آتے ہیں اور ایک افسر توپ خانہ باغیہ میری برابر برابر
دیوانِ عام میں سے چلا آتا تھا۔ جب یہ دونوں دروازہ میں باہم دوچار ہوتے پوربیوں
نے اس افسر سے کہا کہ یہ قیدی انگریزی چوتھے رسالہ کا سوار ہے روا ہوے کے
وقت ہمارے سواروں میں گھر گیا تھا۔ ہم اسے پکڑ لائے ہیں اُس افسر نے شخص گرفتار
شدہ سے کچھ پوچھا نہ گچھا اُس کی کمر میں ولایتی اصفہانی تلوار تھی کھینچ کر اُس پر پے
درپے وار کرنے شروع کئے چونکہ وہ میرے برابر ہی میں تھا میں گھبرا کر سپاہیوں کے
بیٹھنے کا جو چبوترہ تھا اس پر چڑھ گیا اُس افسر نے تین وار تلوار کے اُس کے منہ پر
کئے۔ مگر خدا جلنے کیا بات ہوئی کہ اُس مقتول جسم پر خط تک نہ آیا۔ ایک پوربیا بولا
کہ اسے بھگاؤ۔ غرضنکہ اُسے چھوڑ دیا اور وہ چھوٹ کر دلی دروازہ کی ترپولی کی طرف کو
فرار ہوا۔ عقب سے ایک پوربیے نے اُس کے گولی ماری وہ اوندھے منہ زمین پر
گرا۔ میں وہاں سے روانہ ہو کر قلعہ کے دروازہ سے نکل کر اردو بازار ہوتا ہوا خونی دروازہ
کے برابر سے کوتوالی کے آگے سے ہوتا ہوا اشرف بیگ کے کمرے کے نیچے پہنچا
تو میں نے دیکھا کہ دو سو اڑھائی سو کے قریب سوار بحالِ خراب چہروں پر گرد پڑی
ہوئی وردیاں سب گرد میں اٹی ہوئیں گھوڑے پسینے میں نہائے ہوئے اُن پر مٹی جمی
ہوئی درختوں کے سایہ میں نہر کے پٹڑے سے لگے کھڑے ہوئے ہیں۔ جیسے فوج ہزیمت
خوردہ کا حال ہوتا ہے۔ وہ حال اُن کا ہے اور اُن کے آگے وہی کلانچاں رسالدار میرے
رسالہ کا کہ جس سے میری روزِ اول اُن اسیروں کی رہائی کے بارہ میں گفتگو ہوئی تھی
کھڑا ہے چونکہ مجھ سے اس کی بیشتر شناسائی ہو چکی تھی بعد صاحب سلامت کے

میں نے لڑائی کا حال دریافت کیا اُس نے ابتدا سے انتہا تک سب کیفیت بیان کی۔
اور کہا کہ ہم کو کل کے روز دو سوار چڑھتے رسالہ کے آکر دھوکہ دے کر گئے ہم دھوکے
میں رہے اور گوروں نے آکر ہماری توپوں پر قبضہ کر لیا۔ بعد پلٹنیں دونو طرف کی لڑتی
رہیں اور ڈیڑھ گھنٹہ بندوق توپ کی لڑائی رہی اور ہماری فوج پسپا ہونے لگی۔ ہماری
فوج پچھلے قدموں پسپا ہوتی جاتی تھی اور بندوقیں چلاتی آتی تھی اور ہم گھوڑچڑھے
توپوں کے گولے مارے جاتے تھے اور پیچھے ہٹتے آتے تھے کہ اسی اثنا میں لکھنؤ
والا رسالہ تازہ دم ہماری مدد کو پہنچا اور کہا تم بیچ میں سے میدان چھوڑ دو۔ ہمیں ان
بدمعاشوں کو دیکھنے دو جو سوار تم کو دباتے آتے ہیں۔ ہم نے میدان دے دیا اور وہ رسالہ
گھوڑے اُٹھا کر سوجروں کے رسالوں پر جا گرا اور باہم دست بدست کی لڑائی ہونے
لگی۔ جانبین سے طمنچہ چل رہا تھا۔ ایک نے ایک کے سینہ پر طمنچہ رکھ دیا ایک نے
ایک کے منہ پر رکھ دیا برابر فیر ہوتے تھے۔ فرض کہ ایک گھڑی بھر کامل یہ جنگ مغلوبہ
رہی بعد کچھ سوار زخمی ہوئے کچھ مارے گئے۔ تھوڑے سے سوار بچ کر آگئے ہیں اور
گھوڑچڑھی کے توپخانہ نے یہ کام دیا کہ پیچھے ہٹ کر مخلدار خاں کے برابر جو ترپولیہ
ہے اس میں توپیں لگا دیں اور پلٹنیں وہ باغیچہ میں چھپ کر کھڑی ہو رہیں اور ترپولیہ
کے تینوں دروں کے اندر توپیں لگی ہوئی تھیں اور دونو طرف سے باغیوں نے رستہ
روک رکھا ہے۔ اب فوج انگریزی آئے تو کدھر سے آئے۔ آخر انگریزی توپخانے
نے آکر مقابلہ کیا اور باہم نشانہ اندازی ہونے لگی انجام ایک گولہ سرکار انگریزی کی
طرف سے ایسا آیا کہ توپ کے منہ پر لگا اور توپ کے اوپر کا لب ٹوٹ گیا اور
توپ بیکار ہو گئی۔ اُس توپ کو شہر کو روانہ کیا۔ دوسری توپ کے پہیہ پر گولہ پڑا ا

اور وہ پہیہ بھی بیکار ہو گیا اور اس پر دوسرا پہیہ چڑھا کر شہر کو روانہ کر دی گئی تیسری توپ کے منہ میں جا کر گولہ پھنس گیا تینوں توپیں بیکار ہو کر شہر کو روانہ ہو گئیں۔ اب جب توپ بند ہو گئی تو فوج انگریزی نے تعاقب کیا اور گولہ اندازان اور سواران محافظ توپ خانہ پیچھے ہٹ آئے اور فوج انگریزی اس امر سے بے خبر کہ پلٹنیں گھات میں چھپی ہوئی کھڑی ہیں۔ بخوف و خطر دو رویہ سلسلے میں بندھی ہوئی چلی آئیں۔ جب باغیوں نے دیکھا فوج انگریزی داخل سڑک دو باغیہ ہو گئی اور بیچ میں آ گئی۔ یکبارگی باغات کی دیوار کے پیچھے سے کھڑے ہو کر دو نو طرف سے باڑیں جھونک دیں۔ اس وقت فوج کا یہ حال ہوا جیسے کبوتروں میں جھپرہ مار دیا۔ بہت آدمی ضائع ہوئے اور باغیوں کا تعاقب چھوڑ کر الٹے چھاؤنی کہنہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور فوج باغی یہ سمجھ کر کہ جان بچی لاکھوں پائے۔ شہر میں داخل ہوئی اور شہر میں گھس کر دروازے بند کر لئے اور اسی اثنا میں پہاڑی کے مورچوں والی فوج نے جو دیکھا کہ فوج شہر میں داخل ہو گئی۔ وہ بھی پہاڑی پر ڈنڈا ڈیرا چھوڑ کر شہر میں آ گئی توپیں بھی چھوڑ دی گئیں اور تموئیاں وغیرہ۔ جو ڈیرہ خیمہ پہاڑی پر تھا سب کا سب معہ میگزین وہیں رہ گیا۔ جب فوج انگریزی چھاؤنی میں داخل ہوئی اور اس نے دیکھا کہ پہاڑی خالی پڑی ہے ایک چڑیا تک نہیں۔ انھوں نے بنے بنائے مورچوں پر قبضہ جما لیا اور ڈیرے خیموں وغیرہ کو آگ لگا دی اور توپوں کا رخ دلی کی جانب پھیر دیا۔ مورچوں کا استحکام کر دیا۔ اد بعد پوربیوں نے شہر میں داخل ہو کر بڑی بڑی توپیں میگزین سے کھینچ کر شہر کے برجوں پر چڑھا دیں۔

اب میدان داری کی لڑائی تو جاتی رہی مورچہ بندی	باغی قلعہ بند ہو گئے

اور قلعہ بندی کی لڑائی رہ گئی۔ دن رات گولہ چلنے لگا۔ اُدھر پہاڑی پر فریزر صاحب کی کوٹھی سے لگا کر باڈے تک انگریزی فوج کے مورچے لگے ہوئے تھے اُدھر کشمیری دروازہ کے برج سے لے کر کابلی دروازہ کے سیاہ برج اور لاہوری دروازہ کے برج سے فراشخانہ کی کھڑکی کے برج تک توپیں چڑھی ہوئی تھیں اور باہم شبانہ روز گولہ باری ہوتی تھی اور شیل اور بم کے گولے شہر پر برستے تھے۔ بم کا گولہ خدا پناہ میں رکھے جس وقت پھٹتا تھا اور صدہا ٹکڑے اُس کے اُڑ جاتے تھے اگر سات، وجہ کے مکان پر پڑا تو نہ کو اُڑ گیا اور سب کا ستیاناس کر دیا اگر زمین پر پڑا تو دس گز زمین پیوست ہو کر پھوٹا اور تمام مکان کو اُڑا دیا۔ غرضکہ ایک قہر خدا تھا دس دس گولہ برابر کا غذ کے پرچوں کی طرح شب کو اُڑاتے چلے آتے تھے اور برابر پھٹتے چلے جاتے تھے۔ ادھر صبح ہوئی اور بگل بجنے شروع ہوئے اور فوج باغیہ کمر بندی کر کے لاہوری دروازہ کے باہر جا موجود ہوئی اور باہم گولی چلنے لگی۔ شام تک میدان داری رہی پھر اپنے اپنے ڈیروں پر آموجود ہوئے اب ہر چہار طرف سے فوج باغیہ کی آمد شروع ہو گئی اور کمپو آنے لگے پہلے نصیر آباد کا کمپو آیا پھر نیمچ کی فوج آئی اور مرار کا کمپو آیا۔ اب ایک سدھاری سنگھ کا کمپو تھا اور ایک جرنیل غوث محمد خاں ٹنڈے کا کمپو تھا جس کے ہاتھ دونوں لڑائی میں گولے سے اُڑ گئے تھے۔ اور بہت سی رجمنٹیں اور توپ خانہ آکر جمع ہو گئے اور ان کی ہمراہی میں اطراف و جوانب کے لوگوں کے غول جہادیوں کے نام سے اور جم غفیر دلی میں جمع ہو گئے اور نصیر آباد والی فوج نے آتے ہی سب پر طعن کیا کہ آج تک تم سے ایک پہاڑی فتح نہ ہوئی۔ کل ہم لڑنے جائیں گے تم سب دیکھنا کہ ہم کیا کام کرتے ہیں تم سب ادھر لڑتے رہو اور ہم انگریزی لشکر کی پشت پر جا کر دھاوا مارتے ہیں +

تیسری لڑائی

صبح کے آٹھ بجے نصیر آباد کی فوج دلّی میں سے تیار ہوئی۔ اور بہت سا میگزین ہمراہ لیا۔ توپ خانہ سمیت تیلی واڑے کی راہ سے دھیرج کی پہاڑی طے کر کے نہر کے پُل سے اُس طرف ہو کر مغلپورہ کے باغات کا چکر کاٹتی ہوئی چھاؤنی کے راستہ پر سدِّ راہ ہو گئی اور بارہ بجے دن کے انگریزی فوج سے اس کا مقابلہ شروع ہوا۔ اور باہمد گر گولہ باری ہونے لگی۔ اور توپ کی آواز آنے لگی۔ اُسی روز یہ کیفیت تھی کہ توپ کی صدا اس طرح آ رہی تھی کہ جس طرح اچھے ورد پلٹن پھری گنگنے لے کر کھڑے ہوتے ہیں اور باہم چوٹوں کی صدا برابر نکلتی ہے اس طرح توپ کی صدا متصل آ رہی تھی اور کبھی ان کے ہمراہ بندوقوں کی باڑ کی آواز آ جاتی تھی۔ عجیب مزے کی جنگ تھی کہ نہ دیکھی نہ سُنی۔ اور فی الحقیقت دونوں لشکر ایک ہی سرکار کے تھے۔ آخر وہ بھی تو تعلیم یافتہ افسرانِ سرکار انگریزی کے تھے۔ اُستاد شاگرد کی لڑائی تھی مگر فرق اتنا تھا کہ سرکار کا ستارہ اقبال غالب تھا اور اُن کا بسبب محسن کشی مغلوب۔ اگر وہی فوج باغیہ کسی غنیم کے مقابل ہوتی تو دھوئیں اُڑا دیتی۔ دروغ برگردن راوی کہنے والوں کا بیان تو یہ تھا کہ لشکر سرکاری ڈیرہ خیمہ لے کر علی پور جا اترا تھا اور بہیر روانہ ہو چکی تھی۔ اب جھوٹ سچ کا علم خدا کو ہے۔ سُنی سُنائی بات ہے کوئی دیکھنے تھوڑی ہی گیا تھا۔ قصہ مختصر یہ ہنگامہ جدال و قتال دوپہر سے ۹ بجے رات تک قائم رہا۔ اور باہم جنگ کی آواز آتی رہی۔ پھر وہ صدا آنی موقوف ہو گئی۔ دوسرے روز بارہ بجے دن کے وہ فوج واپس آئی ہے تو اُس کا بیان یہ تھا۔ جو اوپر تحریر ہو چکا دوبارہ اعادہ اُس کا فضول ہے مگر ہم کیا کریں ہمارے پاس میگزین ختم ہو چکا تھا اگر ہم کو میگزین مل جاتا تو ہم تمام رات لڑتے جاتے اور سرکاری لشکر کو

کے پاؤں اکھڑ چکے تھے۔ ہم نے سوار بھیج کر میگزین طلب کیا تھا اور سوار اپنے ہمراہ لے کر چلے تھے کہ دروازہ والوں نے میگزین روک لیا اور کہا کہ اس وقت رات ہے مبادا انگریزی فوج راستہ میں سے تاخت کر کے چھین لے جائے رات بھر ہم سے ہوشیاری کی انگریزی فوج نے ہم پر تین بار حملہ کیا۔ ہم نے تہتاب کا جھالا دے دے کر اُن کو ٹلا دیا تین کارتوس ہمارے پاس گراب کے باقی رہ گئے تھے۔

جرنیل بخت خاں کی آمد

اس معرکہ آرائی کے بعد بخت خاں جرنیل چودہ ہزار کا کمپو اور چند توپ خانے اور دو تین رجمنٹیں سواران کی اور کئی لاکھ روپیہ خزانہ بریلی سے لے کر دہلی میں وارد ہوا۔ اور دوسرا جرنیل مرار کا کمپو لے کر آ پہنچا۔ اُن کے پانچسو ولایتی سرحدی نیلے کپڑے والے دہلی میں آ گھسے اور بدمعاش لوگ سرغنہ بن کر دو دو سو چار چار سو کی جمعیت لے کر شہر میں داخل ہو گئے کیفیت یہ تھی کہ جس وقت باغیہ دھاوا پر جاتی تھی یہ سب بدمعاش ان کے ہمراہ ہوتے تھے اور جو زخمی یا مقتول ہوتا تھا اُس کا سامان روپیہ اشرفی ہتھیار گھوڑا وغیرہ یہ منگوا لیتے تھے مگر شہر کی خلقت میں سے کوئی مسلمان یا ہندو ادنےٰ اعلےٰ تا اوسط کبھی ہمراہ افواج باغیہ دھاوے پر نہیں گیا سوائے ان اجلاف بدمعاشوں کے جو بعض اوّل پوربیوں کو ہمراہ لے کر شہر کو لٹوانے پھرتے تھے۔ اور بنک گھر کا روپیہ خزانہ بخشی خانہ کا جنھوں نے لوٹا تھا اور گھوڑے مول لے کر سواروں میں نوکر ہو گئے تھے بیشتر اُن میں کاغذی محلہ اور کشمیری دروازہ کے اطراف وجوانب کے کنجڑے قصائی۔ کاغذی۔ چوڑ ہے چمار باندی باز پہلوان مثل گامی بدمعاش وغیرہ تھے۔ کوئی شریف نہ تھا بلکہ شرفا وغیرہ نے گھروں سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ خود اپنی مصیبتوں میں گرفتار تھے۔ بادشاہی ملازموں

کا یہ حال تھا کہ جب سے یہ بدمعاش شہر میں داخل ہوئے تھے بیچارے روٹیوں
کو محتاج تھے۔ تنخواہیں بند تھیں، تنخواہ کہاں سے ملتی خود بادشاہ کی تنخواہ بند ہوگئی
تھی۔ لاکھ روپیہ مہینہ بادشاہ کے یہاں انگریزی خزانہ سے آتا تھا جب انگریزی
نہ رہی اور خزانہ بھی لُٹ گیا تو بادشاہ کو تنخواہ کون دیتا اور بادشاہ کے پاس کیا دھرا تھا
کہ وہ نوکروں کو تنخواہ دیتے۔ غرضکہ ایک مصیبت ایک تباہی اور بربادی تھی جن لوگوں
کے گھر میں کچھ اثاث البیت تھا وہ بیچ بیچ کر گزارہ کرتے تھے۔ اور چار چار روپیہ
کے سپاہی فاقے مرتے تھے اس کے علاوہ وہ لوگ کچھ اپنی حرفت و دستکاری
وغیرہ کر لیتے تھے۔ کارخانہ بھی بند تھے۔ کوئی ذریعہ قوت لبسری کا نہ رہا تھا۔ بادشاہ
غریب کا یہ حال تھا کہ حیران پریشان محل میں رہتے تھے۔ باہر برآمد ہونا چھوڑ دیا تھا
ہر وقت مغموم متالم آبدیدہ رہتے تھے۔ گاہ گاہ وقتِ شب تخلیہ میں تسبیح خانہ میں
گھڑی دو گھڑی آ بیٹھا کرتے تھے اور ان نمک حراموں کو برا بھلا کہتے تھے ہم لوگوں
کے واسطے حکم تھا کہ باری باری سے شب کے وقت ڈیوڑھی پر حاضر رہا کرو۔

بادشاہ کے تأثرات ایک رات میں ڈیوڑھی پر موجود تھا پچھلا پہر تھا کہ بیدار
نے محل میں سے آواز دی۔ ہشیار ہوجاؤ۔ ہم لوگ جلدی
سے پگڑیاں سر پر رکھ کر کمریں باندھ کر تیار ہو گئے۔ اس وقت ہم چار پانچ آدمی
حاضر تھے۔ میرزا قیصر شاہزادہ حمید خاں جمعدار خاص برادران میر فتح علی جمعدار کہاران
حسین بخش عرض بیگی کہ بادشاہ برآمد ہوئے۔ ہم سب آداب بجالائے۔ بادشاہ تسبیح
خانے کے سنگ مرمر کے تختہ پر مسند تکیہ پر ہو بیٹھے ایک ستون سے حمید خاں
لگ کر کھڑا ہو گیا اور ایک ستون سے میر فتح علی تخت کے دائیں جانب میرزا قیصر

میں اُن کے برابر میں ہوں اور میری برابر حسین بخش عرض بیگی حضور نے ہم سے مخاطب
ہو کر فرمایا کہ تم جانتے ہو آج کل جو سامان ہو رہا ہے اُس کا انجام کیا ہونا ہے ۔
حمید خاں جمعدار نے ہاتھ باندھ کر عرض کی حضور ڈیڑھ سو برس کے بعد حضور
کا اقبال یاور ہوا ہے گئی ہوئی سلطنت پھر واپس آئی ہے۔ بادشاہ سلامت نے
ارشاد فرمایا تم لوگ نہیں جانتے ہو جو کچھ میں جانتا ہوں۔ مجھ سے سُن لو میرے بگڑنے
کا کوئی سامان نہ تھا۔ یعنی بنائے فساد مال و دولت، خزانہ ملک و سلطنت وغیرہ
ہوا کرتے ہیں۔ میرے پاس ان میں سے ایک موجود نہ تھی ۔ میں تو پہلے ہی فقیر ہوا
بیٹھا تھا۔ مجھ کو کسی سے خصومت کیا تھی یعنی فقیر سے کسی کو کیا رشک و حسد اور
طمع ہو گی ۔ بیت

کس نیاید بخانۂ درویش   کہ خراجِ زمین و باغ بدہ

میں تو ایک گوشۂ ایزدی میں فقیر کا تکیہ بنائے ہوئے چار صورتوں کو ہمراہ لئے
ہوئے بیٹھا روٹی کھاتا تھا میرے بگڑنے کا کوئی سامان نہ تھا اب جو منجانب اللہ
غیب سے میرٹھ میں آگ لگی اور دلی میں آکر بھڑکی، فتنہ برپا ہوا ہے تو معلوم ہوا
فلکِ غدار اور زمانہ ناہنجار کو میرے گھر کی تباہی منظور ہے۔ آج تک سلاطین چغتائی
کا نام چلا آتا تھا اور اب آئندہ کو نام و نشان یک قلم معدوم و نابود ہو جائے گا ۔ یہ
نمک حرام جو اپنے آقاؤں سے منحرف ہو کر یہاں آکر پناہ پذیر ہوئے ہیں۔ کوئی دن
میں ہوا ہوئے جاتے ہیں۔ جب یہ اپنے خاوندوں کے نہ ہوئے تو میرا ساتھ کیا
دینگے ۔ یہ بدمعاش میرا گھر بگاڑنے آئے تھے بگاڑ چلے۔ ان کے جانے کے بعد
انگریز لوگ میرا اور میری اولاد کا سر کاٹ کر قلعہ کے کنگرے پر چڑھا دیں گے ۔

اور تم لوگوں میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑیں گے۔ اور اگر کوئی باقی رہ جائے گا تو آج کا
قول میرا یاد رکھو کہ تم روٹی کا ٹکڑا منہ میں لوگے اور وہ منہ میں سے اُڑ کر دور جا پڑیگا
اور رؤسائے ہند کو لوگ ایسا سمجھیں گے جیسے گاؤں کا ادنٰے آدمی ہوتا ہے۔ یہ سخنانِ
درد انگیز فرما کر پھر محل میں داخل ہو گئے اُس کے پانچ چار روز کے بعد ایک روز کا ذکر
ہے کہ آٹھ بجے دن کے محل میں سے برآمد ہوئے۔ ہوادار پر سوار ہو کر سلیم گڑھ تک
گئے اور واپس آتے تھے۔ اثنار راہ میں حبیب ولی عہد بہادر مرحوم کے باغیچہ کے برابر
آئے تو میں ہوادار کا پایہ پکڑے ہمراہ تھا۔ مجھے ارشاد ہوا کہ میں نے سنا ہے کہ آغا
بیگم بہت گھبراتی ہیں اور اُن کو بہت کرب و اضطراب و قلق ہے اور بہت گریہ
زاری کرتی ہیں تو اُن کے پاس جا اور جو ہدایت کی جائے وہ کلمات حرف بحرف اُن
کے گوش گزار کر۔ اور تجھے اس لئے بھیجتا ہوں کہ تو نے چار برس کی عمر سے محل میں
پرورش پائی ہے۔ تجھ سے کچھ پردہ نہیں تو پردہ کے برابر جا کر سب عرض کر دیجو۔
میں نے دست بستہ عرض کی تو ارشاد ہوا کہ تو کہنا حضور فرماتے ہیں کہ جس قدر
مصائب اور رنج و آلام اور تکالیف ہیں یہ خاصانِ خدا کے واسطے ہوتی آئی ہیں۔
خصوصًا انبیا علیہم السلام اور اولیار اللہ ہمیشہ مصائب میں گرفتار رہے ہیں مگر
اُن مصائب کا خاتمہ جناب سرورِ کائنات کی ذاتِ بابرکات اور اُن کی آل الامجاد پر
ہو گیا۔ اُن کے مصائب پر خیال کرو کہ کیسی کیسی مصیبتیں اٹھانے پر صابر و شاکر رہے
رسول زادیوں سے زیادہ تمہاری عزت و حرمت نہیں۔ تم اُن کے مصائب یاد کر کے
اپنے دل کو تسکین دو۔ اور جو جو مصائب تکالیف وغیرہ گذریں اُس میں صابر و شاکر
رہو۔ میں نے جب یہ کلمات پاس بادشاہ کی زبانی سُنے تو مجھے بے اختیار رقت طاری

ہوئی اور سواری محل میں پہنچا کر میں نواب آغا بیگم صاحبہ صاحبزادی حضور کے در دولت پر گیا۔ خواجہ سرا کی معرفت عرض کرائی کہ خانہ زاد حسب الارشاد فیض بنیاد حضور پُر نور حاضر ہوا ہے اور کچھ حضور سے ارشاد ہوا ہے۔ وہ گذارش کیا چاہتا ہے۔ شاہزادی صاحبہ معظمہ نے محل میں پردہ کرا کے اندر بلوایا اور پردہ کے اندر سے فرمایا کہ حلفیہ بیان کرو۔ کیا ارشاد ہوا ہے۔ میں نے آداب بجا لاکر جو کچھ ارشاد ہوا تھا حرف بحرف بیان کیا۔ شاہزادی صاحبہ نے بعد استماع فرمایا کہ میری جانب سے تو جا کر آداب تسلیمات عرض کرنا کہ آج تک تو مجھے قلق و اضطراب اور فکر آبرریزی اور خیال تباہی اور بربادی تھا مگر اب دل کو تشفی ہو گئی انشاء اللہ حضور کی ہدایت سے سرِ مو تجاوز نہ ہو گا۔ میں نے واپس آکر خواجہ سرا کی معرفت سب کیفیت گذارش کر بھیجی۔ اُسی روز کا ذکر ہے کہ جس وقت سواری واپس آئی تھی۔ جب سواری دیوان عام کے صحن میں محبوب علی خاں کے کمرے کے نیچے پہنچی تھی تو حکیم احسن اللہ خاں بھی ہوادار کے برابر چلے آتے تھے۔ پانچ چار پوربئے آئے اور حکیم احسن اللہ خاں سے انہوں نے کچھ کہا خدا جانے اُنہوں نے کہا جواب دیا کہ اُن میں سے ایک نے بندوق کا پایہ چڑھا کر چاہا کہ بندوق جھونک دے ایک خاص برادر شاہی نے ہاتھ کی ٹھیکی دے کر بندوق کی نال اوپر کو کر دی اور بادشاہ نے ہوادار پر سے ہاتھ بڑھا کر حکیم جی کا سر پکڑ کے ہوادار آگے کر لیا اور اُن نمک حراموں کو برا بھلا کہنا شروع کیا اُس وقت دیوان عام میں سے کُل افسر پوربیوں کے دوڑ آئے اور ہاتھ جوڑنے لگے معذرت کرنے لگے۔ قصہ رفت و گذشت ہوا۔ اس طرح ہم لوگوں سے اور اُن بے تمیزوں سے روز تکرار رہتی تھی۔ ایک دن کا اور ذکر ہے کہ صبح کا وقت تھا دن کے

سات بجے ہیں بادشاہ برآمد ہوئے اور دیوان خاص کے بیچ کے در میں کرسی بچھوا کر
بیٹھے ہیں کچھ تھوڑے سے آدمی اُس وقت موجود ہیں کرسی کے پیچھے دو خواص کھڑے
ہوئے مورچھل جھل رہے ہیں۔ میرے بہنوئی آغا سلطان کرسی کے قریب کھڑے
ہیں اُن کے برابر میں ہوں اور کوئی پانچ چار آدمی ہیں۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک پوربیا
فربہ اندام پستہ قد۔ ادھیڑ پچاس پچپن برس کی عمر منہ پر ڈاڑھی گاڑھے کا کرتہ۔
دھوتی بندھی ہوئی سر پر ایک انگوچھا لپٹا ہوا چندھیا کھلی۔ جال کریچ افسروں کی اُس
کے گلے میں پڑی ہوئی عقب حمام کے چبوترہ کی طرف سے دربار میں آیا اور بادشاہ کو
سلام کر کے پاس چلا آیا۔ میرے بہنوئی نے روکا بھی کہ ہیں ہیں کہاں چلے آتے ہو
مگر وہ کب سنتا تھا۔ پاس آ کر بادشاہ کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا۔ سنو بڈھو ہم نے تمہیں
باسا کیا۔ یہ بات سنکر مجھے تاب نہ رہی اور مارے غصہ کانپنے لگا اور ایک ہاتھ زور
سے اُس کے سینہ پر رکھ کر دھکا دیا۔ اور کہا کہ او بے ادب بے تمیز بادشاہوں کے
دربار میں اس طرح گستاخی کرتے ہیں وہ اُس دھکا دینے سے دو تین قدم پیچھے ہٹ
گیا اور گرتے گرتے سنبھلا اور اُس نے تلوار کے قبضہ پر ہاتھ ڈالا میں نے بھی تلوار
کھینچ لی جس وقت اُس نے قبضہ پر ہاتھ ڈالا ہے تو میری برابر ایک سیّد کالا کا نجف
گڑھ کا رہنے والا میری ہی ہم عمر ہوگا وہ انگریزی رسالہ میں کوئی عہدہ دار تھا۔
میری برابر سے بڑھ کر اُس نے اُس کا گلا اس زور سے دبوچا کہ قریب تھا اُس کی
آنکھیں نکل پڑیں ادھر لوگوں نے مجھے روک لیا میری تلوار آدھی کھینچی پائی تھی
کہ لوگوں نے ہاتھ پکڑ لیا ہیں ہیں جانے دو بادشاہ نے اشارہ کیا پیچھے پو کرسی
کے آجا۔ لوگوں نے اُسے دھکے دے کر دیوان خاص کے باہر کر دیا اور بادشاہ نے

خفا ہو کر مغلظات گالیاں دینی شروع کیں اور حکم دیا کہ محل کی سواریاں کرادو۔ اور
خواجہ صاحب کو چلے چلو۔ قلعہ کو چھوڑ دو اور خود سوار ہو کر جالی کے دروازہ تک پہنچ
گئے تھے مگر اتنے میں سب افسر جمع ہو کر دوڑ آئے اور بادشاہ کی سواری روک لی۔
منت سماجت کی اور اُسے لا کر پاؤں میں ڈالا۔ ہر چند بادشاہ نے چاہا کہ قلعہ سے
چلے جائیں مگر وہ کب جانے دیتے تھے۔ روک لیا۔ ہوادار لوٹا کر تسبیح خانے کو لے
گئے مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ بدبخت جرنیل بخت خاں یہی ہے پیچھے حال کھلا کہ
وہ بریلی والا جرنیل ہی تھا۔ ظاہر تو اُس کا لباس گھس کھدر کا سا تھا میں تو سمجھا
تھا جیسے اور پوربیے سپاہی ہیں یہ بھی کوئی سپاہی ہوگا۔ قصہ مختصر جب سے وہ
فوج لے کر شہر میں وارد ہوا تھا روز کی لڑائی بند ہو گئی تھی جیسے فوج پہلے صبح ہوتے
ہی میدان داری کو تیار ہو کر لڑنے کو چلی جاتی تھی وہ موقوف ہو گئی تھی۔ اُس نے آکر
یہ بات ترک کرادی تھی اس نے کوئی اور تدبیر سوچی تھی۔ غرضکہ بیس روز تک لڑائی بند رہی
مگر شہر پر گولہ باری بدستور تھی۔ شبانہ روز گولہ برستا تھا۔ اس موقعہ پر ایک اور بات بیان
کرنی ضروری ہے اور وہ جو پانچسو ولایتی تھے وہ سب سے زیادہ جلد باز تھے اور وہ
زیادہ فوج کو ورغلاتے تھے اور ترغیب دلا کر جنگ میں لے جایا کرتے تھے اور آگے
فوج کے آپ ہوتے تھے اور ایسے موقع پر لے جا کر کھڑا کر دیتے تھے۔ جہاں گراب اور
باڑھ کی زد ہوتی ہے اور آپ الگ ہو جاتے تھے۔ ایسے ہی ایک بڑھیا عورت تھی کہ
وہ سر کو منڈاسا باندھ کر اور کمر کو دوپٹہ سے کس کر سب سے آگے ہو جاتی تھی اور لوگوں کو
ترغیب دلاتی تھی چلو بیٹا جہاد پر چلو۔ نہ معلوم وہ کٹنی کون تھی۔ روز بازار میں کھڑے ہو کر
لوگوں کو لگا کر لے جاتی تھی اور آپ سب سے آگے ہوتی تھی اور پھر وہ چھپ کر زندہ

سلامت آجاتی تھی۔ اور صدہا آدمیوں کا خون کراتی تھی۔ پھر جب شہر میں فوج داخل ہوئی ہے تو اُس کا پتہ نہ پایا ✦

چوتھی لڑائی

غرضکہ بخت خاں کے آنے کے بعد بیس روز لڑائی بند رہی اور تمام فوج نے اُس کو ملامت کرنی شروع کردی تھی کہ تونے جنگ کو التوا میں ڈال دیا اس کا کیا باعث ہے۔ پھر جب جرنیلوں نے مل کر یہ صلاح ٹھیرائی کہ پہاڑی کے عقب چل کر انگریزی فوج کا محاصرہ کرلو اور ان کی رسد بند کردو چنانچہ اس امر پر سب راضی ہوگئے اور ایک دن بخت خاں اپنے کیمپ کو لے کر روانہ ہوا اور شہر سے چار پانچ کوس کے فاصلہ پر جا کر نہر کے پل کے اُس جانب ڈیرہ ڈالدیا دوسرے روز سدہاری سنگھ اور غوث محمد خاں اپنے کیمپ کو لے کر روانہ ہوئے۔ جب بخت خاں کے کیمپ میں پہنچے تو اُسے بہت برا بھلا کہا کہ تو نہر کے اس پار کیوں ٹھیر گیا اُس پار چل کر ڈیرہ لگانا تھا۔ اگر انگریز لوگ نہر کا پل اُڑا دیں گے تو ہماری آمد و شد بند ہوجائے گی۔ یہ کہہ کر انہوں نے اپنے کیمپ نہر کے پُل کی اُس جانب لے جا کر ڈیرہ ڈالا ہنوز خیمہ قائم نہ ہوا تھا کہ قدرت خدا سے مینہ برسنا شروع ہوگیا اور کس شدت سے پانی برسا کہ العظمۃ للہ۔ تمام جنگل میں پانی پانی ہوگیا اور ایک خرابی اور ہوئی کہ جس موقعہ پر سدہاری سنگھ کے کیمپ کا ڈیرا تھا وہاں نشیب تھا اور جھیل تھی۔ نجف گڈھ کی جھیل مشہور ہے۔ جاپانی ندی کا پانی سب اُس میں آتا ہے۔ اب یہ کیفیت ہوئی کہ توپیں بھی پانی میں غرق اور آدمیوں کے بھی کمر کمر پانی چڑھ گیا اور میگزین کی ہیٹیاں سب دلدل میں پھنس گئیں۔ اُدھر انگریزی فوج نے آگے گولے اور گراب کا مینہ برسانا شروع کر دیا اور میاں بارود کا نہر میں بہا کر نہر کا پُل اُڑا دیا جس سے راستہ بند ہوگیا ادھر

سے بخت خاں کی فوج نے انگریزی فوج پر گولہ باری شروع کردی - دونو طرف کی گولہ باری سدہاری سنگھ اور غوث محمد خاں کے کیمپوں پر ہونے لگی - اب جائیں تو کہاں جائیں بیچ میں نہر حائل ہے جو بھاگ کر آیا نہر میں گرا - غرضکہ ڈیرہ خیمہ میگزین توپیں وغیرہ سب کی سب وہیں رہیں اور ہزار ہا جانیں تلف ہوئیں - تھوڑی سی فوج بچ بچا کر صبح کو دلّی میں پہنچی - اور باقی سب تباہ اور ہلاک ہو کر وہیں غارت ہو گئی - دوسرے روز بخت خاں بھی اپنے کمپو کو واپس لے کر شہر میں داخل ہو گیا ؛

باغیوں کا بارودخانہ اڑگیا

مقام نجف گڑھ کی لڑائی کے بعد پوربیوں کی ہمت شکست ہونی شروع ہو گئی اور وہ جوش و خروش کم ہو گیا اسی اثنا میں ایک ستم اور ہوا کہ چوڑیوالوں کے محلہ میں شمرو کی بیگم کی حویلی میں میگزین تھا اور وہاں بارود تیار ہوا کرتی تھی اور سات سو من بارود روز بنتی تھی - اور خرچ میں آجاتی تھی - ایک دن تیسرے پہر کا وقت ہے دن کے تین بجے ہوں گے کہ یکایک ایک دھماکے کی آواز کان میں آئی مگر دھماکا ایسا ہوا جیسے سو توپ کی برابر اس کی صدا تھی میں اپنے مکان کے دو منزلہ پر چڑھا اور چہار طرف نگاہ کی تو اپنے مکان کی جنوب کی جانب دیکھتا کیا ہوں کہ ایک تنق گرد و غبار اور دھوئیں کا آسمان سے باتیں کرتا ہے معلوم ہوا کہ میگزین اڑ گیا میں نے آدمی کو بھیجا کہ جا کر خبر لاؤ کیا واردات گذری آدمی نے تھوڑی دیر میں آکر خبر دی کہ میگزین میں سات سو آدمی کام کرتے تھے سب کے سب اڑ گئے لاشوں کا ڈھیر پڑا ہے مکان میں آگ لگ رہی ہے - اور کثیر ہجوم خلق اللہ کا ہے - ایک حشر برپا ہو رہا ہے - ہزاروں آدمی واویلا مچا رہے ہیں - جن کے عزیز واقربا بارودخانہ میں کام کرتے تھے یہ معرکہ دیکھا نہیں جا سکتا

تھا۔ یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ میرے پاس عزیز الدین خاں احسن اللہ خاں کے بھانجے
گھبرائے ہوئے منتشر الحواس دوڑے ہوئے آئے۔ اور اُن کے ہمراہ اُن کی گھر کی
سواریاں تھیں۔ خیر سواریاں تو گھر میں اُتروا لیں۔ اور اُن سے تفتیش حال کی کہ خیر
باشد معاملہ کیا ہے۔ اُنھوں نے بیان کیا کہ ادھر تو میگزین اُڑا اُدھر پوربیے حکیم جی
کے گھر پر چڑھ گئے کہ حکیم جی انگریزوں سے سازش رکھتے ہیں اُنھوں نے میگزین
اُڑوا دیا ہے اور جا کر سب اثاث البیت لوٹ لیا۔ حکیم جی گھر پر نہ تھے حضور میں
تھے۔ ورنہ وہ ضرور جان سے مارے جاتے۔ یہ عورتیں غریب اپنی جان بچانے
کو مکان کے عقب میں ایک ہمسائے کے گھر میں کود گئیں تھیں میں وہاں سے
سوار کر کے لایا ہوں +

شب خون

اس واقعہ کو تھوڑے ہی دن نہ گزرے تھے کہ ایک دن یہ معاملہ پیش آیا کہ کشمیری دروازہ کے باہر نصف میل کے فاصلہ پر ایک
زرد کوٹھی پہاڑی کے متصل تھی وہاں پوربیوں نے ایک مورچہ قائم کر رکھا تھا۔
اور وہاں بڑی بڑی توپیں لگا رکھی تھیں اُن توپوں سے انگریزی فوج کو بہت
نقصان پہنچتا تھا۔ اُس مورچے کی حفاظت کے واسطے ہر وقت دو پلٹنیں اور
گولہ انداز وغیرہ موجود رہا کرتے تھے اور دو دوپہر کی نوکری رہا کرتی تھی ایک دن
حسب اتفاق دن کے بارہ بجے سے نصیر آباد والی فوج نے شہر والی فوج سے کہا
کہ بھائیو ذرا ہشیار رہنا رات کا سماں ہے ایسا نہ ہو کہ غنیم اگر چھاپہ مار جائے اور
تم غافل ہو جاؤ اُن بدبختوں نے جواب دیا بھتیّن تم سپاہی ہو ہم سپاہی نہیں۔
غرض ہم تو وہاں سے رخصت ہوئے اور اُنھوں نے مورچہ سنبھال لیا۔ اب اُن کی

کیفیت سنئے کہ انہوں نے بخشی خانہ اور بنک گھر کو لوٹا تھا۔ ان کے پاس اشرفیوں کے ڈھیر تھے۔ وہ دن بھر بھنگیں پیتے تھے اور قلاقند، پیڑے، لڈو اڑاتے تھے۔ وہ جو وہاں پہنچے اوّل اوّل تو ہوشیار رہے جب پھر رات آئی اور ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تو وہ پہلے ہی سبزی کے گھوڑوں پر سوار تھے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اُن پر اور تازیانہ ہو گئے اور طرہ طراروں کے سرور موجیں دکھانے لگے۔ یادپایانِ فلک سیر پہ سوار ہو کر وادیٔ عدم کو تیار ہو گئے اور بندوقوں کے کوٹ لگا کر دھوتیاں بچھا بچھا کر بسترِ مرگ پر دراز ہو گئے۔

دوہا

بھنگ ایسی پیجئے جیسے کنج پورہ کی کیچ   گھر کے جانیں مر گئے اور آپ نشہ کے بیچ

اب یہ تو خوابِ خرگوش میں پڑے ہوئے خراٹے لے رہے ہیں اور ادھر مخبر نے جا کر انگریزی فوج کے جرنیل کو خبر دی کہ اس وقت باغی لوگ سب بے خبر پڑے سوتے ہیں، مورچا سونا پڑا ہے۔ یہ وقت شبخون مارنے کا ہے۔ وہاں سے افسرانِ فوج وہ پلٹنیں دو گورکھیوں کی اور ایک پلٹن مجوی اور ایک پلٹن گورہ لے کر ننگے پاؤں پہاڑی پر سے اُترے اور آہستہ آہستہ دبے پاؤں آ کر پہلے تو بندوقیں اٹھا لیں پھر توپوں پر قبضہ کر کے ان خفتہ بختوں کو بیدار کیا اور کہنا شروع کیا کہ اٹھو بھائی دیندار و گورے لوگ آ گئے۔ ایک جو آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا گورکھے نے کھکری مار کر سر اڑا دیا۔ اب کھکری اور تلوار چلنی شروع ہوئی۔ ایک غل ہا ہو کا بلند تھا۔ جتنے مارے گئے مارے گئے۔ باقی بدحواس بھاگ کر شہر کی جانب روانہ ہوئے۔ اِدھر کی کیفیت تھی کہ وہ جو نصیر آباد کی پلٹنیں پہرہ بدلوا کر ان اجل رسیدگان سے آئی تھیں بنظرِ احتیاط وہ شہر میں داخل ہوتی تھیں کہ شب کو دروازہ شہر کھلوانا منا سب

انہیں وہ کشمیری دروازے کے باہر متصل کی بھڑی پر سب لیٹے ہوئے کریں سیدھے
کرتے تھے اور یہ بھاگے ناٹے اُن کے پاس پہنچے انہوں نے اُن کو لعنت و ملامت
کے بعد کہا کہ تم ہمارے پیچھے آجاؤ۔ اور بندوقیں بھر کر خاموش لیٹ گئے۔ اسی اثنا
میں انگریزی فوج اُن کا پیچھا دبائے ہوئے پہنچی کہ اُن کے ساتھ ہی دروازہ کی راہ
سے شہر میں داخل ہو جانا چاہئے۔ بےخبر سنگینیں باندھے چلے آتے تھے۔ جب یہ
بندوق کی زد پر آپہنچے تو یک بارگی انہوں نے باڑھ ماردی اور کشمیری دروازہ
کے گولہ اندازوں نے جو یہ دیکھا کہ شہر کی ڈنڈی کے نیچے ہی لڑائی ہو رہی تھی۔
انہوں نے اوپر سے گراب مارا۔ ادھر سیاہ برج والوں نے توپیں بھر کر اندھادھند گراب
برسانے شروع کر دیئے۔ اُس وقت یہ نوبت ہو گئی کہ خدا دے اور بندہ لے۔ تعاقب
کنندگان کو جان بچانی مشکل ہو گئی۔ وہ ہی مثل ہو گئی اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے لاش
پر لاش پڑ گئی۔ کُشتوں کے پُشتے لگ گئے۔ بھاگے اُلٹے پاؤں اور جا کر مورچہ پر دم لیا
اور اُسی زرد کوٹھی کے مورچے کی توپیں دروازہ شہر کی جانب پھیر کر اندھادھند
اُنہوں نے فیر کرنے شروع کر دیئے۔ رات بھر ہنگامہ گیر و دار گرم رہا۔ دونوں طرف سے
توپ بندوق چلتی رہی مگر وہ مورچہ کالوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اور گورے اُس پر قابض
ہو گئے اور باہر سے امداد پہنچ گئی۔ آمنے سامنے کی لڑائی ہو گئی اور اس جنگ میں
ایک فتنہ اور برپا ہو گیا کہ افواج انگریزی کا ایک افسر کلاں مارا گیا اور اس کی لاش وقتِ
شب بیچ میں دونوں مورچوں کے پڑی رہ گئی۔ صبح کو اُس لاش کے اٹھانے کی دونو
طرف سے کد و کاوش ہو رہی ہے اور باہم بندوق اور توپ خوب زور شور سے چل رہی ہے
اور ادھر پوربیوں کو یہ طمع دامنگیر ہے کہ اس کے ہتھیار اور رجال کمرچ عمدہ اور

نایاب ہیں۔ کسی طرح یہ ہاتھ لگیں۔ وہ لاش عین کشمیری دروازہ کے کھوکن کے سامنے ہی تھوڑے سے فاصلہ پر پڑی تھی۔ اُس لاش پر ڈیڑھ دن تک لڑائی رہی۔ کیونکہ وہ دونوں جانب کے گراب کی زد پر تھی۔ شبانہ روز برابر بندوق چلتی رہی۔ ہزار دل آدمیوں کا طرفین سے کُشت و خون ہو گیا۔ آخر وقتِ شب ایک پوربئے نے کیا حکمت کی کہ زمین میں لوٹتا لوٹتا اُس کے پاس پہنچ گیا اور اُس کے پاؤں میں اپنی پگڑی کا سرا باندھ دیا اور اُسی طرح لوٹتا ہوا واپس چلا آیا اور وہاں سے اس لاش کو آہستہ آہستہ کھینچ لیا۔ تمنچہ کی جوڑی۔ جال کرچ اور جو کچھ سامان وغیرہ تھا وہ سب اتار لیا۔ اور لاش کو اسی طرح چھوڑ دیا۔ صبح جب اُس طرف والوں نے لاش کو نہ دیکھا تو لڑائی موقوف ہوئی وہ پوربیا اُس لاش کے ہتیار لے کر قلعہ میں آیا اور ہتیار سب کو دکھائے اور خانساماں کے مکان میں وہ لے کر آیا۔ احسن اللہ خاں کو دکھائے کہ ان ہتیار دل کی بابت دو دن لڑائی رہی۔ میں نے بھی بچشم خود دیکھے تھے تمنچہ کی جوڑی تو خیر اچھی تھی مگر کرچ لاجواب تھی۔ اُس کے قبضہ پر سنہری ملمع تھا اور تلوار کا پھل سیہ تاب دیا ہوا تھا۔ اُس کی رنگت بالکل طاؤس کی گردن کی سی تھی اور سنہری حرفوں سے کچھ لکھا ہوا تھا اور سنہری کام تھا۔

سیاہ برج کا نیا مورچہ

اس لڑائی کے بعد فوج انگریزی نے یہ کام کیا کہ جو مورچہ اُن سے چھینا تھا۔ اُس کو خوب مستحکم کیا۔ اور وہاں پڑاو ڈال دیا اور رفتہ رفتہ شہر کی جانب مورچہ بڑھانا شروع کیا ہر روز دروازہ کے باہر جو چند قدم پر سڑک تھی وہ کابلی دروازہ سے موڑ کھا کر کشمیری دروازہ کو جاتی تھی۔ اس سڑک سے پرے چند قدم کے فاصلہ پر ایک نشیب تھا اور نالہ تھا۔ وہاں

لکڑی والے کی ٹال تھی۔ وہیں بلیاں اور چھتوں وغیرہ کی کڑیوں کا انبار پڑا رہتا تھا اور وہ بدررو دروازے کے سیاہ برج کے مقابل میں تھی۔ اور وہ جائے شاید برج سے دو تین قدم کے فاصلہ پر ہو گی۔ ایک شب انگریزی فوج نے یہ کام کیا کہ اُس ٹال میں آگ لگا دی اور لکڑیوں کو سلگا دیا اور اس کا دھواں اُٹھنا شروع ہوا۔ اور اُس دھوئیں کی اوٹ میں مورچہ باندھنے شروع کیے۔ سیاہ برج والے حیران تھے کہ یہ دھواں اُٹھ رہا ہے اور کچھ حال نہ معلوم ہوا وہ جائے عین سیاہ برج کے نیچے گراب کی زد پر تھی۔ یہ مورچہ کیونکر باندھنے دیتے۔ غرضکہ جب مورچہ تیار ہو گیا تو چالیس توپیں قلعہ شکن اُس میں لا کر لگا دیں اور ایک بار گی اُن چالیس توپ کا ایک فیر سیاہ برج پر کیا اور اُن توپوں کی برابر سیاہ برج پر باڑھ جھاڑنی شروع کر دی اس وقت سیاہ برج والوں کی آنکھیں کھلیں۔ اب کیا ہو سکتا تھا ہر چند ہاتھ پاؤں مارے گراب پر لائے کیا ہوتا ہے اُدھر سے برابر توپ کی باڑ پڑ رہی تھی۔ اب یہ کیفیت ہو گئی کہ جو سیاہ برج کی زدوں کی جھانکیاں اور پشتے روک لئے تھے جس کی پناہ میں کھڑے ہو کر توپ لگاتے تھے۔ وہ گرنے شروع ہو گئے اور توپوں پر گولہ پڑنے لگا اور سیاہ برج پر ٹھہرا رہنا مشکل ہو گیا۔ انجام یہ ہوا کہ اُس کا عملہ سب کھائی میں گر گیا۔ آٹھ دن تک یہ گولہ باری شبانہ روز جاری رہی۔ آخر آٹھویں روز جب سپاہ انگریزی نے دیکھ لیا کہ سیاہ برج خالی پڑا ہے۔ اور کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے اور سیاہ برج شکستہ پر سے اچھی طرح آدمی چڑھ سکتے ہیں تو چار گھڑی رات پچھلے سے تمام فوج انگریزی پہاڑی سے اُتر کر میر حسن کے کھنڈرات میں آ گئی اور کابلی دروازہ کے اُس جانب لا کر توپخانے لگا دیئے۔ اس طرف سے بھی تمام فوج باغیہ کل سوار پیدل توپ خانے لے کر مقابل ہوئی۔

یہ لاہوری دروازہ سے لگاکر کابلی دروازہ کی نہر تک تمام تیلی واڑہ کے میدان میں پھیلی ہوئی ترمن تھی اور انگریزی فوج کے اور اُس کے درمیان میں فقط ایک نہر حائل تھی۔ اور برابر دونو طرف سے بندوق کی باڑ جھڑ رہی تھی اور پہاڑی کے مورچوں کی توپیں اور دستی توپ خانے دغ رہے تھے علیٰ ہذا القیاس پوربیوں کی طرف سے لاہوری دروازہ کے برج کی توپیں۔ گھوڑ چڑھی اور بیل باتری توپ خانے سب چل رہے تھے۔ گولہ گراب اور باڑوں کا دونوں طرف سے مینہ برس رہا تھا اُس دن شہر کی زمین اور مکانات اور سب دیوار و در لرز رہے تھے۔ بندوقوں کی باڑیں متصل جاری تھیں۔ لڑائی کیا قیامت کے آثار نمودار تھے اور مصداق اذا زلزلت الارض زلزالہا کا آشکار تھا خدا جانے طرفین سے تین سو توپ چل رہی تھی یا چار سو توپ کی باڑھ جھڑ رہی تھی۔ اس کا علم خدا کو ہے۔ غرضکہ یہ کیفیت صبح کے پانچ بجے سے شروع ہوئی تھی اور دس بجے تک یہ قیامت برپا رہی۔ آٹھ بجے دن کے میں پانچ چھ آدمی لے کر قلعہ کو جانے لگا تو دیکھا کہ کوچہ بندی کے پھاٹک سب بند ہیں۔ دروازوں کو قفل لگے ہوئے ہیں مگر کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں میں چھوٹے دریبے کے پھاٹک سے باہر نکل کر چلنے لگا تو دیکھا دو چار آدمی اُدھر سے واپس آتے ہیں ان میں ایک بادشاہی دربان بھی ہے اُس نے مجھ سے پوچھا کہاں جاتے ہو میں نے کہا قلعہ کو اُس نے مجھے منع کیا کہ نہ جاؤ قلعہ کا دروازہ بند ہے۔ میں واپس آیا ہوں۔ اُس وقت بازار کی سب دُکانیں بند تھیں اور ایک دو آدمی چلتے پھرتے تھے۔ میرے جی میں آئی کہ تم تو چل کر دیکھو کیا معاملہ ہے جب قریب دروازہ پہنچا دیکھا دروازہ بند ہے اور قفل لگا ہوا ہے اور دروازہ کے سامنے ایک توپ لگی ہوئی ہے کچھ آدمی دروازہ کے پیچھے کھڑے ہوئے ہیں اور دیوار کے اوپر ایک جھولدار کھڑا

ہئوا لڑائی کا حال بیان کر رہا ہے اور لوگ سُن رہے ہیں۔ اسی اثنا میں ایک رجمنٹ
سواروں کی قلعہ کی جانب سے آئی اور اُنہوں نے دروازے والوں سے کہا کہ تم دروازہ
کھول دو ہم باہر جائیں۔ دروازہ والوں نے دروازہ نہ کھولا اور جوالادنے ادھر سے
بیان کیا کہ تم لوگ کشمیری دروازہ کو جاؤ۔ اُدھر کی طرف غلبہ بہت ہے اور الیوہ تمہارے
ہاں کے سواروں نے دھاوا کر دیا مٹھائی کے پُل پر سے اُس جانب چلے جا رہے ہیں
اور انگریزی سپاہ کشمیری دروازہ کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔ تو اُن سواروں نے لاہوری
دروازہ کی ڈنڈی کے پیچھے پیچھے جو راستہ کابلی دروازہ کو جاتا تھا۔ اُدھر کو گھوڑے
دوڑا دیئے۔ میں نے اپنے گھر کا رُخ کیا جب میں بھوانی شنکر کے چھتے کے پاس پہنچا
تو میں نے دیکھا کہ پوربیئے بے تحاشا بھوانی شنکر کے چھتے میں سے بھاگے چلے آتے
ہیں اُس وقت بہت سے آدمی بازار میں تھے۔ اُنہوں نے اُن کو روکا کہ ہیں تم ہم کو
لڑوا کر کہاں جاتے ہو تو اُنہوں نے بندوقیں اور توشہ دان پھینک کر جواب دیا کہ بھیئی ہم
تو لڑ چکے اب تم ہی لڑو اور بندوقیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ جب یہ حال لوگوں نے دیکھا تو سب اپنے
اپنے گھر کو روانہ ہوئے۔ میں قدم اُٹھا کر بلی ماروں کے پھاٹک پر پہنچا تو دروازہ بند پایا۔ دوڑ کر
چھوٹے دریبے کے پھاٹک تک پہنچا۔ یارے وہ دروازہ بند تھا اور کھڑکی کھُلی ہوئی تھی۔ اُس
وقت ایک تماشا اور نظر آیا۔ جب میں کھڑکی کے پاس پہنچا ہوں تو سامنے کوتوالی کے
آگے سے ایک بندوقوں کی باڑھ مجھ پر پڑی اور گولیاں آ کر سڑک کی نالیوں کے پتھروں پر
پہنچیں جس طرح زمین پر اولے گرتے ہیں۔ میں نے سامنے دیکھا تو انگریزی فوج کا ایک
بٹن کوتوالی کے آگے موجود کھڑا تھا۔ میرے ہمراہیوں میں سے ایک شخص نے کہا کہ میرے
گولی لگی ہے میں نے کہا کہ آؤ چلے آؤ۔ گھر چل کر دیکھیں گے اور جلدی سے کھڑکی

میں داخل ہو کر اُس شخص کو کھینچ کر کھڑکی کے اندر لے لیا۔ سب ہمراہی جب اندر آ گئے تو کھڑکی بند کر دی اور قدم اٹھا کر گھر کا راستہ لیا اور بھاگ کر گھر پر پہنچا۔ وہاں جا کر اُس سے دریافت کیا کہ تیرے گولی کہاں لگی ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ شکم میں اور اپنی کمر کھولی تو کھٹ سے گولی تخت پر گری۔ اس کو اٹھا کر دیکھا تو لمبی اور نیچے سے خالی چھالیا کی ڈلی کی صورت کی تھی۔ اس شخص کے گلے میں ایک چار انگل لمبا چوڑا چمڑا تھا۔ چمڑے کو جلایا۔ نیچے کا موم جامہ پھونکا اور تعویذ کے کاغذ پر جا کر رک گئی۔ اُس کے پیٹ پر بالشت بھر چوڑا چکلا گول سرخ نشان پڑ گیا تھا۔ اب میں اپنے دیوان خانہ کے اندر اس فکر میں مشوش بیٹھا ہوں کہ تو نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا کہ انگریزوں کی فوج شہر میں داخل ہو گئی اور پوربئے شہر میں سے بھاگ گئے۔ اب سپاہِ انگریزی گھروں میں آ کر قتل و قمع کرے گی۔ قضا آ پہنچی۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ مگر میں نے ابھی گھر میں اپنی والدہ سے یہ خبر بیان نہیں کی کہ گھر والے مضطرب ہوں گے۔ بیٹھا ہوا اللہ اللہ کر رہا ہوں۔ ایک ڈیڑھ گھڑی کا عرصہ گزرا ہے کہ یکایک توپ کی صدا میرے کان میں آئی۔ اور اتنی قریب معلوم ہوتی گویا اس محلّہ میں چل رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک اور آواز آئی۔ جب تو مجھے حیرت ہوئی کہ محلّے میں توپ کہاں سے آ گئی۔ پھر میں دو تین آدمیوں کو ہمراہ لے کر گھر سے باہر نکلا۔ محلّے میں جو شاہراہ تھی وہاں پہنچا تو دیکھا کہ آدمیوں کی آمد و رفت برابر ہے۔ آنے جانے والوں سے پوچھا کہ بھئی کیا ہوا۔ انگریزی فوج کہاں گئی۔ اُنہوں نے بیان کیا کہ لوگوں نے ان کو مار کر بھگا دیا اور شہر میں بلوہ ہو گیا۔ پھر میں وہاں سے پراڈری کے بازار میں جا پہنچا تو دیکھا کہ واقعی ہزار دل آدمی۔ لاٹھی، پونگا، تلوار، گنڈاسا وغیرہ لئے ہوئے شہر میں پھرتے ہیں۔ غرضکہ جامع مسجد کے

نیچے ہو کر گلیوں کے بازار میں پہنچا۔ تو وہاں عجیب تماشا نظر آیا۔ لاشوں کا ایک ایسا انبار تھا جیسے لکڑیوں کی ٹال لگی ہوتی ہے اور یہ وہ موقع ہے جہاں ایک بار مجھے ایک مست درویش مجذوب نے نشان دہی کی تھی۔ کہ اس جگہ کُشت و خون ہوگا اور چار مہینے پہلے زمانہ غدر سے ان بزرگوار نے یہ پیشینگوئی کی تھی، اب سُنیئے میں وہاں سے آگے بڑھا تو چند قدم پر اور لاشیں پڑی ہوئی نظر آئیں۔ بازار کے لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ ماجرا کیونکر ہوا۔ لوگوں نے بیان کیا کہ ایک بڑی انگریزی فوج کا مسجد کی سیڑھیوں تک آپہنچا تھا۔ اور کچھ لوگ فوج کے رعایا کے گھروں میں گھس کر لوٹ مار کرنے لگے اِدھر فوجیوں نے یہ چاہا کہ جامع مسجد میں داخل ہو جائیں مسجد میں جو مسلمان مسافر جمع تھے اُنہوں نے دیکھا کہ اب یہ خدا کے گھر میں آکر کُشت و خون کرینگے۔ آؤ بہتر تو یہ ہے کہ مسجد سے نیچے اُتر کر ان سے سمجھ لیں یہ کہہ کر وہ مسجد کے دروازہ سے باہر نکل کر سیڑھیوں پر سے اُترنے لگے۔ فوج والوں نے ان پر بندوقیں سر کیں۔ مگر جو زندہ رہے وہ سامنے چلے اور باہم جنگ مغلوبہ دست بدست ہونے لگی۔ ایک غل شور برپا اور ریلوہ ہو گیا۔ لوگ گھروں میں سے لکڑیاں، پلنگ کی پٹیاں تلواریں لے لے کر دوڑ پڑے اُس پلٹن میں سے کچھ مارے گئے۔ جن کی لاشیں موجود ہیں اور باقی بھاگ کر اپنے لشکر کو چلے گئے۔ میں یہ تماشا دیکھتا ہوا بڑے دریبے میں ہو کر خونی دروازہ سے نکل کر کوتوالی کے آگے پہنچا۔ میں نے جامع مسجد سے لگا کر کوتوالی تک لاشیں برابر پڑی دیکھیں اور جس جائے سے کہ پہلے مجھ پر بندوقوں کی باڑ پڑی تھی، کئی لاشیں وہاں بھی نظر آئیں اور ایک ٹین کی بھبکی گراب کی کوتوالی کے حوض کے آگے پڑی دیکھی وہاں سے آگے بڑھ کر جب میں چھوٹے دریبے کے پھاٹک پر پہنچا ہوں تو میں نے دیکھا

کہ پیپل کے پیڑ کے نیچے ایک توپ کھڑی ہوئی ہے اور کوئی گولہ انداز وغیرہ وہاں نہیں
اُس وقت مجھ کو یقین ہوا کہ یہ توپ وہی ہے جس کی صدا تیرے کان میں پہنچی تھی۔ حسبِ
تحقیق واضح ہوا کہ کچھ آدمی اس توپ کو لاہوری دروازہ سے کھینچ کر لائے اور یہاں قائم
کر کے انہوں نے انگریزی فوج پر گراب مارا اور اس سے افواجِ انگریزی کو جو کوتوالی کے
آگے کھڑی تھی نقصان پہنچا۔ کچھ آدمی زخمی ہوئے اور کچھ ہلاک۔ جب دوبارہ گراب
مارا ہے اور اُس سے زیادہ نفوس تلف ہونے لگے تو اُن لوگوں کے پاؤں اکھڑ گئے اُدھر
والے کشمیری دروازہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے جب یہ کیفیت ملاحظہ کر لی تو چھوٹے
دریبے میں ہو کر اپنے مکان کو چلا آیا۔ سنا جاتا ہے کہ پل والے لوگوں نے کشمیری دروازہ
اور کچہری میں جا کر پناہ لی۔ شام تک مردمانِ بلوائی تمام شہر میں بلکہ حامد علی خاں کی کوٹھی
تک پہنچ گئے تھے۔ آگے افواجِ انگریزی نے توپیں لگا رکھی تھیں۔ یہ جن کے پاس توپ
کیا بندوق تک نہیں آگے کیونکر جا سکتے تھے۔ غرض شہر میں شام تک یہ آتشِ فتنہ وفساد
مشتعل رہی۔ شام بھگی بھگائی خلقت اپنے اپنے گھروں میں آ کر پڑ رہی۔ آدھی رات
کے وقت سپاہ انگریزی نے یکایک کشت وخون کرنا شروع کیا۔ اور سوتے آدمیوں کو
گھروں میں گھس کر اور سیڑھیوں کے ذریعہ کوٹھوں پر چڑھ کر ہلاک کرنے لگے۔ صبح
کے وقت کشمیری دروازہ کے قرب وجوار اور بدرو دروازہ اور کابلی دروازہ وغیرہ کی
خلقت اور پھوٹک کے پھاٹک کے لوگ بھاگ کر شہر کے اس جانب چلے آئے۔

بادشاہ ہمایوں کے مقبرے میں

اور مفصل کیفیت داخلہ سپاہ انگریزی کی اس طور پر ہے کہ جس وقت اُس حوالدار نے جو لاہوری دروازہ پر کھڑا ہوا بتا رہا تھا کہ انگریزی فوج کشمیری دروازہ کی طرف

بڑھی ہے۔ تو در اصل اُس وقت فوج نے یورش کی تھی اور سیاہ برج کو خالی پاکر کہ وہاں
کوئی آدمی نہ تھا کہ اُس یورش کو روکتا یہ کھائی میں سے اُتر کر سیاہ برج پر سیڑھی لگا
کر چڑھ گئے۔ جب سیاہ برج پر چڑھ گئے ہیں تو جانبین کی ڈنڈی پر جو پوربیوں کی
فوج کھڑی تھی۔ وہ وہاں سے کود کود کر بھاگ نکلی اور کابلی دروازہ سے لگا کے کشمیری
دروازہ اور بکہ پور گھاٹ تک سب میدان اور شہر پناہ کا ڈنڈا خالی ہوگیا۔ جتنے کہ
لاہوری دروازہ تک کے ڈنڈے والے اور برج کے گولہ انداز ڈنڈی پر سے اُتر کر
فرار ہوگئے اور باہر شہر کے جس قدر کالوں کی فوج تھی سب باہر کی باہر رہ گئی اور باقی
شہر کے ڈنڈے والے بھی بھاگ کر شہر کے باہر کی فوج میں جا ملے۔ اور انگریزی فوج
شہر میں داخل ہوگئی۔ باہر والے باہر رہ گئے۔ اب شہر میں سوائے رعیت کے پوربیا نام
کو نہ رہا۔ سب فوجی اجمیری دروازہ شہر سے لگا کر دلی دروازہ کے باہر تک جا پڑے
اور تمام میدان پہاڑ گنج سے لے کر جیل خانے والے دروازہ تک جا کر گھیر لیا اب
شہر میں دن کو تو شہر کے آدمی پھرتے چلتے ہیں اور مارنے مرنے پر آمادہ ہیں اور شب
کو سپاہ انگریزی نکل کر گھروں میں قتل کر جاتی ہے۔ اب شہر کی یہ کیفیت ہے کہ
دوکانیں سب بند اور رسد آنی بند۔ دانہ پانی خلقت پر حرام ہوگئے بھوکے پیاسے
مرنے تین روز تک یہی کیفیت رہی۔ آخر تیسرے روز شام کے وقت بادشاہ قلعہ
سے نکل کر ہمایوں کے مقبرہ پر پہنچے اور رعیت بھی سراسیمہ حیران و پریشان ہو کر
شب کے وقت سب گھر بار اثاث البیت جوں کا توں گھروں میں چھوڑ کر اپنے بال
بچوں عورات وغیرہ کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر شہر سے نکلنی شروع ہوگئی۔ غرضکہ اُس وقت وہ
قیامت عظیم برپا ہوئی کہ بیان نہیں ہو سکتی۔

نکلنا شہر سے خلقت کا بے سر و ساماں ۔ وہ جانا پردہ نشینوں کا با سرِ عُریاں
وہ چاک چاک گریباں لگا کے تا داماں ۔ وہ دار و گیر سپاہ شریر و بے ایماں

درازدستیِ تطاول ستم شعاروں کا!
فلک کو پاس سے تکنا جفا کے ماروں کا

نکلتے شہر سے ہیں پر نکل نہیں سکتے ۔ ہزار چال سے چلتے ہیں چل نہیں سکتے
کرو ڈ شکل کو بدلیں بدل نہیں سکتے ۔ قدم قدم پہ ہے لغزش سنبھل نہیں سکتے

کمندِ موت نے کیا بند بند جکڑے ہیں
زمینِ شہر نے اک اک کے پاؤں پکڑے ہیں

غرض کہ اس وقت خلقت کا اضطراب اور خرابی پریشانی اور بے سر و سامانی اور مستورات پردہ نشین جنہوں نے عمر بھر کبھی ایک قدم باہر نہیں رکھا تھا اُن کا گھبراہٹ میں سر و پا برہنہ نکلنا اور بچوں کی واویلا کا شور اور گھبراہٹ کا حال دیکھنے سے کلیجے کے ٹکڑے ہوئے جاتے تھے جس شخص کی نظر سے وہ معرکہ گزرا ہے کچھ وہی خوب جانتا ہے۔

یہ وہ الم ہے کہ اس غم سے سب ہلاک ہوئے ۔ لگا کے چرخ سے سینے تلک تا سماک ہوئے
ہلاک گور میں آسودگانِ خاک ہوئے ۔ کفن بھی ساتھ گریباں کے چاک چاک ہوئے

نہ روزِ حشر سے کم تھی عذاب کی صورت
خدا دکھائے نہ اس انقلاب کی صورت

شہر خالی ہونے لگا

غرضکہ جب شام کو بادشاہ قلعہ سے نکل کر ہمایوں کے مقبرہ پہنچے ہیں چار گھڑی رات گئے نواب حامد علیخاں

صاحب کا آدمی میرے والد کے پاس آیا اور اُس نے آکر کہا کہ آپ گھر میں کیا بیفکر بیٹھے ہیں بادشاہ تو قلعہ سے سوار ہو گئے اور رعیت سب نکل رہی ہے۔ خدا کے لیے چھوڑو گھر بار کو اور بال بچوں کو لے کر شہر سے نکلو۔ دیکھتے نہیں کہ شہر قتل ہو رہا ہے اور میں تو اب اہل وعیال کو ہمراہ لے کر شہر سے نکلتا ہوں۔ میرے گھر کی سواریوں کے ہمراہ مستورات کو سوار کر دو۔ نواب حامد علی خاں صاحب کا مکان کشمیری دروازہ سے متصل تھا۔ مگر وہ ایک مہینہ پیشتر ہمارے محلہ میں ایک مکان کرایہ پر لے کر رہے تھے غرضکہ اُس گھبراہٹ اور اضطراب میں جو لباس کہ جس شخص کے بدن پر تھا اُسی طرح پہنے ہوئے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ میری والدہ نے تو اُس سراسیمگی میں گھر میں سے ایک چھلّہ تک نہ لیا۔ الّا میری اہلِ خانہ نے یہ کام کر رکھا تھا کہ اپنے جہیز کے جوڑے جو قریب ڈیڑھ ہزار کی مالیت کے ہوں گے اور زیور کی چھوٹی سی پٹاری علاوہ اُس کے سوار ہوتے وقت اپنے پاس رکھ لی اُس کی صورت یہ کی تھی کہ ایک تو شک سی کر اُس میں بھر دیئے۔ اور ایک گاؤ تکیہ سی لیا تھا۔ اُس میں وہ لباس تھا وہ رتھ میں تو شک بچھا دی اور تکیہ رکھ دیا۔ غرضکہ میں اور میرے والد اور میری والدہ اور میرے سب چھوٹے بہن بھائی اور نواب حامد علی خاں کی سب زنانی سواریاں سوار ہو کر مٹیا محل میرے سسرال میں پہنچے اور وہاں جا کر میری دیا خوشدامن یعنی بڑی بیگم صاحبہ جاگیردار مواضعات صدپور رئیس پور سے جا کر نواب حامد علیخاں صاحب کی بیوی اور میری والدہ نے کہا کہ بیگم صاحبہ بیٹھی کیا ہو جلدی سوار ہو اور اپنے بال بچوں کو لے کر نکلو۔ یہ وقت گھر میں بیٹھنے کا نہیں ہے۔ ہم تم کو سوار کرانے کو آئے ہیں۔ غرضکہ وہ بھی راضی ہو گئیں اور باہر میں نے خسر نواب امیر مرزا خاں صاحب کی منتیں کیں کہ خدا کے واسطے آپ ہمارے ساتھ نکل چلیئے

بہر حال اُسی وقت سواریوں کا بندوبست کر کے قریب ایک بجے رات کے میری خوشدامن اور سب بال بچے سوار ہو کر ٹمیا محل کے پھاٹک پر پہنچے میرے خسر کی گود میں میرا چھوٹا سالا کاظم مرزا تھا میں اور وہ ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے باتیں کرتے مٹیا محل کے دروازہ میں پہنچے کہ ایک بلائے ناگہانی کا سامنا ہوا۔ مٹیا محل کے عین دروازہ کے پہلو کی چوکی پر کلو نامی ایک دیوانی مجذوبہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس بدبخت نے جو میرے خسر کی شکل دیکھی تو یکایک گھبرا کر بہ آواز بلند پکار اُٹھی کہ ہیں میاں امیر میرزا تم کہاں جاتے ہو۔ تمہارے واسطے تو خدا کا حکم نہیں ہے تم کیا بھول گئے۔ وہاں اُس کے منہ سے تو یہ بات نکلی تھی۔ اور یہاں امیر میرزا صاحب کے قدم زمین نے پکڑ لیئے۔ اور کلو سے کہا کہ بلا شک مجھ سے سہو ہوا۔ اُسی وقت گاڑی بان کو حکم ہوا کہ سواریاں گھر کو واپس لے چل۔ ہر چند میں نے قدموں پر سر رکھا اور سب ہمراہیوں نے منتیں کیں مگر ایک کی نہ سُنی سب نے سمجھایا کہ خدا کے لیئے اس پچاس آدمی کے کنبہ پر رحم کرو اور ساتھ چلے چلو وہ یہی فرمانے لگے کہ حکم خدا نہیں ہے۔ اُس وقت اور ایک غضب یہ ہوا کہ میاں ناصرالدین صاحب اُن کے چھوٹے خالہ زاد بھائی پہنچے انھوں نے جا کر کہا کہ بھائی صاحب اُلٹے چلیئے۔ چلو میرے گھر میں وہ جو تین یورپین عورتیں چھپی ہوئی ہیں وہ کہتی ہیں کہ وہ کیوں جاتے ہیں۔ اُن کو کیا خوف و خطر ہے۔ ہم انگریزوں سے کہہ سُن کر تمہارے گھر کو بچالیں گے۔ یہ اور ان کو تقویت ہو گئی اور مجھ سے کہا کہ بیٹا تم جاؤ میرا قدم آگے نہیں اُٹھتا۔ غرضکہ مجبور میں تو اپنے یہاں کی سواریوں کو لے کر روانہ ہوا اور وہ معہ اہل و عیال گھر کو واپس چلے گئے میں نے اپنی ماں بہنوں اور نواب حامد علیخاں صاحب کے قبائل کو دہلی دروازہ اپنی حقیقی نانی کے مکان پر پہنچایا۔ اُس وقت رات کے دو بج چکے تھے وہاں اور کنبہ

والے بھی جمع تھے۔ حکیم مومن علی خاں صاحب کی حویلی میں دو سو زن و مرد فراہم تھے۔ غرضکہ صبح ہوئی اور شہر سے نکلنے کی تیاری ہوئی تو میری بی بی میرے ہمراہ نہ آئی تھی وہ اپنے ماں باپ کے ہمراہ واپس چلی گئیں تھیں میں نے اپنے چھوٹے بھائی امراؤ مرزا کو بھیجا اور کہلا بھیجا کہ اگر آپ کو میرے ساتھ کرنا ہے تو میرے ساتھ کر دیجئے جو میرا حال ہو وہ میری بیوی کا حال اور اگر اپنے ہمراہ رکھنا ہے تو فی امان اللہ۔ مجھ سے اب عمر بھر کی مفارقت سمجھیئے۔ یہ بات میرے بھائی نے جاکر میرے خسر سے بیان کی انہوں نے سنتے ہی گھر میں حکم دیا کہ یہ اب اُس کی ناموس ہے اُسے اختیار ہے جہاں چاہے لے جائے ہمارا کچھ واسطہ نہیں۔ ہر چند مستورات منع کرتی رہیں۔ مگر میرا بھائی میری بیوی کو ڈولی میں سوار کرا کر لے آیا۔ اور اب وہاں سے سب کے سب سوار اور پیدل مستورات اور بچے نکل کر دلی دروازہ کے باہر ہوئے تو اُس وقت دلی دروازہ کا میدان صحرائے قیامت نظر آتا تھا۔ ہزارہا پردہ نشین عورتیں اور ننھے ننھے بچے اور بڑھے اور جوان مرد ہوش و حواس باختہ شہر سے نکلے چلے آتے تھے۔ کسی کو ہوش پردے کا نہ تھا۔ بہت سی نیک بختیں مقنع و چادر جو کپڑا سر پہ تھا وہ اوڑھے ہوتے برہنہ پا چلی جاتی تھیں۔

وہ مہ سے چہروں پہ گویا چھٹی ہوائی تھی ۔۔۔ گلوں سے جسموں پہ اک مردنی سی چھائی تھی
غرضکہ آنے سے پہلے قیامت آئی تھی ۔۔۔ غضب وہ پردہ نشینوں کی بے ردائی تھی

بیان کیجے نصیبوں کی کیا بُرائی کا
وہ دشت اور وہ پھرنا برہنہ پائی کا

غرضکہ بہزار مصیبت و مشقت اُفتاں و خیزاں ہمارا دو سو تین سو آدمیوں کا قافلہ برف خانے میں پہنچا۔ نواب حامد علیخاں صاحب نے تمام برف خانہ کو مالکان مکان

سے کرایہ پر لے رکھا تھا۔ شب کو بے آب و دانہ سب نے بسر کی۔ صبح کو فکر ہوا کہ آب و دانہ کی فکر کیجئے۔ میں نے اپنی بی بی سے پوچھا کہ کچھ زیور وغیرہ تم اپنے ساتھ لے کر نکلی ہو۔ اُنھوں نے جواب دیا۔ کہ سوائے خدا کے نام کے کچھ پاس نہیں جو کچھ پارچے وزیور گھر سے ہمراہ لے کر اپنی دادی کے گھر میں لے آئی تھی اُسے دیکھ کر میری دادی صاحبہ نے فرمایا تھا ری احمق بیوقوف لڑکی یہ کیا غضب کرتی ہے۔ یہ مال اسباب جان کا دشمن ہے۔ شہر کے باہر نکلی اور لیٹرے لوٹ لیں گے۔ تیرا خاوند مارا جائے گا۔ پھینک اس کو جان کا صدقہ مال یہ کہہ کر اُنھوں نے میرے سامان کو لے کر ایک مکان محفوظ میں جہاں پانچ چار لاکھ روپیہ اور سامان وزیور وغیرہ اپنے گھر کا اور کئی امیروں کا رکھا ہوا تھا رکھوا دیا۔ اور فی الحقیقت وہ جائے ایسی تھی۔ جہاں بغیر راز دار کے کوئی نہیں پہنچ سکتا تھا۔

جب یہ بات میں نے سُنی تو مجھے نہایت یاس اور فکر ہوا۔ اب کیا کیجئے۔ سوچتے سوچتے ایک بات خیال میں آئی اور میں نے گھر والوں سے کہا کہ تم جلدی کرو میں بندوبست کر کے لاتا ہوں۔ یہ کہہ کر میں برف خانہ سے نکل کر روانہ ہوا اور چھپتا ہوا اجمیری دروازہ سے شہر میں داخل ہو کر اپنے مکان پر پہنچا اور چھپر کھٹ کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اُسکے پتر نوچنے شروع کئے۔ پائے اُسکے بہت چوڑے تھے اُس کے کپڑے اوتارے اور پایوں کے سیر لوح سے اور نیچے سے پایوں کے دامن نوچ لئے مگر بیچ کے لٹو باقی رہ گئے۔ وہ گھبراہٹ میں اکھڑ نہ سکے۔ علیٰ ہذا القیاس اس کی چاروں چوبیں جن کی چاندی میں لاکھ پیوستہ تھی نہ اکھڑ سکیں۔ من کل الوجوہ ڈیڑھ پونے دو سیر چاندی کے قریب نوچ کر چادر سے میں باندھی پھر کوٹھڑی میں داخل ہوا۔ تو ایک گٹھڑی جس میں پانچ چار دوشالے اور دو شالی رومال اور دو انگرکھے بانات کے کنارہ دار بندھے مجھے نظر پڑی

وہ گٹھڑی بغل میں ماری اور وہ چاندی کمر سے باندھ کر گھر سے نکلا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ
میرے ایک عزیز نابینا اور اُن کی زوجہ اور ایک عورت ڈیوڑھی میں کھڑی تھیں۔ میں
نے کہا آپ کہاں۔ بولے میں تو تمہاری پناہ لینے آیا ہوں۔ تم کہاں چلے۔ میں نے حال
بیان کیا اور کہا کہ آپ بھی چلیئے۔ اُنہوں نے عذر کیا کہ میں نابینا ہوں کہاں جاؤں گا۔ مجھے
تو یہیں رہنے دو۔ غرضکہ میں نے اُن کو سب سامان کھانے پینے کا بتا دیا کہ آپ کو دو
تین ماہ کے لئے کافی ہے اور وہ گٹھڑی لے کر گھر سے نکلا۔ جب محلہ کے ترا ہے پر پہنچا
تو اُس وقت ایک تو گٹھڑی کا بوجھ معلوم ہوا۔ دوسرے خیال آیا یہ گٹھڑی تجھ کو برفخانے
تک لے کر کون پہنچنے دے گا۔ راستہ میں یہ بھی لٹ جائے گی اور اس کے ساتھ چاندی
بھی۔ کیونکہ اُن دنوں گوجر لٹیروں اور گنوار میواتیوں کا یہ زور شور تھا کہ شہر کے باہر قدم رکھا
اور لٹیروں نے مار لٹھ اور گنڈاسوں کے گرا دیا۔ اور جو کچھ پاس ہوا وہ چھین لیا جتے کہ
بدن کے کپڑے تک وہ مادر بخطا نہ چھوڑتے تھے۔ جی میں آئی کہ اسے واپس گھر میں پھینکتا
چل کہ سامنے سے ایک دوست جوہری کلو مل کہ اُسی جگہ کے باشندے تھے دکھائی دیئے
میں نے اُن سے کہا کہ بھائی یہ تم اپنے گھر لے جاؤ۔ اگر لوٹ مار سے بچ جائیں گے
تو میں لے لوں گا ورنہ جوتی کے صدقے سے۔ اُنہوں نے بہت عذر کیا کہ میں نہیں لینا
مگر میں اُن کے ساتھ قدم بڑھائے ہوئے اجمیری دروازہ پر پہنچا۔ اُس وقت تک
خلقت شہر کی نکل رہی تھی اور تمام پہاڑ گنج اور جے سنگھ پورہ وغیرہ میں دلّی دروازہ
تک جنگل آدمیوں سے پٹا پڑا ہوا تھا۔ غرضکہ میں بخوبی تمام برف خانہ میں پہنچا اور وہ
چاندی اپنے مکان میں لے جا کر دی۔ اور تین تولہ چاندی لے کر پہاڑ گنج کے ایک بنیے
کی دوکان پر پہنچا اور اُس سے کہا کہ اس کا مجھے سامان تول دے۔ اس نے کہا کہ میں

بارہ آنے دوں گا۔ غرضکہ بارہ آنے کو دے کر چار آنے کے پیسے نقد لایا اور باقی کھچڑی لاکر کنبے کو دی اور مٹی کے برتن لایا اور پانی میرا بھائی کنوئیں پر سے بھر لایا کہ وہ کھچڑی پکی اور سب نے کھائی۔ اُس روز تک دروازے شہر کے کھلے تھے۔ اُس کے دوسرے روز شہر کے سب دروازے بند ہو گئے۔ جو لوگ شہر سے نکلے تھے وہ باہر رہ گئے اور اندر والے اندر۔ اور اِکا دُکا بندوق کی آواز آنے لگی۔ اب مجھ کو فکر دامنگیر ہوا کہ میرے خسر اور اُن کے تمام بال بچے اور میری بہن اور بہنوئی اور عزیز و اقارب سب شہر کے اندر رہ گئے ہیں نہیں معلوم اُن پر کیا مصیبت گزری ہو گی۔ خیر وہ دن رات تو گزری

باغی فوج بھی چلی گئی

اب دوسرے روز کی حقیقت سُنیے کہ وہ جو فوج باغیہ بیرون شہر افتادہ تھی اُنہوں نے نو بجے دن کے پہلے تو اپنا میگزین اُڑایا اور عین سورج گہن میں اپنا ڈنڈا ڈیرا اُٹھا کر وہاں سے کوچ کیا۔ اور اثناء راہ میں افسران فوج مل کر بادشاہ کے پاس گئے کہ حضور ہمارے ساتھ تشریف لے چلیئے۔ یہاں لڑائی بگڑ گئی ہے۔ دوسری جاتے چل کر قبضہ کر کے لڑیں گے بادشاہ نے جواب دیا کہ میں تمہارے ساتھ نہیں چلتا۔ تم کو میرا گھر برباد کرنا تھا اور میری رعیت کو تباہ کرنا تھا۔ کر چلے۔ جو کچھ میری تقدیر میں لکھا تھا وہ ہوا اور جو کچھ ہونے والا ہے اور ہو گا۔ جاؤ جہاں تمہارا سینگ سمائے۔ ہر چند اُنہوں نے کہا مگر بادشاہ نے اُن کا ساتھ نہ دیا۔ اور وہ کوچ کر گئے۔

بادشاہ کو حراست میں لے لیا گیا

ایک دن بعد دلّی دروازہ کھلا اور سانڈرس صاحب نے بیان کیا کہ حضور کے اقبال سے افواج باغیہ نمک حرام کو شہر میں سے خارج کر دیا گیا اور وہ نمک حرام اپنی سزا نے

اعمال کو پہنچے۔ اب شہر خالی پڑا ہے۔ حضور تشریف لے چلیں کہ رعیت آباد ہو۔ بادشاہ نے فرمایا کہ میں اب شہر میں چل کر کیا کروں گا۔ شہر سے مجھے کیا مطلب، اپنے دادا کے مزار پر آپڑا ہوں، یہیں بیٹھا رہنے دو۔ جو سلوک تم کو میرے ساتھ کرنا ہے وہ یہیں پورا کر دو۔ وہاں لے جا کر کیوں میری مٹی ذلیل کرتے ہو میں تمہارے ارادہ سے آگاہ ہوں۔ مولوی رجب علی خاں[1] بولے آپ ایسا ہرگز خیال نہ فرماویں تشریف لے چلیں

---

[1] ارسطو جاہ حکیم مولوی سید رجب علی خاں بہادر جگراؤں (ضلع لودھیانہ) کے سادات سے تھے گورنر جنرل کے میر منشی تھے۔ پنشن پاکر جگراؤں میں خانہ نشین ہو گئے۔ وہاں ان کی جائداد تھی۔ اور ایک بڑا کتب خانہ تھا۔ جس میں بہت سی قلمی کتابیں تھیں۔ خود بھی کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ فنِ طبابت میں بہت مہارت رکھتے تھے۔ اِن کے بیٹے حکیم مولوی سید مقرّب علی بھی بہت بڑے طبیب تھے۔ لودھیانہ میں ان کی ایک بیٹی تھی۔ جس کے شوہر سیّد سجاد حسین کچہری میں ملازم تھے اور ہمارے ہی محلّے میں رہتے تھے۔ سید مقرب علی ان کے یہاں اکثر آیا کرتے تھے۔ میرے نانا مرحوم نے مولوی سیّد رجب علی سے عربی پڑھی تھی۔ غدر کے اکثر واقعات ان کی زبانی روایت کیا کرتے تھے۔ ان واقعات کی جو میرے نانا مرحوم مولوی سیّد رجب علی کی زبانی روایت کرتے تھے زیرِ نظر کتاب سے تصدیق ہوتی ہے۔ مقبرہ ہمایوں کے واقعہ کے بعد مسلمانوں کو مولوی رجب علی اور اُن کے خاندان سے عقیدت کم ہو گئی تھی۔ تاہم مولوی رجب علی نے تلافیٔ مافات کے طور پر دہلی کے ستم رسیدہ لوگوں کی حتی الامکان امداد کی۔ جیسا کہ اسی کتاب سے ثابت ہے کہ وہ مصنف کتاب کے بھائی امراؤ مرزا انور کو جگراؤں لیگئے اور ان سے اپنے کتبخانے میں کتابت کرانے لگے مولوی محمد حسین آزاد مرحوم نے بھی پہلے پہل جگراؤں میں انہیں کے یہاں پناہ لی تھی۔ مولوی رجب علی کے خاندان میں علمی و ادبی ذوق ہمیشہ رہا۔ مجھے بھی انکے خاندان کے اکثر افراد سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ (نظیر)

اور بیگم صاحبہ نواب زینت محل بھی تشریف لے چلیں۔ غرض اُس وقت انکار پیش کیا چل سکتا تھا۔ ناچار تن بتقدیر بادشاہ نے فرمایا بسم اللہ اور ہوادار میں سوار ہو کر ہمراہ ہوئے زینت محل بھی پالکی میں سوار ہو گئیں۔ شاید چھوٹے صاحبزادے جواں بخت اور شاہ بھی ہمراہ تھے۔ اس کی تحقیق نہیں ہوئی۔ غرض کہ جب دلّی دروازہ کے باہر پہنچے ہیں تو سانڈرس صاحب نے ہوادار کو ٹھہرایا۔ اور وہ جو اجتماع ساتھ تھا اُن کو روکا اور کہا۔ بابا لوگ ابھی تم لوگوں کا شہر میں داخل ہونا مناسب نہیں فوج سرکاری تمام شہر میں پھیلی ہوئی ہے۔ مبادا دنگہ فساد ہو ابھی تم لوگ یہیں قیام کرو۔ ہم شہر کا انتظام کریں گے پھر بُلوا لیا جائے گا۔ اور چوراسی آدمی ضعیف العمر چھانٹ کر بادشاہ کی خدمت کے لیئے مقرر کیئے۔ اندر شہر میں لے جا کر لال کنوئیں پر زینت محل والے مکان میں رکھا باقی جو اور آدمی تھے اُن سے کہا کہ ہتھیار ڈال دو۔ ورنہ باغی تصور کیئے جاؤ گے۔ اس پر سب نے ہتھیار ڈال دیئے پھر منادی پھیر دی گئی۔ کہ جس کے پاس ہتھیار ہو گا سرکار کا مجرم اور باغی سمجھا جائے گا۔ تمام رعیّت نے ہتھیار ڈال دیئے اور دراصل رعایائے دہلی کو بمقابل حکام انگریزی ہتھیار اُٹھانے سے فائدہ ہی کیا تھا اور جرأت کس کو تھی۔ رعیّت تو خدا سے دعائیں مانگتی تھی کہ یہ ظالم نمک حرام کہیں جلدی سے غارت ہوں کہ ہم لوگ ان ظالموں کے پنجہ سے نجات پائیں۔ اگر افواج سرکار انگریزی جب سے شہر میں چھپ چھپائے داخل ہوئے تھے یہ دست درازی اور قتل و غارت پر کمر نہ باندھتے اور حکام شہر میں داخل ہو کر رعیّت کی اشک شوئی کرنے اور سب کو تسکین اور دلاسا دیتے تو بلوہ ہی کیوں ہوتا۔ رعیّت تو اپنے گھروں میں دروازے بند کیئے ہوئے کان دبائے بیٹھی تھی۔ بازار میں چڑیا تک نہ تھی۔ مگر جب افواجِ سرکاری خانم کے بازار اور گلیوں

اور پائے والوں میں پہنچی ہے۔ جو سامنے آیا مارنا شروع کیا ہے اور دو چار رعیت کے گھروں میں درانہ داخل ہوئے تو رعیت نے بخیالِ ننگ و ناموس کہ عزت کا صدقہ جان سمجھ کر بلوہ کیا ورنہ ہرگز بلوہ نہ ہوتا۔ مردمانِ رعایا خود افواجِ سرکاری کے ہمراہ ہو کر فرقہ باغیہ کے دفعیہ میں کوشش کرتے۔

تیموری شاہزادوں کا قتل

المختصر جب بادشاہ کو شہر میں لے گئے ہیں اور رعیت سے ہتیار طلب کر لئے ہیں اس کے دوسرے روز ساانڈرس صاحب جمعیتِ سواران ہمراہ لے کر نظام الدین میں پہنچے اور میرزا الہی بخش شاہزادے کی نشان دہی سے بیس شاہزادگانِ دہلی کو کہ ان میں بادشاہ کے بیٹے، پوتے، نواسے اور داماد تھے گرفتار کر کے لائے اور بیرونِ دروازہ دہلی ان کو قتل کرا کے ان کے سر کٹوا کر بادشاہ کے پاس بھیج دیئے۔[1]

---

[1] نومبر ۱۸۵۷ء میں بادشاہ پر مقدمہ چلانے کی تیاری شروع ہوئی۔ میجر ہیریٹ نے الزامات کی فہرست تیار کی۔ اور سر جان لارنس لفٹننٹ گورنر پنجاب نے (دہلی ۱۹۱۱ء تک صوبہ پنجاب میں شامل تھی) بادشاہ کا مقدمہ کمیشن کے روبرو پیش کرنے کے احکام صادر کئے۔ جن کی تصدیق حکومت ہند نے بھی کر دی۔ کمیشن کے چار ارکان تھے۔ میجر پامر، میجر ریڈمنڈ، میجر سایرز اور کیپٹن راتھنی۔ مقدمہ کے تفصیلی حالات بیان کرنے کے لئے تو علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔ یہاں صرف اس قدر بیان کرتا ہوں کہ بادشاہ پر چار الزام لگائے گئے تھے۔ جو یہ ہیں :۔

(۱) ہندوستان میں انگریزی حکومت کا پنشن خوار ہونے کے باوجود اس نے ۱۰ مئی اور یکم اکتوبر ۱۸۵۷ء کے درمیان مختلف اوقات میں محمد بخت خاں صوبیدار توپ خانہ (زیر نظر کتاب میں اسے جرنیل بخت خاں لکھا ہے) اور دوسرے افسروں اور سپاہیوں کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی

نہالِ گلشنِ اقبال پائمال ہوئے   گُلِ ریاضِ خلافت لہو میں لال ہوئے
یہ کیا کمال ہوئے اور کیا زوال ہوئے   کمال کو بھی نہ پہنچے تھے جو زوال ہوئے
جو عطرِ گُل کو نہ ملتے ملے وہ مٹی میں !
جو فرشِ گُل پہ نہ چلتے ملے وہ مٹی میں
کہاں وہ خسروِ عالی نظر بہادر شاہ   کہاں وہ سرورِ نیکو سیر بہادر شاہ
کہاں وہ بادشہِ دادگر بہادر شاہ   کہاں وہ داورِ والا گہر بہادر شاہ
کہاں سے باغی بیدین آ گئے ۔ ہے ہے
کہ نام اُن کا جہاں سے مٹا گئے ہے ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۴) فوج میں غدر مچانے پر اُکسایا اور حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کے لئے اُن کی امداد اور حوصلہ افزائی کی ۔

(۲) اپنے بیٹے مرزا مغل اور دہلی و سرحد کے باشندوں کو بھی بغاوت پر آمادہ کیا ۔

(۳) حکومتِ انگلشیہ کی رعایا ہونے کے باوجود اعلان کیا کہ میں ہندوستان کا بادشاہ ہوں اور دہلی شہر پر ناجائز طور پر قبضہ کر لیا اور اپنے بیٹے مرزا مغل بیگ اور صوبیدار توپ خانے سے انگریزی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کی ۔

(۴) قلعہ دہلی کی حدود میں ۴۹ یورپی عورتوں اور بچوں کو قتل کرایا ۔ مقامی راجاؤں اور مہاراجوں کو بھی ہدایات بھیجیں کہ یورپی اور مسیحی لوگوں کو قتل کیا جائے ۔ یہ کارِ خیر ہے ۔

استغاثہ نے ان الزامات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے زبانی اور دست آویزی ثبوت پیش کئے ، جن کی تفصیل بخوفِ طوالت نظر انداز کرتا ہوں ۔ بادشاہ نے اپنی صفائی میں چار گواہ غلام عباس حکیم احسن اللہ ، کیپٹن فورلیسٹ نائب معتمد توپ خانہ اور کیپٹن ڈگلس کے ایک اردلی مسمی مکھن

نہ دیندار تھا کوئی نہ دینداری تھی　　ستم پرستی و جور و جفا شعاری تھی

نہ پاسداری ملت نہ مستعاری تھی　　پر اُس کے پیروں میں فکرِ حرامکاری تھی

غرضکہ دین کو سمجھے تھے وہ ستمگاری

نمک حرامی و محسن کُشی تھی دینداری

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۵) کو پیش کرایا۔ ان چاروں اصحاب کی شہادتوں کے لب و لہجہ سے بخوبی ظاہر ہے کہ ان پر خوف و ہراس طاری تھا۔ اُنھوں نے جرح میں سے بہت سوالات کے جواب میں کہا کہ ہم نے ایسا سُنا لیکن خود نہیں دیکھا۔ استغاثہ کی طرف سے جاٹ مل وقائع نگار لفٹنٹ گورنر، بنجا ور سنگھ، کشن سنگھ، چونی لال، گلاب، حسن عسکری، بادشاہ کا سابق معتمد مکند لال وغیرہ بطور گواہ پیش ہوئے جنھوں نے بادشاہ کی مخالفت اور استغاثہ کی تائید میں بیانات دیئے۔ مارچ ۱۸۵۸ء میں بادشاہ نے تحریری بیان دیا جس میں بادشاہ نے اپنی بے گناہی کا اظہار کرتے ہوئے کم و بیش وہی واقعات بیان کئے جو اس کتاب میں مصنف نے درج کئے ہیں لیکن عدالت نے بادشاہ کو مجرم قرار دیتے ہوئے سزائے موت کا مستحق ٹھیرایا۔ سر جان لارنس لفٹنٹ گورنر نے عدالت کے فیصلہ پر ایک طویل ریویو رکھ کر فیصلہ اس سفارش کے ساتھ حکومت ہند کو بھیجا کہ بادشاہ کو جلاوطن کر دیا جائے۔ اور ملکہ زینت محل اور مرزا جواں بخت کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ چاہیں تو بادشاہ کے ساتھ چلے جائیں یا بنگال میں نظر بند رہیں۔ حکومت ہند نے یہ سفارش منظور کر لی اور بہادر شاہ ظفر کو کلکتہ بھیج دیا۔ جہاں اُسے بتایا گیا کہ اُس کا آخری ٹھکانا رنگون ہے۔ اکتوبر ۱۸۵۸ء کو شاہ ظفر، ملکہ زینت محل اور مرزا جواں بخت دہلی سے روانہ ہوئے تھے۔ نومبر میں رنگون پہنچ گئے۔ ظفر نے ۱۸۶۲ء میں ۸۷ سال کی عمر میں وفات پائی۔

(نظیر)

برائے نام ستمگار دیندار بنے　　جو دیندار بنے تو ستم شعار بنے

ستم شعار بنے جب تو ذی وقار بنے　　جو ذی وقار بنے تو حرام کار بنے

کیا وہ ظلم کہ سر پہ جہاں اُٹھا مارا

خدا پرست نہ تھا ایک بھی خدا مارا

پُرامن شہریوں کا قتلِ عام

بیرونِ شہر کا تو یہ حال تھا اب اندرونِ شہر کی حقیقت سُنیئے کہ اُن غریبوں پر کیا مصیبت گذری جو بخیال سرپرستی سرکار انگریزی یہ سمجھتے تھے کہ ہم تو رعیت سرکار ہیں انہیں تو کسی کے نیک وبد سے کچھ کام نہ تھا اور شبانہ روز نمکحرام فوج کے نکلنے کی دعا مانگتے اور سرکار انگریزی کے دل سے ہوا خواہ تھے ہم سے سرکار کیا مزاحمت کرے گی شہر میں بیٹھے رہو کوئی دو چار دن کا شور و شغب ہے بعد امن وامان ہو جائے گا۔ یہ خبر ہی نہ تھی کہ آتش غضب سلطانی التہاب میں ہے اور بحر مّواج سطوتِ قہرمانی طلاطم خیز ایسی حالت میں رحم و ترحم کا کیا کام ہے! اور جوشِ غضب میں عدل وانصاف اور خوفِ خدا بالائے طاق رکھنا ہے۔

چو از قومے یکے بیدانشی کرد　　نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

نمے بینی کہ گاوے در علف زار　　بیالاید ہمہ گاوانِ دہ را

حالتِ غیظ و غضب میں گناہگار و ناکردہ گناہ سب برابر ہوتے ہیں اُس وقت کون پرسانِ حال ہوتا ہے۔ کہ مجرم یا غیر مجرم آٹے کے ساتھ گھن بھی پس جایا کرتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ شہر میں رہ گئے تھے اُن پر وہی کیفیت گذری۔ کہ گیا داڑھی والا اور پکڑا گیا موچھوں والا۔ سپاہ انگریزی منظفر و منصور جو لوگوں کے گھروں میں لوٹ کے واسطے داخل ہوئی جو گھر خالی پایا اُسے دھڑی لوٹنا شروع کیا۔ اور جہاں آدمی دیکھے بے غل و غش قتل کرنا شروع

کیا۔ مجھے اپنے عزیزو اقارب کا خیال تھا خصوصًا سسرال کا کہ ناگہاں صبح کے وقت دیکھتا کیا ہوں کہ میرے خسر کا خدمتگار گامی چلا آتا ہے میں نے صورت دیکھتے ہی پوچھا گامی خیر ہے اُس نے دبی زبان سے کہا جی ہاں خیریت ہے۔ میرا ماتھا ٹھنکا خدا خیر کرے میں نے پوچھا کہ کہاں ہیں۔ کہا شاہ مردان میں نواب نجف خاں کے مقبرہ میں کل سے آئے ہوئے ہیں تم کو ڈھونڈھتا ہوا آیا ہوں آپ کو بلایا ہے۔ چلیئے میں نے گھر میں جاکر بی بی سے کہا کہ تمہارے گھر والے شاہ مردان میں آگئے ہیں مجھے بلایا ہے میں جاکر خبر لاتا ہوں۔ غرضکہ میں ہمراہ گامی کے روانہ ہوا۔ جب شاہ مردان میں پہنچا ہوں اور نجف خاں کے مقبرہ میں داخل ہوا ہوں اور مستورات نے مجھے دیکھا ہے تو ایک کہرام مچ گیا۔ دو سو عورتیں برابر سر پیٹ رہی ہیں اور شور نالہ و فریاد آسمان تک جاتا ہے ہیں یہ کیا غضب ہے اب مردوں میں خیال کرتا ہوں تو اور سب لڑکے بالے ہیں مگر میاں امیر میرزا اور ناصر الدین نہیں۔ غرضکہ وہ غل و شور جب فرو ہوا تو میں نے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے بڑی بیگم صاحبہ نے بیان کیا کہ جس دن تم ہم سے جدا ہوئے اُس کے ایک دن بعد سُنا گیا کہ جرنیل صاحب کا ڈیرا جامع مسجد میں ہو گیا ہے اور تھوڑی دیر کے بعد پانچ چار گورے گھر میں گھس آئے اور آکر کہا ہم کو روپے دو عورتیں تو کوٹھریوں میں چھپ گئیں اور مردوں نے کچھ دیکر ٹال دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اور آئے اُن کو بھی کچھ دیا۔ غرضکہ اب تار بندھ گیا ایک آتا ہے ایک جاتا ہے۔ میاں ناصر الدین نے کہا کہ میں جاتا ہوں۔ جرنیل صاحب کے پاس اور بندوبست کراتا ہوں۔ وہ دو خدمتگار وں کو لے کر جامع مسجد میں پہنچے۔ وہاں جا نے کیا گفتگو ہوئی کہ ایک خدمتگار آیا اور اُن عورات عیسائیہ کو جن کو انھوں نے ہنگام غدر اپنے گھر میں چھپا کر رکھا تھا لے گیا اور وہ عورات سے کہہ گئیں کہ ہم ابھی آتے ہیں۔

اور میاں ناصر الدین کو اپنے ساتھ لاتے ہیں اور سارٹیفکیٹ لاتے ہیں۔ غرضکہ وہ عورتیں بھی جامع مسجد میں پہنچیں اور خدمتگار باہر مسجد کے دروازہ پر کھڑے رہے مگر پھر نہ وہ عورتیں اور نہ میاں ناصر الدین آئے۔ اپنے خدمتگاروں نے شام کو واپس آکر حال بیان کیا۔ رات بھر سب کو تشویش رہی اور اس اثنا میں تمام محلہ کی عورات مرد ہمارے مکان میں آکر جمع ہو گئے۔ باہر باغ میں مرد اندر دونوں حویلیوں میں عورتیں۔ دو سو آدمی زن و مرد یکجا تھے منشی آغا جان اور ان کی تین اور عورتیں سب یہیں تھیں۔ صبح کے وقت منشی آغا جان اور ان کا بیٹا اور یہ سب باغ میں بیٹھے ہوئے تھے اور میاں امیر مرزا نماز پڑھ کے اپنے شغل اشغال میں حسب معمول مشغول تھے اور لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی ضربیں لگا رہے تھے کہ ناگہاں دو گورے باغ میں آئے اور سامنے سے کہا ہم کو روپیہ دو۔ میاں امیر میرزا نے کہا کہ ہمارے پاس روپے کہاں ہیں۔ کہ ان میں سے ایک نے بندوق ماری کہ منشی آغا جان کے بیٹے کے سینہ پر لگی کہ اس نے باپ کو پکارا۔ میاں امیر مرزا نے کہا۔ بیٹا خدا کا نام لے اس وقت باپ کو یاد نہیں کرتے انہوں نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا تھا کہ دوسرے نے گولی ماری کہ وہ ان کے سینے پر لگی انہوں نے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہا اور چت لیٹ گئے اور تسبیح کا ہاتھ ان کے سینے پر رہا۔ اور ان جفا کاروں نے پھر بندوقیں بھریں اور دو خدمتگاروں کو مار کر اپنا رستہ لیا۔ مٹیا محل میں ایک قیامت برپا ہو گئی۔ اس غل شور کی آواز جامع مسجد میں پہنچی۔ وہاں سے دو انگریز واویلا سنکر آئے پوچھنے لگے کہ یہ کیا غل شور ہے۔ عورتوں نے بیان کیا دیکھ لو تمہاری فوج نے یہ ظلم کر رکھا ہے۔ ہمارے وارثوں کو بے خطا و قصور مار ڈالا۔ دیکھو۔ دیکھو یہ لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔ بولے ہم کو روپے دو۔ ہم تم کو شہر سے باہر کر دیں گے سب نے کہا۔

بہت اچھا ہم دیں گے مگر اتنا صبر کرو ہم ان لاشوں کو زمین میں دفن کر دیں۔ چنانچہ جلدی جلدی سب نے مل کر گڑھے کھودے اور شہیدوں کو اُسی پہنے ہوئے لباس میں سپردِ خاک کیا۔ اور انگریزوں کے ساتھ ہوئے۔ وہ ہم کو لئے ہوئے ترکمان دروازے آئے اور جس جس کے پاس جو تھا اُن سے حوالہ کیا اور انہوں نے دروازہ کھلوا کر ہم کو باہر کر دیا۔ غرضکہ یہ حقیقت سُنکر میں برف خانہ میں آیا مگر خاموش اب اگر ان کا ذکر کرتا ہوں تو یہاں کہرام مچتا ہے اب میرے گھر میں بضد ہیں کہ تم کہو سہی چپ چپ کیوں ہو۔ آخر میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ میری بی بی سمجھ گئی کہ کچھ واردات ہوئی ہے مجھے قسم دلا کر پوچھا میں نے اتنا کہا کہ جس بات کا اندیشہ تھا آخر وہی ہوا وہ سمجھ گئی کہ میرا باپ شہید ہوا پھر تمام عورتوں میں رونا دھونا مچ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے تمام کیفیت بیان کر دی۔

جہاں کی تشنہ خوں تیغ آبدار ہوئی　　سنانِ نیزہ ہر اک سینہ سے دوچار ہوئی
رسن ہر ایک بشر کے گلے کا ہار ہوئی　　ہر ایک سمت سے فریاد گیرودار ہوئی

ہر ایک دشتِ قضا میں کشاں کشاں پہنچا
جہاں کی خاک تھی جس جسکی وہ وہاں پہنچا

ہر ایک شہر کا پیر اور جوان قتل ہوا　　ہر ایک قبیلہ و ہر خاندان قتل ہوا
ہر ایک اہل زباں خوش بیان قتل ہوا　　غرض خلاصہ یہ ہے ایک جہان قتل ہوا

گھروں سے کھینچ کے کُشتوں پہ کُشتے ڈالے ہیں
نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں

غرضکہ جو لوگ شہر میں رہ گئے تھے اُن میں کئی اشخاص باکمال نام آور فردِ روزگار

مارے گئے ہیں۔ جو دہلی کی ناک اور یگانۂ آفاق تھے۔ جن کی نظیر آج تک پیدا نہیں ہوا۔ اور نہ ہوگا میاں محمد امیر پنجہ کش خوشنویس جن کا ثانی روئے زمین پر نہیں۔ مولوی امام بخش صہبائی اور اُن کے دو بیٹے اور میر نیاز علی واقفہ خواں اور چیلوں کے کوچے کے اور بہت سے شریف خاندانی لوگ۔ سُنا گیا ہے کہ اُس محلہ کے چودہ سو آدمی گرفتار کرکے راجگھاٹ کے دروازہ سے دریا پر لے جاکر بندوقوں کی باڑیں ماردی گئیں اور لاشیں دریا میں ڈھنکوا دی گئیں۔ عورات کا یہ حال ہوا کہ گھروں میں سے نکل نکل کر بچوں سمیت کنوؤں میں جا گریں۔ چیلوں کے کوچہ کے تمام کنوئیں لاشوں سے پٹ گئے تھے آگے میرا قلم نہیں چل سکتا۔ نہ مجھے اُس کی تحریر کی تاب ہے جو کچھ سُنا گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ دروغ برگردنِ راوی باقی اور اضلاع شہر کا یہ حال ہوا کہ عورات اور مردوں کو شہر سے نکالا گیا تو اس طرح کہ مردوں کو تو کشمیری دروازہ سے باہر کیا اور عورات کو کابلی دروازہ کی راہ سے شہر بدر کیا کہ باہمی مفارقت ہوگئی۔ ایک ایک کو ڈھونڈھتا پھرا۔ غرضکہ جب زن و مرد شہر سے باہر ہو گئے تو اب مخبری کا بازار گرم ہوا اور وہی بدمعاش جو نمک حراموں کے ہمراہ ہوکر انگریزوں کو بتاتے پھرتے تھے اور شہر کو لٹواتے تھے اب سرکاری مخبری اور شہر والوں کو پھانسیاں دلوانے لگے۔ دو روپیہ آدمی پیچھے مخبری کا صلہ ملتا تھا +

پانچواں باب

ہجرت

چنانچہ چار پانچ روز ہم کو برف خانہ میں گزرے تھے۔ کہ میر نواب کپتان بادشاہی کو پکڑوا کے پھانسی دلادی گئی۔ باوجودیکہ وہ میر حیدر علی داروغہ فیل خانہ انگریزی کا داماد تھا اور تمام غدر میں ہمراہ صاحبان انگریزہ پہاڑی رہا کرتا تھا۔ تمام کمسریٹ کا کام اُسکے سپرد تھا۔ اور سرکار کی بہت سی خیرخواہی کی تھی۔ اور میر نواب کپتان اُس کا داماد تھا۔ اُس نے بہت کچھ منت و معذرت کی مگر کچھ نہ سُنی گئی اور اُس خیرخواہی پر کچھ نظر نہ ہوئی۔ جب یہ واقعہ نظر سے گزرا تو سب کو اپنی اپنی جانوں کا فکر ہوا۔ نواب حامد علی خاں صاحب نے میری والدہ سے کہا کہ میں ان لوگوں کا یہاں رہنا مناسب نہیں جانتا ہوں۔ ان کو رخصت کیجیے۔ جہاں ان کو اپنے بچاؤ کی صورت نظر آئے چلے جائیں اور اپنی جان بچائیں یہ لوگ کسی کو زندہ نہ چھوڑیں گے۔ ہمارا تمہارا کیا ہے ہم تو بوڑھے ہیں۔ ہم تم اہل و عیال کو سنبھالیں گے اور یہ روانہ ہو جائیں۔ یہ امر مجھے پہلے ہی مرکوز خاطر تھا۔ میں نے والدِ بزرگوار کی خدمت میں عرض کی کہ بلاشک نواب صاحب نے سچ فرمایا ہے مصلحت وقت

یہی ہے کہ اب ہماری مفارقت گوارا کیجیے۔ اور ہم دونوں بھائیوں کو اور ہمارے بہنوئی
آغا سلطان کو اجازت دیجیے۔ جدھر خدا لے جائے گا نکل جائیں گے۔ مجھے اپنی جان
سے زیادہ آغا سلطان کا خیال ہے۔ یہ بخشی فوج شاہی ہے اسے کوئی نہیں چھوڑیگا
اگر خدا کو زندگی رکھنی منظور ہے تو پھر آکر قدمبوسی حاصل کریں گے۔ یہ کہہ کر میں نے
یہ کام کیا۔ کہ تھوڑی سی چاندی کے پتر لے کر جوتی کے تلے کے دونوں پرت جلا کے
اُس کے جوف میں بھری یعنی جوتی میں اوپر نری کا چمڑا ہوتا ہے اور نیچے دھوڑی۔
ان دونوں کے بیچ میں چاندی کے پتر بھرے۔ میری بی بی نے اُس وقت یہ کام کیا
کہ ایک فرد سونے کی پہنچی کی ہیرے آگے رکھ دی میں نے پوچھا کہ یہ کہاں سے آگئی
اُنہوں نے بیان کیا کہ جس وقت میں نے اپنا زیور اُتار کر ڈبے میں رکھا تھا تو بے وسانی
میں یہ پہنچی میرے ہاتھ میں رہ گئی تھی۔ میں نے اُس وقت اس کا ڈورا توڑ کر وہ دانے
الگ کر کے کمربند کے اندر بھرے اور دستار باندھی کمر سے دوپٹا باندھا۔ ہاتھ میں
لکڑی لی اور چلنے کو تیار ہوا۔ اور میرا بھائی امراؤ مرزا اور آغا سلطان بھی تیار ہو گئے
اُس وقت ہماری رخصت کا حال قیامت سے کم نہ تھا۔ میری بی بی ہر چند شرم کے
مارے مُنہ سے کچھ نہ بولی اور نیچے آنکھیں کیے ہوئے رو رہی تھی۔ آخر جب اٹھنے
لگا تو چپکے سے یہ لفظ کہا کہ باپ چچا تو مارے گئے فقط تمہارے دم کا سہارا تھا۔
مجھے کس پر چھوڑے جاتے ہو۔ میں نے جواب دیا کہ خدا کے حوالے کرتا ہوں اگر
زندہ رہا تو پھر آ ملوں گا۔ اگر میں مارا گیا تو تم سن لو تو مہر بخش دینا یہ کہہ کر میں مکان
سے باہر ہوا۔ اور بسم اللہ کہہ کر خواجہ صاحب کی طرف روانہ ہوا۔ کوئی نصف میل
کے قریب راہ طے کی ہو گی کہ اُدھر سے سوار آئے آتے ہی اُنہوں نے گھیر لیا اور

کہا تلاشی دو۔ اور سب کے سب کا بدن ٹٹول لیا نہ میرے پاس کچھ پایا نہ میرے ہمراہیوں کے پاس کچھ دیکھا۔ مگر ایک سوار نے میری پگڑی اُتار لی اور اپنا رستہ لیا۔ میں نے دوپٹہ کمر سے کھول کر سر پہ باندھ لیا۔ آگے بڑھا اور سوار ملے اُنھوں نے بھی یہی بات کی جب تو میں نے کمر بند پائجامہ میں سے کھینچ کر ایک گیند بنالی۔ اور پائجامہ کے نیفے کو بطور بند گرہ لگادی اور وہ گیند اپنے ہاتھ میں رکھ لی۔ جب سواروں کو دُور سے آتے دیکھتا تو اُس گیند کو دور پھینک دیتا۔ وہ آکر تلاشی لے کر آگے بڑھ جاتے میں دل میں کہتا تھا کہ اے تم تو ڈاکو ہو مگر میں بھی تمہارا اُستاد ہوں بھلا تم مجھے کیا لوٹ سکتے ہو۔ اور جب وہ دور چلے جاتے پھر اپنی گیند اٹھا کر اپنے ہاتھ میں لے لیتا۔ غرضکہ بہزار خرابی خواجہ صاحب میں پہنچا وہاں میں نے دیکھا کہ ایک ہجوم کثیر مرد و زن کا فراہم ہے۔ شب کو میں نے کچھ چاندی ایک صراف کے ہاتھ بیچی اور کھانے کا بندوبست کر کے دیوانِ خاص میں ہم تینوں آدمی زمین میں پڑ رہے صبح کو ایک پندرہ بیس ہزار آدمی کا قافلہ جس میں نواب امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں اور احمد قلی خاں بادشاہ کے خسر اور بہت سے بڑے آدمی شامل تھے وہ گوجروں کو دو ہزار روپیہ دے کر اور اُنہیں ہمراہ لے کر خواجہ سے روانہ ہوئے۔ ہم بھی اُسی قافلہ کے ہمراہ ہو گئے۔ راستہ میں وہی سامانِ صحرائی دکھائی دیئے جو اوّل لکھ چکا ہوں۔ اب اعادہ اُس کا فضول ہے۔ ہزارہا عورات پردہ نشین اور بچے ہمراہ تھے۔ منزل دراز تھی اوپر کی دھوپ نیچے پاؤں کے جلتی ہوئی ریت۔ جنگل لق و دق سایہ کا نام نہیں۔ آب و دانہ کا کام نہیں تلووں میں آبلے۔ زبانوں میں بے آبی سے کانٹے پڑے ہوئے روتے دھوتے چلے جاتے تھے۔

وہ دھوپ اور وہ ریگِ طپاں وہ گرم ہوا   وہ فوج فوج ہر اک سُو سے نرغۂ اعدا
وہ کینہ ورزیِ غارتگرانِ بے پروا   اور اشپۂ ظلم گنوار عل کا وہ کرو اویلا

جو ہم سے سنئے ہیں وہ انقلاب کی باتیں
تو لوگ کہتے ہیں کرتے ہو خواب کی باتیں

وہ گُل سے چہرے حرارت سے تمتمائے ہوئے   وہ گورے گورے بدن خاک میں ملائے ہوئے
لبوں پہ آہ جگر میں الم سمائے ہوئے   جفا کی تیغ کے سب زخم دل پہ کھائے ہوئے

وہ داغِ مرگِ عزیزاں وہ وحشت ہمپائی
وہ ریگ خارِ مغیلاں وہ آبلہ پائی

غرض خدا خدا کرکے وہ منزل قطع ہوئی اور قریب شام سول لسفنہ کی سرا میں پہنچے تھکے ہارے۔ رستہ کے پاؤں میں بڑے بڑے آبلے پڑے ہوئے برا حال۔ بری نوبت خیر بہرحال سوائے صبر وشکر کے کیا کیا جائے۔ شب کو کچھ بازار سے چنا چبینا لاکر کھالیا۔ پانی پی کر سرائے کی زمین پر پڑ رہے۔ اب آغاز اور انجام اس سفر کا کچھ معلوم نہیں کہ یہ راستہ کہاں کو جاتا ہے کون کون سے شہر راستہ میں پڑیں گے۔ کس ریاست میں پہنچیں گے پس ہمراہ قافلے کے ہیں جدھر قافلہ جاتا ہے اسی کو منزل مقصود سمجھا جاتا ہے۔ گھر سے کبھی نکلے نہیں۔ اس مصیبت کا سفر کیا نہیں راستہ سے نابلد منزلوں سے ناواقف شہروں اور ریاستوں کا حال سوائے عملداری انگریزی کا کچھ نہیں جانتے۔ ایک دوبار پہلے سفر کا اتفاق ہوا ہے تو آگرہ، میرٹھ وغیرہ کی طرف ہوا ہے تو بکمالِ آسایش سواریوں پر آدمی خدمت میں بڑی دل لگی کا سفر ہوا ہے نہ اس مصیبت کا کہ زمین تک قدم دھرنے کی روا دار نہیں۔ جہاں جھاڑ کانٹا کانٹا دشمنِ جان ہے

گھر میں الور۔ جے پور۔ بیکانیر کا نام تو سنا ہے۔ مگر کبھی اتفاق سفر ہوا نہیں۔ نہ یہ معلوم کہ کتنی دور ہیں۔ مقصد مختصر شب کو پڑے رہے۔ صبح ہوتے ہی پھر قافلہ کے ہمراہ ہوئے دوپہر کو جا کر فرخ نگر میں داخل ہوئے۔ کچھ چاندی بیچ کر کھانے کی تجویز کی۔ ایک جو وہ راہ ہے وہاں سے سب طرف کو راستہ جاتا ہے۔ وہاں باہم کھچڑی پکنی شروع ہوئی اور صلاح و مشورے ہونے لگے۔ کسی نے کہا ہم اودھر جائیں گے کسی نے کہا ہم ادھر جائیں گے۔ ہم حیران ہیں کہ یا الٰہی ہم کہاں جائیں۔ آخر ایک شخص کی زبانی معلوم ہوا کہ یہاں سے جھجر قریب ہے۔ یہ نام سنتے ہی جان میں جان آگئی۔ وہاں تو ہمارے ماموں حکیم مرزا قاسم علی خاں صاحب مختار ریاست ہیں۔ ان کے پاس چلیئے اور ان کی صلاح کے کاربند ہوئیے۔ جدھر وہ رہنمائی فرمائیں اودھر جانا چاہیئے۔

جھجر میں ورود

غرضکہ دوسرے روز جھجر کا راستہ پوچھ کر اودھر کو روانہ ہوئے اور اسی دن جھجر پہنچے اور مکان پوچھ کر ان کے ہاں پہنچے ماموں صاحب نے جب شکل دیکھی تو چیخیں مار کر رونے لگے۔ ارے یہ کس غضب میں گرفتار ہو گئے۔ غرضکہ گلے سے لگایا۔ پاس بٹھایا تسلی دی۔ ہاتھ منہ دھلوایا۔ کھانا کھلوایا۔ دیوان خانہ میں کہا اب یہاں رہو آغا سلطان سے وہ خوب واقف ہی تھے تیسرے پہر کے قریب آغا سلطان تو باہر ٹھہرے مجھے اور بھائی کو گھر میں لے گئے ممانی سے کہا دیکھو تو بھانجوں کا کیا حال ہے۔ میری بہن بادشاہ بیگم نے انہیں کس مصیبت سے پرورش کیا تھا آج یہ اس بلا میں مبتلا ہیں وہ بھی آبدیدہ ہوئیں۔ انہوں نے حال پوچھا سب حال بیان کیا دوسرے روز ممانی صاحبہ نے کپڑا منگا کر جوڑے تیار کرائے اور کہا۔ اب یہاں سے کہیں نہ جاؤ میرے پاس رہو۔ ہم آٹھ روز آسائش

سے وہاں رہے۔ یہ بھی فلک کو ناگوار ہوا اور ظالم جفا کار نے ایک اور ستم ڈھایا۔ آدھی رات کے وقت اُن کو نواب صاحب نے بلوایا۔ وہ وہاں گئے ایک گھنٹہ بعد واپس آئے اور آبدیدہ آئے۔ میں نے پھر پوچھا۔ ماموں خیر ہے فرمایا بھائی کیا پوچھتے ہو جس بلا میں تم مبتلا ہو کر یہاں آئے ہو وہ بلائے ناگہانی یہاں بھی نازل ہو گئی اور انگریزی فوج یہاں بھی آپہنچی۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اس وقت نواب صاحب نے مجھے اس واسطے بلایا تھا۔ اب تم ایک کام کرو۔ یہاں سے سیدھے پانی پت کو براہِ سونی پت روانہ ہو جاؤ تمہارے والد اور خالائیں اور سارا کنبہ پانی پت پہنچ گیا ہے۔ مجھے خبر آگئی ہے۔ یہاں سے میری بہلی تم کو سونی پت پہنچا دے گی۔ وہاں سے تم گاڑی کر کے چلے جانا ورنہ وہاں بھی تیری ننھیال ہے۔ تم کو آگے جانے بھی نہ دیں گے۔ غرضکہ اُس وقت بہلی تیار ہوئی اور ہم سوار ہو کر پانی پت میں آئے۔ یہاں میرے نانا کے حقیقی بھائیوں کے مکان تھے اُنہوں نے مجھے روکا اور کہا کہ اب تم غدر تک یہاں رہو کہیں نہ جاؤ۔ جب امن ہو جائے گا چلے جانا میں نے کہا کہ میرے والد۔ والدہ۔ بھائی۔ بہن۔ بیوی سب برسط میں میری خالہ کے ہاں تھے۔ غرضکہ میں روانہ ہو کر وقتِ شب برسط میں پہنچا اور ایسے وقت کہ رات کے گیارہ بج گئے تھے اور میرے والد گریہ وزاری کر کے صحنِ خانہ میں کھڑے ہوئے ہماری سلامتی کی دعا مانگ رہے تھے۔ خداوندا تو جامع المتفرقین ہے تو میرے بچوں کو مجھ سے زندہ و سلامت لا کر ملا دے۔ میں نے تیرے حفظ و امان میں سونپا ہے اُسی وقت میں دروازہ پر پہنچا اور میں نے آواز دی کہ دروازہ کھولو۔ میری بڑی خالہ میری آواز پہچان کر دوڑیں اور میرے والد کو یقین نہ آیا۔ جب میری خالہ نے قسم کھائی کہ میں نے ابھی نواب میرزا کی آواز سُنی ہے وہ دروازہ پر پکار رہا ہے غرضکہ

دروازہ کُھلا اور میں نے جاکر والد کے قدم لیئے اُنہوں نے سجدۂ شکر ادا کیا ۔

پانی پت پہنچے

وہاں سے پانچ چار روز کے بعد ہم سب پانی پت میں پہنچ گئے اور وہاں سکونت اختیار کی اور ایک چھوٹی سی تجارت کا ڈھنگ ڈال کر قوت لبسری کی سبیل کی اور ایک دوکان کرایہ کو لی۔ ایک آدمی نوکر رکھا خرید فروخت کے لیئے اور حساب کتاب اپنے ہاتھ میں رکھا۔ دونو وقت جاکر دوکان کا مال متاع سنبھال آتا تھا۔ خدا کی صفت رزاقی ہے ان روزوں میں اُس تجارت نے ایسی ترقی پائی اور ایسی برکت ہوئی کہ تمام گھر والے اُس میں بخوبی روٹی کھاتے تھے اور نوکر کی تنخواہ کرایہ دوکان ادا کر کے مال تجارت دن دونا اور رات چوگنا ہوتا جاتا تھا۔ تھوڑے عرصہ میں تین چار سو کا سامان دوکان میں فراہم ہوگیا تھا۔ اور دو روپیہ روز کا میرے گھر کا خرچ تھا۔ پانچ ماہ تک تو امن و آسایش کی صورت رہی مگر فلک کجرفتار اور زمانہ ناہنجار کب دیکھ سکتا۔ پھر اُس غریب آزار کو رشک و حسد پیدا ہوا اور نشترِ رشک جگرِ فلک میں نیش زن ہوا۔ اور از سرِ نو ایذارسانی پر مستعد ہوا۔

زمانہ مردِ مصاف ست دمن نساؤ دلی | کنم بجوشنِ تدبیر وہم دفعِ مضار
زمنجنیق فلک سنگِ فتنہ می بارد | من ابلہانہ گریزم در آبگینہ حصار

کہ یکایک آسمان سے سنگِ حوادث برسنے لگے اور زمین نے فتنۂ تازہ برانگیختہ کیئے اور حشرات الارض کی طرح زمین سے ایک بچھو پیدا ہوا۔ یعنی دہلی سے وہی موذی اوباش مخبروں کا سرغنہ گامی بدمعاش بلائے ناگہانی کی طرح پانی پت میں نازل ہوا۔ اور دارو گیر کا بازار گرم ہوا اور دلّی والے گرفتار ہونے شروع ہوگئے۔ ادھر برسط میں نواب حامد علی خاں صاحب اور اُن کے سب کنبہ کو گرفتار کر لائے اِدھر پانی پت

میں قیامت برپا ہوگئی۔ اور پانی پت کا محاصرہ ہوگیا۔ مگر آفرین مردمانِ پانی پت پر وہ مسافر نوازی فرمائی کہ باپ بیٹے کے ساتھ یہ سلوک نہ کرے گا۔ دلّی والوں کے ساتھ جانیں لڑادیں اور اپنے گھروں کے زنانوں میں چھپا چھپا کر رکھا اور جان سے آبرو سے ساتھ دینے کو موجود تھے۔ اور جس دن سے دلّی کے لوگ پہنچے تھے اپنے گھروں میں بٹھا لیا تھا۔ اور روپیہ سے پیسے سے روٹی سے کپڑے سے سب طرح سلوک ہوتے رہتے۔ ایسے احسان کو آج تک کسی شخص نے کسی کے ساتھ نہ کئے ہونگے جو سلوک کہ پانی پت والوں نے دلّی والوں کے ساتھ کئے +

پانی پت کا محاصرہ

قصّہ مختصر جب پانی پت کے گرد گھیل پڑ گیا اور ناکہ بندی ہوگئی۔ اور دلّی والے گرفتار ہونے لگے میں ایک دن دو گھڑی دن پچھلے سے اپنی پھوپھی کے مکان پر گیا وہ مولوی ابراہیم حسین صاحب کے فروکش تھیں۔ وہاں اپنی بہن سے یہی گرفتاری کا ذکر کررہا تھا کہ میری طبیعت گھبرائی اور میں چلنے لگا۔ میری بہن نے مجھے روکا بھی مگر میں اُٹھ کر ڈیوڑھی کے باہر آیا میں نے دیکھا کہ بہت سے آدمی اُس گلی میں چلے آتے ہیں اور آگے تھانہ دار ہے میں نے یہ سوچا۔ اب جو تو اُلٹا پھر کر جاتا ہے تو یہ گھر میں جاکر گرفتار کرلیں گے۔ میں سیدھا یہ کہتا ہوا ہوا۔ اُن کے سامنے سے چلا گیا بھئی ان دلّی والوں کے سبب ہم لوگ بھی مصیبت میں آگئے۔ اُن آدمیوں کے برابر سے نکل گیا اور اُنہوں نے مجھے نہ پہچانا۔ وہ آدمی اُسی مکان میں گھسے جس میں سے میں برآمد ہوا تھا۔ مگر آگے بڑی ڈیوڑھی تھی جس میں دو نو طرف راہیں تھیں۔ ایک مولوی ابراہیم صاحب کے مکان کو اور دوسری دیوان خانہ کو اُس ڈیوڑھی میں پہنچ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور مجھ سے

بھاگا نہ گیا۔ کچھ اندھیرا ہو گیا تھا۔ کچھ پولیوں کا ڈھیر کونے میں لگا ہوا تھا میں اُنکے نیچے چھُپ گیا اور اُس تھانہ دار نے گھر میں داخل ہو کر میرے پھوپا اور بھائی اور میرے بہنوئی کو گرفتار کیا اور میرے آگے سے گرفتار کرکے لے گیا۔ جب وہ چلا گیا تو میں وہاں سے نکل کر گریزاں ہُوا تو ایسا بے اوسان تھا کہ راستہ میں کئی جگہ گرا۔ غرضکہ اُفتاں وخیزاں میں اپنی خوشدامن کے مکان پر پہنچا۔ اور یہ حقیقت بیان کی اور کہا کہ اب میرا یہاں سے نکل جانا صلاح ہے ورنہ گرفتار ہو جاؤں گا۔ چنانچہ اُنہوں نے ایک شخص بوعلی نامی جو پانی پت کا باشندہ اور شاید میری خوشدامن کے بزرگوں میں سے کسی کا خانہ زاد تھا۔ اُسے بلوایا اور کہا بھائی تو مجھ پر ایک احسان کر کہ میرے دو بچوں کو یہاں سے نکال کر بچا اور کسی حفاظت کی جا پہنچا دے۔ اُس نے کہا اچھا بیگم صاحبہ میں پہنچاتا ہوں +

پانی پت سے رخصت

چھ گھڑی رات گئے وہ مجھے اور یوسف سلطان میرے بہنوئی کے چھوٹے بھائی کو لے کر مکان سے چلا اور ایک جا سے شہر کا ڈنڈا ٹوٹا ہُوا تھا۔ وہاں سے کود اکر شہر سے باہر ہو گیا اور پھر جلدی جلدی قدم بڑھا کے ہم آٹھ کوس پر ایک گاؤں شیخ زادوں کا تھا وہاں پہنچے اُس گاؤں کا نام گڑاہی تھا۔ پچھلے پہر ہم وہاں پہنچے اور گاؤں والوں کو اُس نے جگا کر ساری حقیقت بیان کی وہ لوگ نہایت مرد آدمی اور مسافر نواز تھے اُنہوں نے میری بہت خاطر و مدارات کی اور تسکین و تشفی دی کہ اب اگر تمام عمر یہاں بیٹھے رہو تو ہم پتہ نہ لگنے دیں گے کیا مقدور ہے کسی کا کہ تم کو گرفتار کر سکے۔ جب دن ہُوا تو اُنہوں نے ہم سے کہا کہ اب ایک کام کرنا چاہیئے کہ دریا کے کنارے پر کھادر ہے۔ وہاں ہم

ایک جھونپڑی ڈال دیتے ہیں۔ دن کو تو تم دونو آدمی وہاں رہا کرو اور رات کو گاؤں میں آجایا کرو اور ہماری طرح کا لباس پہن لو۔ ہم میں سے دو آدمی تمہارے پاس رہا کرینگے ہمارے مویشی وہاں چرا کرتے ہیں۔ تم دیہاتیوں کے بھیس میں رہو۔ ہم نے منظور کیا اور ہم رہنے لگے۔ پھر میں نے بو علی سے کہا کہ بھائی تم اب میرے بھائی اور میرے والد کو کہ پیر جی محمد حسین کے مکان میں چھپے ہوئے ہیں نکال لاؤ۔ تو بڑا کام کرو۔ اُس نے کہا کہ بہت اچھا۔ غرضکہ اُس دن روانہ ہوا اور تیسرے دن میرے بھائی اور آغا سلطان میرے بہنوئی کو لے کر میرے پاس پہنچ گیا میں نے اُسے کچھ روپے دے دیئے۔ ایک دن ہم سب وہاں رہے اور دوسرے روز اُن گاؤں والوں کا بہت شکریہ ادا کیا اور وہاں سے جمنا پار اُتر کر مصطفےٰ آباد سیدوں کی بستی میں پہنچے۔ مصطفےٰ آباد کی سادات نے ہماری بڑی خاطر و مدارات کی اور نہایت درجہ مہمانداری کے علاوہ کہا کہ جب تک یہ ہنگامہ ہے آپ چین سے یہیں بیٹھے رہو۔ یہاں آپ کا بال بیکا نہ ہوگا۔ ہم نے کہا یہ سب آپ کی عنایت ہے اب اس کے عوض اور ہم پر عنایت فرمائیں۔ وہ یہ ہے کہ میراں پور جا لسنٹھ والوں کے ذریعہ سے ہمیں گنگا کے پار اُتروا دیں کہ وہاں عملداری انگریز کی نہیں ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ یہ کتنی بڑی بڑی بات ہے۔ ہم آپ کو خط لکھے دیتے ہیں آپ وہ خط لے کر میر طالب علی کے پاس چلے جایئے وہ آپ کو گنگا کے پار اتروا دینگے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ہم وہ خط لے کر کرایہ کی منجھولی میں سنبل ہیڑہ پہنچے اور بیرون قصبہ ٹھہر کر میر طالب علی نمبردار کے پاس وہ خط بھیجا مگر اُنھوں نے اس امر سے صاف انکار کیا لیکن اُن کے بھتیجے میر عنایت حسین نے نہایت آدمیت کی اور وہ آکر ہم سے ملے۔ رات کو

اپنے مکان میں لے جا کر پوشیدہ رکھا۔ اور تین روز ہماری دعوت کی اور اپنے یہاں
کے گوجروں کو بلوا کر اُن سے کہا کہ ساٹھ آدمی ہمارے بھائی بند آ گئے ہیں اُن کو
کسی طرح گنگا کے پار اُتار دو۔ اُنہوں نے کہا دن کو تو ممکن نہیں مگر آئندہ شب کو
ہم ایسا کر سکتے ہیں۔ کیونکہ گنگا کے کنارے دونوں طرف گھاٹوں پر فوجوں کے
مورچے لگے ہوئے ہیں۔ اس پار انگریزی فوج کی چوکیاں ہیں۔ اُس پار نجیب آباد
والوں کے مورچے ہیں۔ قصہ کوتاہ ایک شب وہ تیس آدمی مسلح ہو کر بندوق تلوار برچھیاں
لے کر آ موجود ہوئے اور گھوڑیاں ہمراہ لائے تھے۔ کوئی پہر بھر رات گئے ہم سب کو
گھوڑوں پر سوار کرا کے ہمراہ لے چلے۔ وہاں سے دریائے گنگ سات کوس تھا۔
راستہ میں انہیں کی برادری کے گاؤں ملتے گئے مگر وہ اُن کو ہوشیار کرتے گئے
کہ اگر تم کچھ شور و غل سنو تو فوراً ہماری مدد کو چلے آنا میں نے راہ میں ایک گوجر سے
کہا کہ تم میں باہم اتفاق ہے اُس نے کہا کہ اگر اس وقت ہماری ایک بندوق چل
جائے تو تین لاکھ گوجر موجود ہو جائے۔ سب گاؤں ہمارے ہیں غرضکہ پچھلے پہر ہم
گنگا کے کنارہ پر پہنچے اور گھوڑیاں وہیں چھوڑ دیں۔ ان بیچارے گوجروں نے
ہمارے ہاتھ تھام لیئے اور ہمارا سامان سروں پر رکھ لیا دریا میں سے ہمیں پار اُتار
دیا۔ اور فیروز آباد گاؤں سیدوں کا تھا۔ وہاں پہنچ کر نمبردار صاحب کو میر عنایت حسین
کا رقعہ دیا اور ہماری رسید لکھوا کر واپس بھیجی۔ ہم رات کے ہارے تھکے سردی
کھائے ہوئے تھے پرال گھاس پر پڑ کر اور وہی گھاس اوڑھ کر سو رہے صبح
کو دوپہر کے قریب بیدار ہوئے تو ان سید صاحب نے کھانا کھلوایا اور حقیقت دریافت
کی ہم نے سب حال بیان کیا کہ اس میں نجیب آباد والے نواب کا آدمی آیا کہ رات

کون آدمی گنگا اتر کر تمہارے ہاں آئے ہیں۔ کوئی انگریزی مخبر تو نہیں ہیں۔ ہم نے کہا کہ ہم آئے ہیں۔ اس نے کہا کہ اچھا تم میں سے ایک آدمی ہمارے ساتھ چلو غرضکہ میں ہی اس کے ہمراہ ہو لیا۔ تھوڑی دور پر فوج پڑی ہوئی تھی ڈیرے خیمے لگے ہوئے تھے وہ آدمی مجھے ایک ڈیرے پر لے گیا۔ وہاں چند لوگ عزت دار کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اُن کے سامنے لے جاکر کھڑا کر دیا۔ اُنھوں نے مجھ سے حال پوچھا میں نے مختصر بیان کیا کہ تباہی زدہ دلی کا رہنے والا ہوں۔ انگریزوں کے خوف سے ہم لوگ جان بچاتے پھرتے ہیں۔ اُن میں سے ایک آدمی بولا کہ تم لوگ نوکری کر لو۔ یہاں ٹھہر جاؤ۔ میں نے جواب دیا کہ ہم نوکری کے لائق نہیں۔ ہم لوگ لکھنؤ کو جائیں گے۔ غرضکہ وہاں سے آکر اُس شب وہاں رہے۔ صبح کو کوچ کیا منزل بمنزل طے کر کے مراد آباد ہوتے ہوئے بریلی پہنچے۔ وہاں ایک دوست آغا ذہین صاحب مرثیہ گو کے مکان پر قیام کیا۔ اُس مہمان نواز نے وہ خاطر مدارات کی کہ بیان سے باہر ہے وہاں سے بڑھنے کا ارادہ تھا کہ معلوم ہوا لکھنؤ کی بھی وہی کیفیت ہوئی جو دلی کی ہوئی تھی۔ اب حیران پریشان ہوئے کہ یارب اب کدھر جائیں کیا کریں۔ پندرہ روز بریلی میں آغا ذہین کے مکان پر رہے ⁂

ایک اور آفت

ایک دن کا اتفاق ہے کہ میں اور ایک شخص دلی کا باشندہ جنگ باز خاں نامی بادشاہی سواروں میں ملازم وہ میرے ہمراہ بریلی کے بازار میں ایک مسلمان جوتے والے کی دوکان پر جُوتا پہننے کو گئے میں نے جوتا اُٹھا کر اُس کی قیمت پوچھی۔ اُس نے بیان کیا سوا روپیہ میں نے وہ جوتا رکھ دیا اُس نے پھر مجھ سے کہا رکھ کیوں دیا تم بھی تو کچھ قیمت کہو میں نے کہا کہ

بھائی مجھ میں اس قیمت کا مقدور نہیں۔ میں سستی قیمت کا جوتا چاہتا ہوں۔ میں غریب تباہی زدہ ہوں۔ پھر اُس نے پوچھا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو۔ میں نے کہا کہ دلّی کے وہ بولا کہ تم لوگ بڑے نامرد ہو کہ تم نے دلّی تڑوا دی۔ اور اب گھر بار لٹوا کر بھیک مانگتے پھرتے ہو۔ یہ بات سُنکر میں تو خاموش رہا۔ مگر جنگ باز خاں سپاہی آدمی قوم کا مغل بچہ اور لال کنوئیں کا رہنے والا جہاں کے لُچّے بڑے بڑے مشہور ہیں۔ بھلا آنکا صاحب کو کہاں تاب کہ ایسے سخت کلمے کی برداشت کریں۔ جواب دیا "بٹیا گھبراؤ نہیں چچا کے بیٹے آئے جاتے ہیں۔ جورو کے پاجامے میں چھپتے پھرو گے"۔ یہ کہنا تھا کہ اُس جفت فروش نے کھڑے ہو کر ایک ہاتھ سے میرا ہاتھ پکڑ دوسرے ہاتھ سے جنگ باز خاں کا اور بہ آواز بلند پکار کر کہا کہ یارو دوڑو یہ دونو انگریزی مخبر ہیں۔ یہ کلمہ ہمارے حق میں غضب ہو گیا۔ چہار طرف سے پوربیے دوڑ پڑے اُس وقت بازار میں سوار پیادوں کی یہ کثرت تھی کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا بازار میں رستہ نہ ملتا تھا اتنے ہی پوچھا نہ گچھا ہم دونوں کی مشکیں کس لیں اور کہا کہ جرنیل صاحب کے پاس لے چلو۔ اور ہم دونو کو باندھ کر لے چلے۔ ایک انبوہ خلائق ہمراہ ہوتا جاتا ہے جیسے کسی کو گردن مارنے کے لیئے لے جاتے ہیں۔ وہاں سے نصف میل پر قلعہ تھا قلعہ کے سامنے ڈیرے کھڑے تھے۔ وہاں ایک ڈیرے کے آگے ایک پوربیا پچاس پچپن برس کی عمر کا گلے میں موٹے سونے کے دانوں کا کنٹھا پہنے ہوئے بیٹھا تھا اُس کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا اور بیان کیا کہ یہ دونوں انگریزی مخبر ہیں۔ ہم ان کو گرفتار کر کے لائے ہیں۔ جرنیل صاحب کا عدل و انصاف ملاحظہ ہو، کہ بغیر تفتیش حال حکم دے دیا کہ توپ سے باندھ کر اُڑا دو۔ اُسی وقت وہ جودھ توپیں ڈیرے کے آگے

لگی ہوئی تھیں۔ اُن میں تھیلیاں بارود کی ڈال کر ہم دونوں کو توپوں کے منہ سے باندھ دیا۔ اور نواب خان بہادر خاں والیِ بریلی سے کہلا بھیجا کہ دو مخبر انگریزی گرفتار ہوئے ہیں اُن کو اڑانے کا حکم ہو جائے۔ تھوڑی دیر میں وہاں سے بھی سوار نے آکر حکم پہنچایا کہ اُڑا دو۔ یہ باتیں ہم سب سُن رہے تھے اور آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے کہ یا الٰہی کس بلائے ناگہانی میں گرفتار ہو گئے۔ گھر سے تو اسی مصیبت سے جان بچا کر آئے تھے اور یہاں آکر پناہ پذیر ہوئے تھے۔ یہ نہ معلوم تھا کہ ہماری قضا یہاں لکھی تھی معلوم ہوا کہ ہماری موت ہم کو کھینچ کر لائی تھی۔ اب تیرے سوا ہمارا فریادرس کون ہے۔ جنگ باز خاں میرے مُنہ کو تکتا ہے۔ اور میں جنگ باز خاں کو دیکھ رہا ہوں اسی اثنا میں دوسرا سوار خان بہادر خاں کے پاس بھیجا گیا اور وہ بھی یہی حکم لایا۔ ہم کو اپنی زندگی سے بالکل یاس ہو گئی اور بندھے ہوئے کلمہ پڑھ رہے ہیں اور میرا حکم آنے کی دیر ہے وہ حکم آئے تو توپ کو بتی دکھائی جائے۔ اُس وقت اُس کی شان رحیمی کو دیکھنا چاہیئے کہ پردۂ غیب سے کیا نمودار ہوتا ہے اور ہم کو پنجۂ اجل سے کس طرح نجات دیتا ہے۔ وہی مثل ہے کہ مارنے والے سے بچانے والا زیادہ قوی ہے۔

چو عاجز رہانندہ دانم ترا ۔۔۔ دریں عاجزی چوں نخوانم ترا

ناگہاں دیکھتے کیا ہیں کہ قلعہ کے دروازہ میں سے کچھ سپاہی دوڑے ہوئے چلے آتے ہیں اور پیچھے اُن کے ایک شخص سنہرے گھوڑے پر سوار سفید پوش سفید مندیل باندھے ہوئے ہماری طرف چلا آتا ہے اور اُس کے جلو کے سپاہیوں نے آتے ہی کہا کہ ہٹ جاؤ اور سب بھیڑ کو ہٹا دیا۔ نووارد سوار نے پیشتر جا کر جنگ باز کو دیکھا اور دیکھتے ہی جنگ باز سے کہا۔ ارے جنگ باز تو کہاں؟ جنگ باز نے مجھے کیا دیکھتے ہو۔

دوسرے کو دیکھو کون ہے۔ جب مجھے دیکھا تو فی الفور گھوڑے سے کود کر جلدی تلوار سے وہ رسّی کاٹ دی جس سے مجھے جکڑ رکھا تھا اور جنگ باز کی بھی رسّی کاٹ کر ہم دونوں کو چھڑایا اور ہمارا ہاتھ پکڑ کے اُس جرنیل کے سامنے لے گیا اور ہزاروں گالیاں مغلّظات اُس نامعقول کو سنائیں اور کہا نمک حراموں تم نے ہمارے بادشاہ کا گھر تباہ کرایا و دلی کا ستیاناس کر دیا۔ رعیّت کو خاک میں ملا کر گھر سے بے گھر کر دیا۔ اور اب بھی اپنی شرارت سے باز نہیں آتے۔ ارے یہ بادشاہی ملازم ہیں۔ بیچارے غریب انگریزوں کے خوف سے اپنی جان بچائے پھرتے ہیں یہ کیا مخبر ہیں تو نے حال تو پوچھا ہوتا۔ یا پہلے بغیر پوچھے گچھے گردن مارنے کا حکم دے دیا۔ اگر اس وقت میں نہ آتا تو ان دونوں بے گناہوں کو جان سے مار چکا ہوتا۔ ان کی زندگی تھی کہ میں آگیا۔ یہ کہہ کر وہ مجھ سے حال پوچھنے لگا جنگ باز نے ساری حقیقت بیان کر دی پھر اُس نے کہا کہ تم میرے مکان پر آنا۔ اور ہم سے کہا کہ تم اپنے مکان کو جاؤ۔ اب یہ بات معلوم کرنی چاہیے کہ وہ ہمارا محسن کون تھا جس نے اس بیکسی کے وقت میں جان بچائی وہ ہمارا خواجہ تاش بادشاہی ملازم کہاروں کا داروغہ میر فتح علی تھا۔ خیر جب ہم نے اس بلا سے نجات پائی اپنے مکان پر پہنچے تو میرے والد اور سب ہمراہی فکرمند تھے کہ خدا جانے وہ دونو کہاں چلے گئے کس بلا میں مبتلا ہو گئے۔ سب پوچھنے لگے کہاں چلے گئے تھے جو اتنی دیر لگی جنگ باز نے سب حال بیان کیا کہ ہم تو موت کے شکنجے سے نکل کر آئے ہیں۔ سب سن کر حیران و پریشان ہو گئے۔ مگر خدا کا شکر ادا کیا کہ زندہ سلامت آ گئے۔ اس واقعہ کے بعد یہ خیال ہوا کہ یہ جائے معرضِ خطر ہے یہاں سے نکلنا چاہیے مبادا یہاں لشکر انگریزی آن پہنچے اور ہم گھر جائیں۔ دلّی سے تو بھاگ کر یہاں آئے اب یہاں سے نکل کر

کہاں جائیں گے۔ ہم خیال دوڑا رہے ہیں کہ کوئی جائے مفر نظر نہیں آتی اب مسبب الاسباب کی قدرت کو دیکھا چاہیئے کہ اُس حالتِ یاس و درماندگی و سراسیمگی میں کس طرح اُس پُر آشوب حالت سے نکال کر ساحلِ عافیت کو پہنچاتا ہے کہ ایک روز بازار میں ایک شخص ہموطن کو دیکھا کہ مسافروں کی طرح کمر بندھی ہوئی ہاتھ میں لکڑی مُنہ پر غبار پڑا ہوا اور ایک عورت اُس کے عقب میں چادر سے مُنہ چھپائے ایک چھوٹی پوٹلی بغل میں مارے چلی آتی ہیں۔ جب پاس آئے تو اُنھوں نے مجھے اور میں نے اُن کو پہچانا صاحب سلامت ہوئی۔ آہا میر غلام عباس تم کہاں وہ بولے میں لکھنؤ سے چلا آتا ہوں میں نے پوچھا کہاں ٹھیرو گے کہا خدا جہاں ٹھہرائے میں نے کہا جہاں ہم ہیں وہاں تم بھی چلو۔ اور وہاں سے ہم تم شامل ہو کر خدا جہاں لے جائے وہاں چلے چلیں گے۔ وہ میرے ساتھ ہو لئے اور مکان فرودگاہ پر پہنچے۔ سب سے ملے اُنھوں نے اپنی تمام حقیقت بیان کی۔ خیر اُس دن تو وہیں مقیم رہے۔ دوسرے روز صلاح و مشورے سفر کے ہوئے اُنھوں نے صلاح دی کہ رام پور سے بہتر کوئی جا مفر کی نظر نہیں آتی۔ میری شامتِ اعمال مجھے لکھنؤ کھینچ کر لے گئی تھی۔ وہاں بھی وہی صورت پیش آئی جو دلی میں ہوتی تھی غرضکہ سب کی رائے اس پر قرار پائی۔ کہ رام پور چلو۔ مگر چلیں کیونکر راستہ مسدود ہے رام پور اور بریلی کی سرحد پر مورچے بندھے ہوئے ہیں۔ فوجیں پڑی ہوئی ہیں۔

اور وہ وقت وہ ہے کہ بریلی میں سب طرف کے مفرورین کا اجماع ہے اور سب سردار مثل نانا راؤ اور فیروز شاہ وغیرہ اور دلی لکھنؤ کے آدمی جمع ہیں۔ رام پور کے تیس ہزار آدمی بریلی میں ملازم ہیں اور سرحدِ رام پور کا یہ حال ہے کہ ایک ایک پٹھان

کا دوپٹہ سر سے بندھا ہوا ہے اور اُس پر گوٹا لگا ہُوا ہے۔ آدھا دوپٹہ سر سے بندھا اور آدھا گھوڑے کی رکاب سے نیچے لٹکتا ہوا ہے اور چار چار طپنچے کمر میں لگے ہوئے دوہری تلواریں ڈاب میں لٹکتی ہوئیں ہیں۔ گھوڑوں پر سوار ہیں اور شہر میں گھوڑے کودا تے پھرتے ہیں۔ پچاس ہزار سوار کا اجماع بریلی میں موجود ہے اور سپاہ انگریزی کی آمد کی خبر چار طرف سے گرم ہے قصہ مختصر اُس کے دوسرے روز ہم سات آدمی بریلی سے نکل کر رستہ کو چھوڑ کر جنوب کی جانب روانہ ہوئے اور یہ ارادہ کیا کہ غیر راہ سے رامپور داخل ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ہم بریلی سے روانہ ہو کر قصبہ آنولہ میں پہنچے اور وہاں ایک مسجدِ کہنہ میں جا کر مقیم ہوئے۔ آنولہ کے ایک مرد آدمی مُسن آکر ہم سے ملے اور تفتیشِ حال کرنے لگے بروقت دریافتِ حال وہی کلمات انہوں نے بیان کئے جو حجت فروش نے کئے تھے جنگ باز پھر کچھ کہا چاہتا تھا کہ میں نے اُس کے منہ پر ہاتھ دھر دیا تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ دیکھنے کیا ہیں جنگل کی طرف سے دو سوار سراسیمہ گھوڑے دوڑاتے ہوئے چلے آتے ہیں اور اُسی مسجد کی سیڑھیوں پر آکر گھوڑوں پر سے اُترے اور گھوڑوں کو درخت سے باندھا۔ وہ مسجد میں داخل ہوئے۔ جب پاس آئے تو میں نے اُن کو پہچانا کہ احمد خاں جرنیل چھچھرکے ہیں۔ اہا جرنیل صاحب آپ کہاں۔ انہوں نے بیان کیا کہ کچھ کے گھاٹ پر میری مورچہ بندی تھی اور بیس ہزار فوج سوار و پیادہ معہ توپخانہ جات وغیرہ میرے زیرِ حکم تھے جب انگریزی فوج دریائے گنگ سے اس طرف عبور کرنے لگی، تو میری فوج بغیر لڑے بھڑے بھاگنی شروع ہو گئی۔ ہر چند روکا گیا مگر کون سنتا تھا اور سب ہم کو تنہا چھوڑ کر مفرور ہو گئے فقط ہم دو باپ بیٹے رہ گئے تھے لاچار ہم بھی اپنی جان بچا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ جب یہ تقریر احمد خاں کی ختم ہوئی تو جنگ باز خاں

نے اُن پیر مرد کو سلام کیا جو ہم کو لوداا ور نام رد شناررہے تھے وہ حضرت اُسی وقت اُٹھ کر منتشر الحواس اپنے مکان کو روانہ ہوئے ہم لوگوں نے اُس روز آنولہ میں قیام کیا۔ دوسرے روز صبح کو وہاں سے روانہ ہو کر مقام شاہ آباد عملداری رام پور کا ارادہ کیا وہ مقام آنولہ سے اٹھارہ کوس تھا۔ غرضکہ بارہ کوس راہ دن میں طے کی اور پھر تھک کر چور ہو گئے، چلنے کی طاقت نہ ہوئی' پاؤں سوج گئے تلوؤں میں آبلے پڑ گئے۔ جاٹوں کا ایک گاؤں تھا اُس گاؤں کے باہر تالاب کے کنارے پر ایک درخت کے نیچے ہم نے مقام کیا۔ اسی اثنا میں ایک مسلمان نجار گاؤں میں سے پانی بھرنے آیا ہم کو دیکھ کر اُس نے کہا کہ تم لوگ یہاں کیوں پڑے ہو۔ جاؤ اپنا رستہ لو۔ گاؤں والے تم کو دیکھیں گے تو مار ڈالیں گے۔ یہ لوگ مسلمان پٹھانوں کی جان کے دشمن ہیں۔ کیونکہ خان بہادر خاں کی عملداری میں جو لوگ ان پر حاکم رہے ہیں۔ انہوں نے اُن پر بڑے ظلم و ستم کئے ہیں اب یہ لوگ اپنا بدلہ لے رہے۔ ہم نے کہا کہ ہم بھی مرنے کو پھرتے ہیں مگر ہم ایسے سخت جان ہیں کہ ہمیں کسی طرح موت نہیں آتی۔ ہم خدا سے چاہتے ہیں کہ ہمیں کوئی جان سے مار ڈالے کہ اس روز کی مصیبت سے نجات حاصل ہو۔ وہ نجار پانی کا گھڑا سر پر رکھ کر گاؤں کو روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر واپس آیا اور آ کر کہا کہ تم کو مقدم جی بلاتے ہیں۔ ہم نے جواب دیا ہم فقیر ہیں ہمارا گاؤں میں کیا کام ہے ہمیں یہیں پڑا رہنے دے۔ رات کو بسیرا لے کر صبح کو چلے جائیں گے۔ اس شخص نے نہ مانا۔ اور ہم کو اپنے ہمراہ چوپال میں لے گیا وہاں جا کر ہم نے دیکھا کہ ایک شخص بڑا قوی ہیکل جوان داڑھی چڑھائے ہوئے ایک بہت بڑے ماچے پر لیٹا ہے اور آگے اس کے ایک بہت بھاری لٹھ دھرا ہے اُس جوانمرد نے ہم کو دیکھ کر کہا او میاں جی

بیٹھ جاؤ۔ برابر اس کی دوسرا ماچا او نچے پایوں کا بچھا ہوا تھا۔ اُس پر ہم کو بیٹھنے کی اجازت دی۔ ہم بیٹھ گئے اور وہ عورت جو ہمارے ہمراہ تھی الگ ایک گوشہ میں جا بیٹھی اُس نے (مرد مالک دہ نے) ہم سے استفسار حال کیا ہم نے بیان کیا کہ ہم پردیسی ہیں۔ دلّی کے رہنے والے ہیں۔ تباہ و برباد ہو کر گھر سے نکلے ہیں۔ انگریزوں کے خوف سے جان بچائے پھرتے ہیں۔ رام پور جانے کا ارادہ ہے اُس مرد رحم دل نے ہمارے حالِ زار پر بہت تاسف کیا اور ہمارے مُنہ ہاتھ دُھلوائے۔ تھوڑی دیر بعد مکئی کی روٹیاں گھی سے چپڑی ہوئی اور دال اور ایک برنجی کاسے میں دودھ اور شکر منگوا کر ہمارے آگے رکھے اور ہم سے کہا کہ اچھی طرح خوب سیر ہو کر کھا لو اُس نیک بخت عورت کے لیئے علیحدہ روٹی منگوا دی۔ بعد تناول طعام کے ہم اُسی چوپال میں جا کر سو رہے۔ صبح کو جب ہم نے چلنے کا ارادہ کیا تو اُس مردِ با مروّت نے ہم سے کہا کہ تمہارے پاؤں تو سوجے ہوئے ہیں۔ راستہ کیونکر طے ہوگا۔ اور اپنے گاڑیبان کو بلا کر کہا کہ ان کو گاڑی میں سوار کر کے شاہ آباد پہنچا آؤ۔ علاوہ برین پانچ روپیہ اور اپنے پاس سے زادِ راہ ہمارے حوالے کیئے۔ ہم نے ہر چند لینے سے انکار کیا مگر اُس عالی ہمّت نے ہرگز نہ مانا اور ہم کو سوار کرا کر شاہ آباد پہنچا دیا۔ ہم نے خدا کی رزق رسانی کا لاکھ لاکھ شکریہ ادا کیا ؎

عدو شود سببِ خیر گر خدا خواہد

ریاست رامپور میں ورود

اب ہم شاہ آباد میں پہنچے وہاں رام پور کی عملداری تھی اور رام پور وہاں سے بارہ کوس تھا ہم یہ مشورہ قرار پایا کہ آج تو یہیں قیام کرنا چاہیئے صبح کو یہاں سے رام پور روانہ ہونگے

غرضکہ اُس دن اور اُس شب کو ہم وہیں مقیم رہے علی الصباح قبل از نماز میں ٹالے کر رفعِ حاجت کے واسطے سرا کے باہر کیا۔ ہنوز فارغ نہیں ہوا تھا کہ میں نے دیکھا مغرب کی جانب سے فوجِ کثیر چلی آتی ہے ہیں دم بخود ہو رہا۔ اور اُس فوج نے آبادی کے باہر اپنا قیام کیا اور دو توپیں سلامی کی سر کیں میں فارغ ہو کر سرائے میں آیا اور یہ ماجرا اپنے ہمراہیوں سے بیان کیا۔ اسی اثنا میں فوج کے چند آدمی سرا میں داخل ہوئے اور گاؤں والوں پر تشدّد کرنے لگے اور اکثر آدمی سرا میں بھی آکر فروکش ہوئے ہم ایک جانب کو ایک حجرے میں ٹھہرے ہوئے تھے وہ لوگ اور حجروں میں آکر مقیم ہوئے۔ ہم نے باہم صلاح کی کہ آج کوچ کرنا مناسب نہیں کیونکہ انگریزی فوج کی آمد و رفت ہے مبادا ہم کو باغی تصوّر کر کے جان سے مار ڈالیں۔ ہم توکّل بخدا کر کے وہیں ٹھہر گئے کہ صبح کو یہاں سے کوچ کریں گے غرضکہ اُس روز اور اُس شب وہ فوج بھی وہیں رہی اور ہم بھی وہیں رہے ہم سے کسی نے کچھ مزاحمت نہ کی صبح کو فوج آنولہ کی جانب روانہ ہوگئی اور ہم رامپور کو چل نکلے۔ اثناء راہ میں جو سواران مفرور بریلی کے اُس فوج کو ملے سب تہ تیغ بیدریغ ہوئے مگر ہم تو خدا کی عنایت سے صحیح سالم قریب شام رام پور پہنچے۔ دروازہ شہر میں سے شہر کے اندر داخل ہونا چاہا مگر دروازہ پر بندوبست تھا۔ دربانوں نے ہم کو مسافر سمجھ کر شہر میں نہ آنے دیا مجبور ہو کر دوسرے دروازہ شہر پر گئے وہاں بھی یہی کیفیت دیکھی حیران ہوئے کہ یا الٰہی اب کیا کیجیے میر غلام عباس شہر کے حال سے خوب واقف تھے۔ وہ وہاں رہ کر لکھنؤ کو گئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اور راہ سے تمہیں شہر میں لے چلوں۔ غرضکہ ایک جا سے بانسوں کی چار دیواری شہر کی ٹوٹی ہوئی تھی۔ اُس طرف سے ہم شہر میں داخل ہوئے

اب یہ فکر ہوا کہ شہر میں تو آگئے۔ اب کہاں قیام کریں میر غلام عباس نے کہا کہ ایک شخص میر ابراہیم علی نامی دلّی کے رہنے والے یہاں رہتے ہیں اُن کے مکان پر چلو پانچ چھ گھڑی رات گئے اُن کے مکان پر پہنچے اور اُن کو بلایا۔ وہ باہر آئے اُنھوں نے سب کو شناخت کیا مجھ سے اُن سے کچھ قرابت بھی تھی وہ گلے سے ملے اور اُن کی ڈیوڑھی میں ہم سب بیٹھے۔ باہم حال پُرسی ہوئی منوز یہ کیفیت بیان ہو رہی تھی کہ ایک فتنہ دیگر برخاست ہوا۔ ایک عورت ہمسایہ دکان میں یہ حال سُن رہی تھی۔ کہ اک بارگی اُس نے غل مچایا کہ محلہ والو دوڑو اس سید کے گھر میں باغی لوگ آکر چھپے ہیں۔ ہر چند میر ابراہیم علی نے ہاتھ جوڑے منتّیں کی قسمیں کھائیں کہ یہ باغی نہیں ہیں میرے بھائی بند ہیں دلّی سے آئے ہیں۔ وہ بدبخت کب سُنتی تھی۔ آخر اُنھوں نے اُس سے کہا کہ اچھا میں اُن کو اور جا پہنچا دیتا ہوں تو خاموش ہو جا۔ وہ ہم کو ہمراہ لے کر ایک ایرانی کے مکان پر پہنچے اور اُن سے جا کر بیان کیا کہ یہ لوگ میرے عزیز قریب ہیں آپ اتنی عنایت کریں کہ آج کی رات ان کو اپنے مکان پر مہمان رکھیں۔ صبح کو میں اپنے ہمراہ لے جاؤں گا۔ وہ اس بات پر راضی ہو گئے اور ہم شب کو وہیں رہے۔ صبح کو اٹھ کر ہم مکان سے باہر ہوئے میر غلام عباس سے کہا اب کیا تدبیر ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ آؤ سب تو چل کر اجیت پور کی سرا میں بیرون شہر قیام کریں میں تم کو ایک امیر حاتم ہمّت کے مکان پہ لئے چلتا ہوں اگر اُس نے حامی بھر لی اور تم کو اپنے مکان پر ٹھیرا لیا تو پھر نواب صاحب بھی نہیں نکال سکتے۔ غرضکہ اور سب کو تو سرائے اجیت پور کو روانہ کیا اور میں اور غلام عباس ان امیر صاحب کے مکان پر پہنچے۔ وہاں جا کر میں نے دیکھا کہ بڑا دروازہ ہے اور اُس میں ایک بڑا دیوان خانہ ہے۔ اور ایک چوبی تخت بچھا ہوا ہے

اُس پر جانماز بچھی ہوئی ہے اور ایک مرد پیر نورانی شکل بیٹھے ہوئے تسبیح پڑھ رہے ہیں۔ میر غلام عباس کو دیکھتے ہی بیتاب ہو کر دوڑے سارے میاں غلام عباس تم کہاں چلے گئے تھے۔ تمہارے دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔ غرضکہ باہم مصافحہ کر کے ہم تینوں شخص تخت پر بیٹھے میر غلام عباس سے اُن حضرت نے حال دریافت کیا اُنہوں نے از ابتدا تا انتہا اپنے لکھنؤ جانے اور واپس آنے کی کیفیت بیان کی پھر میری جانب مخاطب ہو کر ان بزرگوار نے فرمایا۔ ان کی تعریف بیان کیجیے میر غلام عباس نے کہا ان کا حال نہ دریافت کیجیے۔ آپ کو سُننے کی تاب نہ ہوگی۔ خلاصہ یہ ہے کہ دلّی کے رہنے والے ہیں اور عمائد شہر سے ہیں مگر اب تو مصیبت زدہ مظلوم سید ہیں۔ جب سید کا لفظ اُن کی زبان سے نکلا تو وہ بزرگوار کریم الصفات اُٹھ کر مجھ سے بغلگیر ہوئے اور میر غلام عباس سے کہا کہ واسطے خدا کے تم مفصل حال بیان کرو۔ ان کی کیفیت سن کر میرے دل پر نہایت صدمہ ہوا۔ میر غلام عباس نے بیان کیا کہ فلاں فلاں شخص ہیں اس مناصب کے لوگ ہیں گھر بار لٹ گیا۔ خانہ ویراں ہو کر اپنی جان بچائے پھرتے ہیں۔ زمین بھی اپنے اوپر پاؤں رکھنے نہیں دیتی۔ اگر آپ سادات نوازی فرما کے اپنے مکان پر ان کو تھوڑی سی جا دیں اور کوئی دن ٹھہرائیں یہ آپ کے احسان مند ہونگے۔ یہ سُنکر وہ فرشتہ سیرت بولے میرے کہاں نصیب کہ پانچ یا چار بنی فاطمہ میرے فقیر خانہ پر مہمان ہوں۔ میری عین سعادت اور خوش نصیبی ہے کہ یہ میرے مکان پر تشریف رکھیں اور اس کے ساتھ یہ امر بھی آپ یاد رکھیے۔ جب تک فصیح اللہ خاں کا جسم سلامت ہے کسی کا مقدور نہیں کہ اُن کی جانب آنکھ اُٹھا کر دیکھ لے۔ اُسی وقت حکم دیا کہ میری منجھولی لے جاؤ اور باقی صاحبوں

کو سوار کرکے لے آؤ۔ غرضکہ دیوان خانہ میں فرش کرا دیا۔ خدمتگاروں سے کہہ دیا
خدمت میں حاضر رہو اور گھر میں کھانا تیار کرانے کا حکم بھجوا دیا۔ تھوڑی دیر میں میرے
والد اور بھائی اور بہنوئی بھی آگئے۔ نواب صاحب سب سے ملے اور بہت خوش
ہوئے اور کھانے کے واسطے گھر میں کہہ دیا کہ دونوں وقت تیار کرکے بھجوا دیا کرو۔
غرضکہ اب فضل الٰہی شامل ہوا اور اس دشت گردی صحرانوردی سے نجات پاکر
ایک امن کے گنبد میں ہم ہو بیٹھے۔ دو تین روز کے بعد اس رئیس مسافر نواز نے
یہ اور احسان کیا کہ نواب یوسف علی خاں صاحب بہادر مرحوم کے پاس گئے۔ نواب
صاحب نے پوچھا دادا صاحب آج آپ کس طرح تشریف لائے کہا کہ میں تمغہ
بے بہا آپ کے واسطے لایا ہوں۔ نواب صاحب بہادر نے پوچھا کیا تمغہ ہے
فصیح اللہ خاں صاحب نے کہا زادِ عقبیٰ۔ نواب صاحب نے دریافت کیا کہ زادِ
عقبیٰ کونسا ہے کہا کہ پانچ شخص بنی فاطمہ کو میں نے اپنے مکان پر پناہ دی ہے۔
تم سے اس بارہ میں امداد کا خواستگار ہوں تاکہ تم اس کارِ خیر میں شریک ہو۔ وہ
یہ ہے کہ یا تو تم صاف مجھ سے کہہ دو کہ تم ان کو اپنے مکان پر نہ رکھو تو میں اُن
کو رخصت کردوں یا حمایت کرو تو پوری کرو۔ بعد چار دن کے اگر تم اُن کو گرفتار کر
کے انگریزوں کے سپرد کردو تو یہ مجھ سے گوارا نہ ہوسکے گا جب میرا سر کٹ جائیگا
جب کوئی اُن کو ہاتھ لگائے گا۔ نواب صاحب بہادر نے فرمایا کہ بھلا دادا صاحب
میں ایسا شخص ہوں کہ سادات میرے گھر پر آکر پناہ پذیر ہوں اور میں ان کو آگے
دے کر قتل کرا دوں۔ ہرگز مجھ سے نہ ہوگا بشرطیکہ بریلی میں نوکری نہ کی ہو۔ فصیح اللہ
نے قسم کھائی کہ نہیں حضرت اُنہیں نوکری سے کیا تعلق وہ تو دلی کے آدمی ہیں۔

بادشاہی ملازم وہ بریلی میں کیا نوکری کریں گے۔ شاید تم ان لوگوں کے نام و نشان سے واقف ہو کیونکہ دلّی میں بہت دنوں تک رہے ہو۔ جب فصیح اللہ خاں صاحب نے نام بتلائے عہدے بتائے نواب صاحب نے فرمایا میں سب سے واقف ہوں کوئی بغاوت پیشہ نہیں ہے۔ شوق سے اپنے گھر میں رکھو اور اُن کا اطمینان کر دو کہ اب کسی طرح کا تم کو جان کا اندیشہ نہیں میں سمجھ لوں گا۔ بریلی کا فیصلہ ہونے کے بعد میں خود تمہاری صفائی انگریزوں سے کرادوں گا اور معافی نامہ دلادوں گا چین سے یہاں بیٹھے رہو۔ یہ باتیں کر کے فصیح اللہ خاں صاحب وہاں سے خوشی خوشی مکان پر آئے اور ہم سب سے کہا کہ تو مبارک ہو میں نواب صاحب بہادر سے تمہاری صفائی کرآیا۔ نواب صاحب بہادر نے وعدہ فرمایا ہے کہ میں انگریزوں سے معافی نامہ دلادوں گا۔ جہاں جی چاہے رہو۔ کوئی مزاحم نہ ہوگا۔ غرضکہ اس امر کے بعد ہم کو اطمینان کلی حاصل ہو گیا۔ اور اپنے بے خوف و خطر رہنے سہنے لگے داغ صاحب کو خبر ہوئی۔ وہ اسی روز آکر ملے اُنہوں نے یہ حسنِ سلوک کیا کہ مجھے اور میرے چھوٹے بھائی امراؤ مرزا انور کو صاحبزادہ محمد رضا خاں صاحب داماد نواب یوسف علی خاں صاحب مرحوم کی سرکار میں نوکر رکھوا دیا۔ صاحبزادہ موصوف کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا اور منشی امیر احمد صاحب مینائی مرحوم آکر نواب کی غزل اور اپنی غزل پڑھا کرتے تھے۔ صاحبزادے محمد رضا خاں صاحب نے فرمایا کہ تم بھی غزلیں لکھو ہم نے ہر چند انکار کیا کہ ہنوز ہمارے اوسان درست نہیں ہیں مصیبت زدہ ہیں کیا غزل لکھیں گے۔ مگر صاحبزادے صاحب موصوف نے زیادہ تر اصرار کیا ناچار ہم نے غزلیں لکھ کر مشاعرہ میں پڑھیں بس اسی روز سے تمام رام پور میں ہمارے

کلام کی شہرت ہو گئی۔ خلقت نے ہماری گرویدگی اختیار کی۔ نواب صاحب بہادر نے حسبِ وعدہ بمبئی میں جاکر صاحبان انگریز سے صفائی کا سارٹیفکیٹ حاصل کر کے ہمارے پاس بھجوا دیا۔ عرصۂ چار سال کے قریب ہم رام پور میں رہے انہیں ایام میں ہمارے گھر کے آدمی بھی پانی پت سے رام پور پہنچ گئے +

چھٹا باب

وطن کو مراجعت

نواب فصیح اللہ خاں صاحب جن کے اوصاف حمیدہ اوپر بیان ہو چکے ہیں یہ نواب فیض اللہ خاں بہادر مرحوم کی اولاد میں سے تھے اور نواب یوسف علیخاں بہادر نواب رام پور کے رشتہ کے داماد ہوتے تھے۔ زمانۂ قیام رامپور میں جب میرے گھر کے آدمی میرے پاس پہنچے ہیں تو ایک سال بعد میرے گھر میں لڑکا پیدا ہوا۔ اور اُن کا نام سجاد مرزا رکھا گیا۔ وہ بچہ سات مہینے کا تھا جب اشتہار واگذاشت جائداد دہلی کا میرے پاس پہنچا اور مضمون اشتہار یہ تھا کہ سرکار نے کُل رعایا کا قصور معاف فرمایا جس جس کی جائداد دلّی میں ہو وہ آکر سرکار میں عرضی گذرانے بعد تحقیقات اُس کو سارٹیفکیٹ وراثت کا دیا جائے گا۔ چنانچہ اُسی خوشی میں ہی رام پور سے دلی کو آیا تو اُس زمانہ میں ہملٹن صاحب کمشنر تھے اور کوپر صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر دہلی تھے مگر یہ دونوں حاکم ایسے رحم دل منصف و عادل رعایا پر مہرو داد گستر تھے کہ اُن کی تعریف میری زبان سے ادا نہیں ہو سکتی۔ ان دونوں

بہادروں نے دلّی کو آکر آباد کیا اور خلقت کو شہر میں بسایا اور وہ رعیّت نوازی فرمائی کہ رعیّت کے دل سے سب رنج و غم زمانۂ غدر کا بھلا دیا۔ میں نے شہر آشوب میں کو پر صاحب بہادر کی تحریف میں ایک بند لکھا ہے فی الحقیقت وہ بیان واقعی ہے اُس میں کچھ مبالغہ نہیں ہے یا تو وہ زمانہ تھا سرکار کا نائرہ قہر و غضب التہاب پر تھا اور صد ہا مخبر چھوٹے ہوتے تھے۔ اور جا بجا سے دلّی کے آدمی گرفتار ہو کر دلّی میں چلے آتے تھے اور دلّی میں تین پھانسیاں گڑھی ہوئی تھیں۔ ہر روز سینکڑوں پھانسی پر کھینچے جاتے تھے اور ڈکاوت صاحب شکار کھیلتے پھرتے تھے جس کو جوان دیکھتے تھے طمنچہ سے شکار کرتے اور کچھ پرسش قصور بے قصور کی نہ تھی چنانچہ بہت سے آدمی بے قصور دلّی کے مثلاً کہ جن میں اکثر امیر زادے اور نام آور اشخاص تھے مثل نواب محمد حسین خاں اور نواب مظفر الدولہ اور میر محمد حسین وغیرہ سکنائے محلہ بلی ماراں اور سے گرفتار ہو کر دلّی کو آتے تھے۔ جب مقام گڑگانوے میں پہنچے تو حاکم ضلع نے حکم دیا کہ اُن کا دلّی لے جانا کچھ ضرورت نہیں ہے۔ اُن کا یہیں فیصلہ ہو جانا چاہیئے اور اُن غریبوں کو وہیں باڑیں ماردی گئیں اور اُن کا کام تمام کر دیا۔ دلّی میں ہزاروں بیگناہ پھانسی پا گئے اور بادشاہ کو قید کر کے معہ زینت محل بیگم و جواں بخت و شاہ عباس وغیرہ شاہزادگان خورد سال کو ہمراہ بادشاہ رنگون میں لے جا کر نظر بند رکھا گیا۔ یا ایک زمانہ یہ دیکھنے میں آیا کہ نواب[1] وائسرائے لارنس صاحب بہادر گورنر جنرل ہو کر ولایت

---

[1] یہ وہی لارڈ لارنس ہے جو غدر کے ایام میں پنجاب کے لفٹنٹ گورنر (چیف کمشنر) تھا۔ لارڈ ایلگن کے مرنے پر ۱۸۶۳ء میں اسے ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر کیا گیا۔ بادشاہ کے مقدمہ میں کمیشن کے فیصلہ پر اسی نے ریویو لکھا تھا اور بادشاہ کو جلاوطن کرنے کی سفارش کی تھی (باقی حاشیہ ص ۱۹۹)

سے ہندوستان کو آئے اور حکام عادل رحمدل مقرر کئے گئے اور رعیت کو مثل اولاد کے چھاتی سے لگایا گیا اور جا بجا سے بُلا کر دلّی میں آباد کیا گیا اور سب کی جائداد واگذاشت فرمائی۔

یہ وہی نوٹ صاحب حاکم گڑگانواں تھے جنھوں نے گرفتاران الور کو اثنا راہ میں تہ تیغ کیا تھا اب مقام کجلی بن میں متصل پیلی بھیت پہنچ کر اسمٰعیل خاں جرنیل کی معرفت تمام باغیان باغیہ فوج کا قصور معاف فرمایا۔ اور گھوڑے اور ہتیار لے لے کر سارٹیفکیٹ معافی قصور کے تقسیم کئے اور اُن کو گھروں کو روانہ کیا میں اُن روزوں میں مقام رامپور میں مقیم تھا جب یہ معاملہ پیش آیا ہے اور اسمٰعیل خاں جرنیل فوج باغیہ رام پور میں آئے ہیں اور اُن سے ملاقات ہوئی ہے۔ اُن کی زبانی یہ سب حال مجھ کو معلوم ہوا اُس وقت تک چالیس ہزار فوج باغیہ نے جو مسلح کجلی بن میں موجود تھی ہتھیار ڈال دیئے۔ یہ سب انقلابات میری نظر سے گزرے ہیں۔

تلاشِ معاش

قصہ کوتاہ جب میں دہلی میں وارد ہوا ہوں اور کوپر صاحب بہادر سے مل کر اپنے مکانات واگذاشت کرائے ہیں تو اُس کے بعد میرے والد بزرگوار سب اہل و عیال کو ہمراہ لے کر دہلی میں آگئے اور امراؤ میرزا میرے چھوٹے بھائی کو مولوی رجب علی خاں صاحب کے چھاپے خانہ میں کتابت پر پچاس روپیہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۸) غدر کے ایام میں اسی نے پنجاب سے سکھوں کی فوجیں دہلی بھیجی تھیں۔ ان خدمات کی وجہ سے اسے گورنر جنرل مقرر کیا گیا۔ اس نے دہلی میں سمتھ کو پیر کر حاکم اعلیٰ مقرر کیا۔ اور غدر کے زمانے کے بھاگے ہوئے مسلمانوں کو دہلی میں آکر آباد ہونے کی اجازت دے دی۔

(نظیر)

ماہوار کا نوکر رکھ کر مقام جگراؤں[1] (ضلع لودھیانہ) کو لے گئے اور والد بزرگوار میرے چھوٹے بھائی کے ہمراہ گئے۔ میری یہ کیفیت تھی کہ میں بے روزگار تھا۔ ہمراہ اہل و عیال اور میری خوش دامن وغیرہ وہ میں اپنی سسرال کے مکانات میں مقیم تھا۔ اب مجھے اور فکر دامنگیر ہُوا کہ الٰہی دلّی میں تو آیا مگر بسر اوقات کی کیا صورت کی جائے اور وہ زمانہ قحط سالی کا تھا آٹھ سیر کا نرخ غلہ کا تھا۔ مگر خدا رزاق ہے میری سمجھ میں ایک بات آ گئی۔ کچھ حیلہ کرکے روٹی پیدا کرنی چاہیئے۔ ان روزوں ریل دہلی میں نہیں آئی تھی۔ کارٹ میل پر ڈاک روانہ ہوا کرتی تھی۔ اور ڈاک خانہ کے گھوڑے بہت مر گئے تھے۔ ڈاک خانہ میں گھوڑوں کی بہت خواستگاری تھی میں نے گھوڑوں کی تلاش کی ایک گھوڑا قلعہ میں ایک انگریز کے پاس تھا میں نے اور ایک منے شریک ہوکر وہ گھوڑا چودہ روپیہ کو خرید کیا۔ اُسے لے کر ہم دونوں ڈاک خانہ میں پہنچے۔ ستر روپیہ کو وہ بکا۔ مالک کے چودہ روپیہ مالک کو دے دیئے۔ منافع ہم دونے برابر تقسیم کر لیا شام کو آدھے آدھے روپیہ لے کر اپنے اپنے گھروں کو چلے آئے۔ پھر تو ہم دونوں آدمیوں کو یہ مزہ پڑا کہ علی الصباح اپنے اپنے گھروں سے دعا مانگ کر نکلتے تھے یا رازقِ مطلق تو روزی دینے والا ہے دن بھر شہر میں گھوڑے تلاش کرتے ایک دو گھوڑے ہم کو مل جاتے ہم ارزاں قیمت پہ خرید کرتے اور گراں قیمت میں ڈاک خانہ میں جا کر فروخت کر آتے تھے روز خداوند عالم ہم کو دس پندرہ روپیہ محنتانہ کے دلا دیتا تھا۔ شام کو خوشی خوشی اپنے گھر چلے

---

[1] ضلع لودھیانہ میں تحصیل ہے۔ جہاں ارسطو جاہ میر مولوی رجب علی خاں بہادر میر منشی گورنر جنرل کا خاندان آباد تھا۔ یہ خاندان ستمبر ۱۹۴۷ء کے انقلاب تک یہاں آباد رہا۔

(نظیر)

آتے تھے۔ ہم کو قحط سالی معلوم بھی نہ ہوتی تھی کہ کئی روز کے بعد ایک گھوڑا پھر ہم نے تیرہ روپیہ کو خریدا اور وہی ستر روپیہ کو جاکر ڈاک خانہ میں بیچا۔ اسی طرح خدائے تعالٰے ہم کو منافع دلائے جاتا تھا۔ اور وجہ یہ تھی کہ باعث قحط سالی کے لوگوں کو گھوڑے کا رکھنا دشوار معلوم ہوتا تھا لامحالہ ارزاں قیمت پر فروخت کر دیتے تھے۔ ایک روز کا مذکور ہے کہ ہم دوپہر تک متلاشی رہے۔ کوئی گھوڑا ہم کو دستیاب نہ ہوا دوپہر کو کنچنیوں کی گلی میں گزرتے تھے کہ یکایک ایک شخص نے ہم سے کہا کہ ہمارے پاس ایک گھوڑا بہت عمدہ ہے۔ اگر تم خرید کرو تو ہم فروخت کرتے ہیں۔ ہم دونو آدمیوں نے اُس شخص کے ہمراہ جاکر گھوڑے کو دیکھا۔ واقعی گھوڑا خوش قوم ترکی بخارا کا تھا اسی روپیہ کو ہم نے وہ گھوڑا خرید کیا اور پانچ روپے بیعانہ کے مالک کے حوالہ کئے اور ما بقا کا وعدہ کیا کہ شام کو زر قیمت ادا کر دیں گے اور خدا پر توکل کر کے گھوڑا کھلوا کر ہم لے کر چلے جب تک شہر کا کابلی دروازہ برقرار تھا مگر مکانات انہدام کرائے جا رہے تھے۔ جب ہم کابلی دروازہ میں پہنچے تو ایک چپراسی ہم کو ملا اس نے پوچھا کیا گھوڑا بکاؤ ہے ہم نے کہا ہاں بیچنے کا ہے چپراسی نے کہا تم دروازہ کے باہر جاؤ۔ ہمارے صاحب کی پلٹن پڑی ہوئی ہے۔ وہ پلٹن کے کپتان ہیں تم اُن کا ڈیرا دریافت کرو۔ ان کو ایسے گھوڑے کی تلاش ہے۔ وہ دیکھتے ہی فوراً خرید لینگے ہم شہر سے باہر نکل کر انہیں صاحب کے ڈیرے کے پاس پہنچے۔ کہ صاحب خود ہی ڈیرے سے برآمد ہو گئے اور ہم سے پوچھنے لگے کہ گھوڑا بیچتے ہو ہم نے جواب دیا۔ ہاں صاحب بیچتے ہیں۔ پھر پوچھا یہ شوخی تو نہیں کرتا ہے ہم نے کہا نہیں صاحب یہ ترکی ہے شوخی کیا جانے۔ کہا ہم اس پر سوار ہوں ہم نے کہا۔ بیشک سوار ہو کے

دیکھ لیجیے۔ صاحب انگریزی زین بندھوا کے اُس پر سوار ہوئے گھوڑا نہایت قدمیانہ
خوش رفتار تھا۔ صاحب بہت خوش ہوئے۔ گھوڑے پر سے اتر کر قیمت پوچھنے
لگے۔ ہم نے چار سو روپیہ قیمت بیان کیئے۔ وہ بولے قیمت زیادہ ہے۔ واجبی دام
کہنے چاہئیں۔ بعد ازاں یہ کہا ہمارے پاس ایک گھوڑا ہے وہ گھوڑا ہم سے لیلو
باقی کی قیمت لے لو۔ ہم نے کہا وہ گھوڑا ہمیں دکھاؤ۔ وہ گھوڑا منگا کر دکھایا گیا۔ واقعی
وہ بھی جوان تھا۔ اچھا تھا مگر اتنی بات تھی کہ قوم کا تاتاری تھا۔ بہر حال وہ گھوڑا اور سو
روپیہ نقد ہم نے لئے اور اپنا گھوڑا اُن کے حوالہ کیا۔ ہم سو روپیہ اور وہ گھوڑا لے کر
شہر میں آتے تھے کہ گھوڑے کی قیمت کے روپیہ مالک کو چل کر دے دیں۔ اُسی
کابلی دروازہ کے اندر داخل ہوتے تھے کہ سامنے ایک کمرہ میں سے ایک بوڑھے
صاحب نے ہم کو آواز دی کہ تم گھوڑا بیچتے ہو ہم نے کہا ہاں بیچتے ہیں وہ کمرہ سے
نیچے اتر آیا اور گھوڑے کو دیکھ کر پسند کیا اور وہی معاملہ یہاں بھی پیش آیا جو صاحب
بہادر سے پیش آیا تھا یعنی یہ صاحب بھی بولے کہ ہمارے پاس ایک گھوڑا ہے اس
گھوڑے کو اُس گھوڑے سے بدل لو اور باقی قیمت کے روپیہ لے لو سو وہ گھوڑا بھی
جوان تھا۔ ہاتھ پاؤں سے صاف۔ بے عیب مگر ہمارے گھوڑے سے کسی قدر لاغر
تھا۔ قصہ مختصر سو روپیہ اور وہ گھوڑا لے کر ہم نے اپنا گھوڑا اُن کے حوالہ کیا۔ وہاں
سے چل کر ہم نے پہلے گھوڑے والے کی قیمت کے روپیہ ادا کیئے۔ اس اثنا میں
شام ہو گئی جو کچھ روپیہ منافع کے تھے وہ برابر تقسیم کر لئے اور گھوڑے پر سوار ہو کر
میں اپنے مکان کو روانہ ہوا۔ راستہ میں سے دانہ گھاس اگاڑی پچھاڑی میخیں وغیرہ
اپنے ہمراہ لیتا ہوا مکان پر پہنچا۔ اور گھوڑے کو لگا دیا۔ گھوڑے کو دانہ خوب تخمِ سیر

کر کے کھلایا۔ اور گھاس آگے ڈال دی۔ شب کو اپنے گھر میں آرام کیا۔ دوسرے روز صبح کو ڈاک خانہ میں لے جاکر پچھتر روپیہ کو اُسے بھی فروخت کر دیا۔ خدا کی دین کو دیکھا چاہیئے کہ ایک گھوڑے میں اور ایک ہی دن میں ہم کو دو سے روپیہ منافع دلا دیئے غرضکہ جب تک قحط سالی رہی مجھ کو معلوم نہ ہُوا کہ گرانی کیا شئے ہے۔ بعد سال بھر کے وہ گھوڑوں کی خریداری بند ہو گئی اور میرے والد میرے چھوٹے بھائی امراؤ مرزا کی شادی کرنے کے لئے پانی پت میں آئے اور اس کی شادی کر کے اُسے پانی پت میں چھوڑ کر میرے پاس دلّی میں چلے آئے اور آتے ہی بیمار ہو گئے۔ ادھر میں بیمار ہو گیا اور دونوں کو شدّت سے بخار آتا تھا +

مہاجن نے نالش کر دی

اُسی حالت بیماری میں بنارسی داس خزانچی نے اپنے قرضہ کی نالش مجھ پر اور میرے والد پر کر دی اور وہ قرضہ زمانہ غدر سے پہلے کا تھا جو شادیوں میں لیا گیا تھا۔ اور جو سود در سود لگا کر دو ہزار کے قریب کر دیا گیا تھا میں اور میرے والد دونوں بیمار تھے کوئی جواب دہی کرنے والا نہ تھا۔ یکطرفہ ڈگری ہو گئی۔ اِس اثنا میں میرے والد نے انتقال فرمایا۔ میں ایک تو بیمار تھا اُس پر یہ صدمۂ عظیم واقع ہوا زیادہ تر بیمار ہو گیا تھا خیر تجہیز و تکفین تو ان کی ظہور میں آئی۔ مگر میری زندگی کے لالے پڑ گئے۔ میں تین ماہ میں خدا خدا کر کے تندرست ہُوا تو اجرائے ڈگری ہو کر مکانات کے نیلام کا حکم چڑھ چکا تھا وہ مکانات جو دس ہزار روپیہ کی قیمت کے تھے۔ دو ہزار میں نیلام ہو کر قرض خواہ کو دلا دئے گئے ایک حبہ مجھے دستیاب نہ ہُوا۔ اب تندرست ہُوا تو فکر معاش کی ہوئی خدا کی قدرت سے ان روزوں میں نیا نیا ٹھیکہ چُنگی کا دلّی میں ہُوا تھا۔ میں تھوڑی سی

تنخواہ کا چُنگی (پون ٹوٹی) میں نوکر ہوگیا اور اُسی زمانہ میں حکیم احسن اللہ خاں نے مجھ سے قصۂ ممتاز لکھوایا دس روپیہ جزو کی اجرت پر میں نے قصۂ ممتاز فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا۔ بعد سال بھر کے جب پون ٹوٹی کا ٹھیکہ تبدیل ہُوا اور دوسرے ٹھیکہ داروں کے حوالہ کیا گیا تو اُنہوں نے اپنا عملہ بھرتی کیا میں معزول ہو کر خانہ نشین ہُوا۔ چند روز کاپی نگاری پر بسر اوقات کی مگر اُنہیں دنوں میں اخبار جلوۂ طور جو بلند شہر سے نکلتا تھا میں اُس کا ایڈیٹر ہو کر بلند شہر چلا گیا۔ اُس اخبار نے بہت ترقی پائی۔ وہ اخبار ریاست الور میں بھی جاتا تھا۔ اور مہاراجہ شیودان سنگھ والئ ریاست الور کے ملاحظہ سے گذرتا تھا۔ اُنہوں نے دریافت فرمایا کہ اس اخبار کا ایڈیٹر کون ہیں اور کون لکھتا ہے اتفاق سے میرے ایک دوست مرزا علی نقی صاحب تحصیلدار موجود تھے اُنہوں نے میرا نام بتایا۔ اور حال بیان کیا۔ مہاراجہ صاحب بہادر نے فرمایا کہ اُسے یہاں بلواؤ۔ ہم نوکر رکھ لیں گے۔ غرضکہ اُنہوں نے مجھے لکھا کہ تم نوکری چھوڑ کر یہاں چلے آؤ۔ یہاں مہاراجہ صاحب بہادر بہت قدردانی فرمائیں گے۔ پہلے دو چار بار میں نے عذر کئے۔ مگر انجام کشش آب و دانہ سے منجانب اللہ ایسی صورت واقع ہوئی کہ لامحالہ میں الور جانے پر مجبور ہو گیا اور خواہ مخواہ جانا ہی پڑا۔ اِدھر میرے عزیز میر مہدی حسین صاحب مجروح اور میر سرفراز حسین صاحب وہاں موجود ہی تھے میں اور لمراؤ مرزا دونوں الور میں پہنچے اور مہاراجہ صاحب کو نذر گذرانی۔

ساتواں باب

ریاست الور کی ملازمت

ریاست کے حالات

مہاراجہ صاحب نہایت درجہ کے خوش بیان۔ شیریں گفتار خوش تقریر تھے
اثنا رگفتگو میں فرمانے لگے۔ میں میوات کا رئیس ہوں تم دلی کے رہنے والے۔ پلاؤ
قلیہ کے کھانے والے ہو میرے ہاں تو موٹھ باجرا کی روٹی ہے۔ اگر قبول کرو۔ تو
بسم اللہ حاضر ہے میں نے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ یہ جو باجرہ پلاؤ قلیہ سے بہتر ہے
ہزار نعمت کے برابر ہے۔ اگر ایک وقت بھی مجھے روٹی مل جائے گی تو حضور کا دامن
نہ چھوڑوں گا۔ پھر فرمایا اگر مفصلات میں روزگار چاہو تو وہاں تنخواہ کثیر ممکن ہے۔
مگر حاکم کا محکوم ہو کر رہنا پڑے گا اور اگر حکامِ بالادست تمہارے شاکی ہوں گے
تو مجھے پاسداری سر رشتہ کی کرنی پڑے گی۔ تمہاری رعایت ملحوظ نہ ہو گی اور اگر
میرے پاس رہنا چاہو تو تنخواہ قلیل ہو گی اور میرا ہی محکوم بن کر رہنا پڑے گا۔
دوسرا حاکم اور نہ ہو گا۔ میں نے عرض کی حضور کی خدمت میں رہنا مفصّلات سے

ہزار درجہ بہتر سمجھتا ہوں۔ غرضکہ اُسی روز میں اور میرا چھوٹا بھائی ملازم ہو گئے۔ دفتر میں چہرے لکھا دیئے گئے۔ ایک ایک بیش قیمت گھوڑا خالص طویلہ میں سے ہمارے لئے تعینات ہو گیا شبانہ روز خدمت میں حاضر رہنے لگے۔ عجب عیش عشرت سے بسر ہوتی تھی کہ کوئی رنج و فکر پاس نہ آتا تھا۔ مصرعہ نے غم وزد نے غم کالا دن رات ہنسی قہقہے۔ دل لگی۔ گنجفہ۔ چوسر۔ ناچ۔ رنگ۔ میلا۔ تماشا۔ سیر۔ شکار میں زندگی بسر ہوتی تھی۔ جہاں مہاراج سوار ہوتے تھے ہم لوگ اردل میں ساتھ رہتے تھے۔ بیس پچیس آدمی شریف زادے نوجوان۔ خوشخو۔ خوش پوشاک فراہم ہو گئے تھے باہم اتفاق تھا۔ مہاراجہ کو خوش و خورم رکھتے تھے۔ مہاراج کو بھی ہم لوگوں سے وہ اُنس و محبت تھا کہ دم بھر اپنے سے جُدا نہ کرتے تھے۔ اچھے سے اچھا لباس پہناتے تھے اور ہر تقریب میں انعام اکرام خلعت وغیرہ ملتے رہتے تھے۔ عجب ایک صحبتِ رنگین فراہم ہوئی تھی کہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مہاراجہ شیودان سنگھ بہادر والئی الور بیکنٹھ باشی نے جو عیش و عشرت اور داد و دہش فرمائی وہ ابوالحسن تانا شاہ کو بھی نصیب نہ ہوئی ہو گی۔ اس چھوٹی سی ریاست الور کا جو جاہ و تجمل میں نے دیکھا۔ وہ بڑی سے بڑی ریاستہائے ہندوستان میں کہیں نظر سے نہیں گزرا اوّل تو ہر فن کا صاحبِ کمال ایسا الور میں موجود تھا کہ جس کا ہندوستان تو کیا ممالکِ غیر میں بھی جواب نہ تھا آغا صاحب سا خوشنویس میر پنجہ کش مرحوم کا شاگرد جس نے لاکھ روپیہ کی تیاری کی گلستان لکھی۔

نادر اشیاء ابراہیم شمشیر ساز جس کی صناعی کی تمام ہندوستان میں دھوم تھی ایک ایسی تلوار بنائی ہے کہ تمام جسم میں اُس تیغ کے بجائے

جوہر موتی نصب تھے۔ جس وقت ہاتھ میں علم کرو۔ سب مروارید سمٹ کر قبضہ میں آ جاتے تھے۔ اور جب تلوار کا ہاتھ مارو تو وہ موتی دوڑ کر بجائے جوہر تمام تلوار پر پھیل جائیں۔ وہ تلوار میں نے اپنی آنکھ سے دیکھی۔ اس کے سوا اور بہت بہت نایاب تلواریں اس کے ہاتھ کی سلحخانہ میں دیکھنے میں آئیں۔ ایک تلوار میں سے تین تلواریں برآمد ہوتی تھیں۔ ایک نجار مستری نے ایک پانچ گز دراز۔ ڈیڑھ گز عریض چاندی کی ایک میز تیار کی تھی۔ اور اس میں ایک صنعت یہ کی تھی کہ جب سامنے کے رُخ سے اُس میں کنجی پھیر دو تو ایک طلسم کا کارخانہ نمودار ہوتا تھا یعنی اس میز کے ایک جانب ایک بارہ دری بنائی تھی۔ اور اس کی پشت پر پہاڑ بنایا تھا۔ اور آگے بارہ دری کے نیچے ایک نہر بنائی تھی۔ اور دونوں جانب باغ لگائے تھے جس وقت اس کی کل کو مروڑا جاتا تھا۔ تو بارہ دری کے اوپر اور پہاڑ پر ابر آتا معلوم ہوتا تھا۔ اور اُس میں گرج پیدا ہونے اور گرجنے کی آواز آتی تھی۔ اور بجلی چمکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور مینہ برستا دکھائی دیتا تھا اور اس نہر میں پانی لہریں لیتا ہوا چلا آتا تھا۔ اور چھوٹی چھوٹی مچھلیاں لال سبز رنگ کی اس میں نظر آتی تھیں۔

کُتّے

شکار خانے میں جو بھنگیوں کا داروغہ نوکر تھا۔ اس کو یہ کمال حاصل تھا کہ بازاری کتوں کو شیر سے لڑا دیتا تھا۔ اور وہ کُتّے شیر کو مار لیتے تھے بارہا شکارِ شیر میں یہ کیفیت نظر سے گزری ہے۔ اُس کا قاعدہ تھا کہ جب کُتّوں کے بچے ہوتے تو وہ زبردست پلّے پکڑوا لایا کرتا تھا۔ اور اُن کو پرورش کر کے موٹا کرتا تھا اور جس دن شکارِ شیر کا حکم پہنچتا۔ اُسی روز وہ پانچ چار جوڑی کُتّوں کو ایک ہلاس کی پڑیا سنگھا دیتا تھا بس اُس ہلاس کا سونگھنا اور کتّوں کا آپے سے باہر ہونا اور شیر کی

بُو کی اُن کو جستجو ہو جاتی تھی۔ اور دورہ کے ہاتھ میں بیتاب رہتے تھے جب تک شیر پر اُن کو نہ چھوڑا جائے اور جہاں وہ چھوٹے اور شیر کی بُو پر لپکے جہاں شیر کو پایا وہ چمٹ گئے اور چھیچڑے اُڑا دیئے۔ اُس میں ایک دو کتے مارے بھی جاتے تھے۔ بلا سے کچھ غم نہیں بازاری کتا ہے کچھ قیمتی نہیں پچاس ساٹھ کتا ہمیشہ کتے خانہ میں تیار موجود رہتا تھا۔

گھوڑے

اصطبل جیسا الور میں دیکھا کسی ریاست میں نہیں دیکھا۔ خاص طویلے میں ساڑھے چار سو گھوڑا ران سواری کا ایک سے ایک اعلےٰ تیار مرتب، سالٹسہ: ہزار کا دو ہزار کا۔ چار ہزار کا۔ پانچہزار تک ہر وقت موجود، پانچسو روپیہ سے کم قیمت کا ایک نہ تھا۔ بلکہ اسپ حور خانہ زاد تھا۔ اس کی نسبت مہاراج نے ایک بار سوداگران سے میرے سامنے کہا تھا۔ کہ اگر اس کے ساتھ کا دوسرا گھوڑا مجھ کو لا دو۔ تو میں پچاس ہزار روپیہ دیتا ہوں۔ اسپ حور اور اسپ بے نظیر دونو بھائی تھے خانہ زاد ان کے ماں باپ دونوں کاٹھیاوار کے تھے۔ اور اسپ من پیارا اور اسپ من مراد یہ بھی خانہ زاد تھے۔ ان کے باپ علیحدہ تھے۔ یہ جس قدر خاصوں کی تعداد میں نے اوپر بیان کی ہے۔ یہ ہر قوم کے اور کھینت کے تھے ان میں کاٹھیاواری اور مارواڑی ان کے علاوہ تھی خانہ کی گھوڑیاں جداگانہ تھیں۔ اٹھارہ سو سوار خانگی رسالہ کے تھے۔ جن میں گھوڑے راج کے اور سوار بارگیر تھے رسالہ کے پیچھے دو سانڈ کاٹھیاواری رہا کرتے تھے۔ کہ وہ رسالہ کی گھوڑیوں پر ڈالے جاتے تھے اور ان کے بچے جو ہوتے وہ الگ پرورش پاتے۔ اچھے چھانٹ کر خاص طویلے میں داخل ہوتے باقی رسالہ میں بھرتی کئے جاتے۔ علیٰ ہذا القیاس گھوڑیاں عمدہ

بگھی خانہ میں۔ باقی سواران میں تقسیم ہو جاتیں۔ وقت سواری جس وقت وہ خاص کوتل
نکلتی ہے۔ عجب اک شان وتجمل ہوتا تھا۔ کسی گھوڑے پر چاندی سونے کا جڑاؤ
ساز۔ پہیوں پر سنہری پاکھریں۔ کہنیوں پر جھانجن کے کڑے۔ گلے میں رو پہلی۔
سنہری ہیکلیں بٹنوں کے کرمانچے ہوئے زیر بند بھاری منغرق زردوزی کام کے
غاشیے پڑے ہوئے چاکروں کے ہاتوں میں کھیلتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ یہ معلوم
ہوتا تھا۔ پرستان سے پریاں ناچتی ہوئی چلی آتی ہیں۔ اب اصطبل تو ہندوستانی
ریاستوں میں کہیں نہیں دیکھنے میں آتا جس میں اس قدر گھوڑے خاصے ہوں۔ ہاں
سلطان روم یا شاہ ایران کے ہاں ہو تو ہو۔

سواری روزمرہ شیو دان سنگھ کی اس شان وشوکت سے نکلتی تھی کہ کسی رئیس
کی جلوسے سواری نہ نکلے گی۔ شام کو دو گھڑی دن باقی رہے آدمیوں نے پوشاک
بدلی اور دستار بند کے ہاتھ کا پیچا بندھا ہوا ہلکے رنگ کے یا تو دستار یا مندیل سر
پر رکھے اور عطر کے کنٹروں کی کشتی آئی۔ اس میں سے ایک کنٹر اٹھا لیا اور سامنے
بلا کر درباروں کی ہتھیلی پر عطر تقسیم کرنا شروع کیا۔ جب عطر مل چکے تو جلیسوں
نے عطر ہاتھ میں مل کر پوشاک کو بسانا شروع کیا۔ جب اس سے فارغ ہوئے تو
بنارسی دوپٹہ سے کمر باندھی اور تلوار داب میں ڈال کر محل سے برآمد ہوئے۔
خاصے گھوڑے پر آپ سوار ہو گئے۔ پھر ہم لوگ اپنے اپنے گھوڑوں پر ہو کر اردلی
میں سوار ہوئے آہستہ آہستہ موتی ڈونگرے تک سواری پہنچی۔ بعد وقت شام وہاں
سے واپس آتے تو دونوں جانب بانسوں پر قندیلیں روشن ہیں اور بیچ میں مہاراج
کا گھوڑا ہے اور عقب میں پر رفیقوں کا ہے کہ وہ بھی سب زرق برق چلے آتے

ہیں معلوم ہوتا تھا کہ برات چلی آتی ہے اور واقعی شودان سنگھ دولہا معلوم ہوتے تھے
ایسی خوش نما سواری کسی رئیس کی دیکھی نہیں۔ ارباب نشاط کی یہ کیفیت تھی کہ تمام
جہاں کے انتخاب اور برگزیدہ۔ ستار باز۔ بین کار۔ ربابی۔ سرودیے۔ گویّے۔ کلاونت
موجود تھے۔ امرت سین۔ لال سین۔ ستار باز۔ غلام نقی اور بین کار جو مشہور روزگار ہیں
الور ہیں موجود تھے۔ گوکیا بنجابن سی گانے والی جو فرد روزگار تھی۔ وہ الور میں موجود تھی۔
اس کے علاوہ اور دنیا کی حسین طوائف الور میں موجود تھیں دو عورتیں سترہ سو روپیہ
تنخواہ تھی۔ جب مسند تکیہ پر مہاراج اجلاس فرماتے تھے اور دو رویہ دربار مؤدب دو زانو
بیٹھے ہوتے تھے اور ارباب نشاط سامنے ہوتے تھے۔ اور پچیس تیس شاہدان بازاری
پری پیکر حور تمثال مشتری زہرہ خصال ناہید نوا برق ادا سراپا ناز و انداز کا ایک گلزار
حسن کھلا ہوا تھا۔ محفل کیا اکھاڑا ہوتا تھا۔

مسند کے آگے ایک چبوترا گلاب کی پتیوں کا دو ڈھائی گز لمبا چوڑا ایک فٹ
اونچا بنا دیا جاتا تھا۔ اور قریب بیس پچیس سیر مقیش بادلہ کے گرداگرد سا مون پر گراتا تھا
اور وہ اس گلاب کے پتوں میں ملایا جاتا تھا۔ اور پانچ چھ بڑے چاندی کے چھوٹے چھوٹے
خوبصورت ڈونگرے شہاب اور زعفران کے رنگ کے پر کر آگے مسند کے رکھ دیتے
تھے۔ مہاراجہ صاحب نے اس ڈونگرہ کا رخ ایک شخص کی جانب پھیرا اور اس کی کل
دبائی اور بہت باریک اس میں سے برآمد موتی اور اس رنگ کی پھوار برسنے لگی۔
اور مہین مہین افشاں تمام سفید پوشاک پر ہو گئی جو گلاب کے پھولوں اور کترے
ہوئے مقیش کے ریزوں کی مٹھیاں بھر بھر کے اہل دربار پر ڈالنی شروع کیں۔
جس شخص پر رنگ کی پھوار پڑی اور مقیش کی مٹھی پڑ گئی۔ وہ اٹھ کر آداب بجا لایا۔

اب یہ کیفیت ہوگئی کہ سر سے پا تک ہر شخص جگمگا اٹھا اور تمام دستار اور پوشاک اور چہرہ اور بال اور ڈاڑھی پر مقیش کی افشاں ہوگئی۔ غرضکہ وہ تمام پھول اور مقیش ہولی کھیلنے میں برابر ہوگئے اور لباس پر لوگوں کے مقیش چمکیا ایسی محفل تاناشاہ نے بھی کبھی خواب میں نہ دیکھی ہوگی۔ علیٰ ہذا القیاس سالگرہ اور دسہرہ کی تقریب اور تیجوں کنگھوروں کی تقریبیں نہایت دھوم دھام سے ہوتی تھیں اور مسلمانوں کی دعوتوں میں ایک ایک آدمی کے پاس گز گز بھر میں کھانا چینی کے نایاب برتنوں میں چناجاتا تھا اور خلعت و انعام وغیرہ تقسیم ہوتے تھے۔ ایسا رفیق پرور دریادل رئیس تو میری نظر سے نہیں گزرا۔

سخنوروں کی قدر و منزلت

مہاراجہ صاحب بہادر کو شعر و سخن کی جانب ازحد رغبت تھی اور نہایت درجہ کے سخن فہم عالی دماغ تھے۔ مذاقِ سخن اتنا بڑھا ہوا تھا۔ کہ اچھا شعر سُن کر بے تاب ہوجاتے تھے اور فی الفور یاد فرماتے تھے۔ قصیدہ بغیر صلہ کے کبھی نہیں سُنا جس نے قصیدہ لکھا۔ صلہ معقول عطا فرمایا۔ ایک بار میں نے سالگرہ کا قصیدہ لکھ کر پڑھا جس وقت میں نذر دینے کو گیا۔ میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر سوال کیا کہ کیا چاہتا ہے۔ میں نے عرض کی حضور نے میرے دونو ہاتھ پکڑے اب میرے مانگنے کی حاجت ہی کیا کوئی ایک ہاتھ تھامتا ہے تو عمر بھر اُس کی دستگیری کرتا ہے حضور نے تو میرے دونو ہاتھ تھام لئے اب مجھے کیا حاجت رہی فرمایا یہ خوشی کی باتیں ہیں۔ مطلب عرض کر میں نے عرض کی کہ قصیدہ ملاحظہ ہوا لکھا ہُوا کیسا ہے فرمایا بہت اچھا ہے سالکا ما بھائی کے ہاتھ میں نے عرض کی کہ قصیدہ میرا نہیں اور شخص کا ہے فرمایا بہت اچھا لکھتا ہے۔ میں نے عرض کی۔

باوجود اس کمال کے روٹی کو محتاج ہے۔ اس قصیدہ کے صلہ میں اس غریب کی پرورش ہوجائے فرمایا کون شخص ہے میں نے عرض کی دولہ خاں پٹھان کی پلٹن کا ایک سپاہی ہے حکم ہوا سامنے بلواؤ۔ غرضکہ وہ سامنے حاضر ہوا اُس کا بیس روپیہ ماہوار مقرر کرکے کتب خانہ میں تعینات کرادیا گیا۔

مہاراجہ صاحب کے روبرو مشاعرہ ہوا کرتا۔ درباری شعرا کے نام یہ ہیں میر مہدی حسین مجروح۔ مرزا قربان بیگ سالک۔ امراؤ مرزا انور۔ میاں غلام احمد تصویر۔ میاں خدابخش تنویر اور فقیر ظہیر۔

شاعر کی نہایت عزت و آبرو فرماتے تھے اور شعر کی قدردانی کرتے تھے۔

الور کی ملازمت سے علیحدگی

غرضکہ تین چار سال کے عرصہ تک الور میں اس عیش و آرام سے بسر ہوتی رہی اب فلکِ تفرقہ انداز کو یہ صحبت بھی ناگوار گذری اور درپئے تخریب ہوا۔ قوم راجپوت کہ ہمیشہ سے شتر کینہ ہوتے آئے ہیں اور مسلمانوں کی جانب سے مادہ فساد و تعصب اُن کے سرشت میں مخمر ہے اور نائرہ رشک و حسد سے اُن کے دل میں التہاب ہوا کہ یہ لوگ مسلمان مہاراج کے درخورِ صحبت ہیں اور آٹھوں پہر مہاراج کے پاس رہتے ہیں اور مصاحبت گرم ہے اور مہاراجہ صاحب ہماری طرف متوجہ نہیں ہوتے کوئی تدبیر ایسی کرنی چاہیے کہ یہ جمعیّت مثل اوراق گنجفہ منتشر ہوجائیں۔ چنانچہ باہم خفیہ خفیہ یہ صلاح و مشورے ہونے لگے اور لکھ بیر سنگھ ٹھاکر مخروج کو آمادہ فتنہ و فساد کرکے بغاوت پر برانگیختہ کیا اور سکھدیو سنگھ راعی نے ایک جماعت بدسگال غارتگر جمعداری جبلپور میں فراہم کرکے پانچ چھ ہزار آدمی سے عملداری الور پر حملہ کیا

اور علاقہ تحصیل نرائن پور اور پرگنہ بانورولال گڈھی وغیرہ پر تاخت کرکے تاراج کرنا شروع کیا اور تحصیلیں لوٹ لیں۔ گھوڑوں کے اصطبل جلادیئے۔ جب یہ خبر مہاراج کو پہنچی تو الور سے دولہ خاں کپتان کو معہ مسیح پلٹن اور نواب کامدار خاں کو معہ رسالہ سواران واسطے سرکوبی فرقہ باغیہ روانہ کیا۔ ان بہادران بہور شعار اور غازیان نصرت وقار نے جاتے ہی ان بدمعاشوں کی وہ کفش کاری کی کہ بھاگتے نظر آئے اور کئی کوس تک لاشیں ڈال دیں۔ اور بہت سے سرغناؤں کے سر کٹوا کر حضور میں بھیج دیئے۔ کھدیر سنگھ باغی ہزیمت پاکر علاقہ پرتاپ گڑھ راجگڑھ وغیرہ کی جانب مفرور ہوا ان بہادروں نے وہاں بھی ان کا تعاقب کرکے کہیں اُس کا قدم جمنے نہ دیا آخرالامر اہلکار زیر بندے نے آکر اس کو تنبیہ اور تہدید کی کہ اگر آج سے پھر عملداری الور میں قدم رکھا تو سرکار کی جانب سے بڑی خبر لے جائے گی۔ جب وہ مایوس اور پشیمان ہوکر عملداری جے پور میں پناہ پذیر ہوا تو راجپوتوں نے عرضیاں بھیجنی شروع کیں کہ یہ مسلمان لوگ راجہ کو بہکا کر خراب کرتے ہیں اور راجہ کو مسلمان کرلیا ہے ان لوگوں کا الور سے اخراج ہونا مناسب ہے۔ ان کی وجہ سے الور میں فتنہ و فساد برپا ہوتا ہے۔ سرکار سے مسلمانوں کے علیحدہ کردینے کا حکم مہاراجہ صاحب کے پاس پہنچا ایک حکم ٹال دیا دوسرا حکم ٹال دیا آخر تیسرے حکم پر ہم لوگوں نے متفق ہوکر عرض کی۔ ہم لوگوں کے واسطے آپ اپنی ریاست کیوں برباد کرتے ہیں آپ ہم لوگوں کو رخصت فرمائیں۔ ہم آپ کے قدموں سے لگے ہوئے پڑے ہیں۔ ایک دو برس میں پھر حاضر ہوجائیں گے۔ غرضکہ بہزار دقت سمجھا سمجھو کر ہم الور سے رخصت ہوکر دلی میں آبیٹھے۔ برس روز تک ہماری تنخواہیں گھر پر آتی رہیں

بعد ایک سال کے میں نے نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ سے ایک روز یہ بات کہی کہ الور کی صورت آپ کو معلوم ہے یہ امر کہ کبھی گھر بیٹھے ہوئے کون تنخواہ عمر بھر دیا کرتا ہے۔ اگر آپ کے ذریعہ سے ریاست جے پور میں کوئی سبیل روزگار کی نکل آئے تو بہت مناسب ہے میں آپ کا ممنون احسان ہوں گا۔ چونکہ نواب صاحب ممدوح کریم الاخلاق تھے اور مجھے بیشتر اُن کی خدمت میں رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اور مجھ پر الطاف بزرگانہ فرماتے تھے۔ اُنہوں نے اسی وقت نواب فیض علی خاں صاحب بہادر مدار المہام کے نام میری سفارش میں خط لکھ کر روانہ فرمایا۔ اور اُن کے صاحبزادہ نواب محمد علی خاں نے بخشی امداد علی خاں صاحب برادر کوچک نواب صاحب کے نام خط بھیجا۔ پانچویں روز نواب مصطفیٰ خاں صاحب بہادر نے مجھے بلا کر نواب فیض علی خاں صاحب کا خط جو میری طلب میں آیا تھا۔ مجھے دیا۔ اور فرمایا اب بسم اللہ کیجئے اور جے پور کو روانہ ہو جائیے۔ اب جاتے ہی آپ نوکر ہو جائیں گے میں دہلی سے روانہ ہوا۔ جب جے پور میں پہنچا ہوں تو اوّل اپنے بھائی خسر پورا احمد مرزا خاں صاحب آگاہ کے مکان پر فروکش ہوا۔ پہلے بخشی امداد علیخاں صاحب سے ملا اور اُن کے ذریعہ سے نواب فیض علی خاں صاحب بہادر سے ملاقات کی اور نواب فیض علی خاں نے مجھے امیدوار کیا اور بعد دو ماہ کے مجھے کھنڈار کا تھانہ دار کر کے بھیجدیا +

ریاست جے پور کی ملازمت

کھنڈار جے پور کا ایک پرگنہ ہے۔ گوشہ مشرق و جنوب سرحد جے پور کا اور قصبہ سے تین کوس پر دریائے چنبل ہے رود بناس اسی محل پر چنبل میں شامل ہوئی

ہے اور ایک اور ندی علاقہ گوالیار سے آکر چنبل میں ملتی ہے۔ ایک بت خانہ ہے اُسے رامیسر کہتے ہیں اس کے نیچے ان تینوں کا اجتماع ہوا ہے اور رود خانہ چنبل مابین جے پور و گوالیار حد فاصل ہے۔ گھنڈار میں بالائے کوہ قلعہ مستحکم اور وسیع ہے کئی ہزار کی جمعیت سپاہ اندرون قلعہ رہتی ہے۔ پہاڑ بہت بلند ہے کوہستان قلعہ رہسور سے یہ کوہ پانچ چار میل کے فاصلہ پر واقع ہوا ہے۔ پرگنہ گھنڈار ماتحت نظامت سوائی مادھوپور ہے اگر زمانہ تھانہ داری کے حالات تحریر ہوں تو ایک کتاب دیگر تصنیف ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ نہایت عزت آبرو حکومت کی نوکری تھی۔ بارہ بارہ کوس تک علاقہ زیر حکومت تھا۔ سوا سو گاؤں کا نواسی تھانہ سے تعلق ہے۔ پانچ چھ ماہ تک اس پرگنہ پر حکمرانی کی اس حکومت میں وہ لطف حاصل ہوا کہ الور کے عیش و عشرت فراموش ہو گئے بعد چھ ماہ کے تھانہ امر یہ میں تبدیلی ہو گئی وہاں سے جے پور آیا تو اہل و عیال دلّی سے اب جے پور آ گئے تھے اور اپنے بھائی سید احمد مرزا خاں صاحب خسر پورے کے مکان پر مقیم تھے میں نے جے پور میں آکر مکان کرایہ کو لیا اور گھر کے آدمیوں کو وہاں رکھا اور آپ آمیر کو روانہ ہوا۔ آمیر میں جب پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ تھانہ صدر ہے اور اُس کے آبرو کوتوالی جے پور کی ابرو ہے اور قدیم دار الخلافہ ریاست جے پور کا ہے یہاں تھانہ دار کے واسطے مسند تکیہ لگایا جاتا ہے۔ خیر چھ ماہ اپنا فرض منصبی ادا کرتا رہا اب دسہرہ قریب آیا۔ ملازمین ماتحت کی زبانی معلوم ہوا کہ سامان رسد وغیرہ فراہم کرنا چاہیے۔ مہاراجہ صاحب بہادر رونق افروز ہوا کرتے ہیں اور چند روز قیام فرماتے ہیں۔ تھانہ دار کا ڈیوڑھی پر بندوبست رہتا ہے۔ بہر حال وہ سامان فراہم کر لیا گیا۔ دسہرہ کے ایام شروع ہوتے روز

اول شام کے وقت ملازمان تھانہ نے کہا کہ بالائے کوہ محلوں میں چل کر رسومات دسہرہ
ادا کراؤ مجھے معلومات نہ تھی کہ کیا رسومات ہیں اُنہوں نے کہا کہ آپ چلئیے سب معلوم
ہو جائیں گی۔ غرضکہ میں تلوار اٹھا کر دستار رکھ کر کمر باندھ کر اُن کے ہمراہ ہوا ادھر
جب بازار میں پہنچا تو حلوائی من ڈیڑھ من شیرنی دودھ کے ہمراہ لوا کر میرے ہمراہ
ہوا میں آگے بڑھا تو ہندو قصاب جو ٹھیکہ دار سرکاری تھا تنیس چالیس بکرے
لے کر ساتھ ہو لیا۔ اب میں یہ تماشا دیکھ رہا ہوں اور کچھ معلوم نہیں کیا ہوگا۔ جب
بلندی کوہ کے وسط میں پہنچا تو دروازہ محلوں کا نمودار ہوا اور میں اندر داخل ہوا تو دیکھا
کہ بالائے کوہ ایک قطع وسیع زمین کا ہے اور چہار جانب اُس کے عمارات شاہانہ
ہیں اور ایک مندر ہے عالی شان اور بہت سے سران ہیں اس پر ماتا کا مندر ہے
اور اُس کے پہلو میں خاص محل کا دروازہ ہے اور اس پر آبادی کی یہ صورت ہے
کہ چہار جانب کوہ بلند آسمان سے باتیں کرتے ہیں اور ان پہاڑوں کے بیچ میں آبادی
شہر ہے۔ مغرب کی جانب جو پہاڑ ہے وہ بہت بلند ہے اور اُس کی چوٹی پر جا کر قلعہ
وسیع ہے اور دامان کوہ میں محل واقع ہوئے ہیں اور اسی پہاڑ کے نشیب میں جانب
شرق ان محلوں کے نیچے اک بڑا پختہ تالاب ہے کہ پشتہ اس کا بہت مستحکم باندھا
گیا ہے اُس تالاب کے وسط میں اک باغ لگایا گیا ہے کہ اُس کا ارتفاع سطح زمین
سے قریب دس گز کے ہے اور گرد باغ کے سنگ سرخ کا ایک کٹھرا ہے جب
اُس تالاب میں پانی کی طغیانی ہوتی ہے تو اُس باغ میں چھوٹی کشتیوں اور بجرہ وغیرہ
کے ذریعہ سے عبور کیا جاتا ہے۔ یہ باغ ان محلات کے زیر جھروکہ ہے عجب کیفیت
کا مقام ہے اور راستہ محلات اور قلعہ کے سمت تہ آب ہے۔ غرضکہ جب محل

پر چڑھ کر مندر میں داخل ہوا تو نہایت خوش قطع عمارت نظر آئی ۔ جنوب کی جانب ایک بڑا مکان دالان در دالان ہے اُس کے بعد وہ حجرہ وسیع ہے جس میں سلادیبی کی برنجی ایک مورت قدِ آدم ہے اور ایک جانب کو اُس کا منہ پھرا ہوا ہے ۔ غرض کہ وہ شیرنی تو پوجاریانِ مندر نے لے جا کر اُس مورت کے آگے رکھیں اور بکرے لے جا کر صحنِ مندر میں کھڑے کر دیئے ہیں باہر کے دالان میں ایک ستون سے لگ کر کھڑا ہو رہا اور پوجاریوں نے تھالی میں بہت سے چراغ گھی کے روشن کئے اور مورت پر سے آتار چڑھاؤ کرنے لگے اور کچھ کہتے جاتے ہیں میں کچھ نہیں سمجھا اور بہت سے گھنٹے اور گھڑیال اور تھالیاں اور نقارے وغیرہ بجانے شروع کئے اور تمام مندر میں روشنی ہو گئی ۔ ایک گھڑی پہر تک یہ تماشا میں نے دیکھا جب وہ اُس سے فارغ ہوئے تو پوجاری بھی میرے پاس آ کھڑے ہوئے اور مندر میں بخوارت روشن تھے اور مندر کے صحن میں دو مشعلچی کھڑے ہوئے اور ایک شخص ایک بہت بڑا چھرا زبردست ہاتھ میں لے کر آموجود ہوا ۔ اب ایک بکرے کے سینگوں میں رسی باندھ کر ایک شخص نے آگے سے کھینچی ایک شخص نے پیچھے سے بکرے کو کھینچا اور اُس شخص نے دونوں ہاتھوں سے وہ حربا اوپر سے مارا بکری کی گردن اور کر دور جا رہی اسی طرح کئی بکرے جھٹکے ہوئے اُسے وہ بلدان کہتے ہیں ۔ غرضکہ وہ ہنگامہ ہو لیا تو پوجاری نے شیرینی تقسیم کی بعد ہم کو رخصت دی اب ہم کو معلوم ہوا یہاں کی یہ نوکری ہے ۔ یہ رسومات تھانہ دار آکر ادا کرتا ہے غرضکہ حسبِ معمول روز شام کو جانا پڑتا اور پہر بھر رات کے واپس آنا ہوتا ۔ ایک دن شام کا وقت ہے آفتاب پہاڑ کے نیچے پہنچ گیا ہے ۔ کچھ کچھ شعاعیں آسمان پر

پھیلی ہیں۔ سرخی پھیلتی جاتی ہے کہ ایک جوان رعنا خوش رو چھریرا بدن اوسط قامت سرخ مندیل سرخ بنارسی دوپٹہ کمر سے بندھا ہوا کمیت گھوڑے پر سوار گھوڑا دوڑائے محل کے دروازہ سے داخل ہوا اور چوکی خانہ کے چبوترہ کے پاس آکر گھوڑی روک لی۔ امیر خاں برقنداز نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا میں نے دوڑ کر گھوڑی کی باگ تھام لی اور دوسرا بڑھا کر ہاتھ میں دے کر گھوڑی پر سے اتروایا اور خوب گھوڑی کا جائزہ کیا اور چند قدم آگے لے گیا ٹہلانے لگا کہ اتنے میں چاکر دوڑتا ہوا آیا۔ اور اس نے میرے ہاتھ سے گھوڑی لے لی اور میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا اور نذر دکھائی۔ فرمایا میں نذر تو پھر کرلوں گا۔ تم ایک بار میری کمر کھولو میں نے پہلے تو دونوں جانب سے تلواریں ڈاب میں سے کھینچیں اور پھر کمر کھولنی شروع کی اور رومال بچھا کر سب چیزیں چبوترے پر رکھتا جاتا تھا۔ بعد بنارسی دوپٹہ کھولا اس کے نیچے اور سفید دوپٹہ تھا وہ کھولا اور اس کے نیچے اور ایک لنگ ریشمی تھا وہ کھولا۔ اس میں ایک گچھا تھا کہ اس میں بہت سی کنجیاں تھیں اس کے بعد ایک اور گچھا میانوں کا تھا کہ وہ میان سب باناتی تھے۔ اس میں قینچی، چاقو، نشتر، گھوڑے کے پاؤں ہاتھ کا ناخن گیر ہوگی۔ تا کہ خدا جانے کیا کیا تھا۔ بعد ایک بہت بڑا بٹوا سرخ قند کا کہ اس کا وزن تین چار سیر کے قریب ہوگا وہ کھول کر رکھا تو تمام لنگ پسینے میں تر ہو رہا تھا۔ پھر فرمایا اپنی تحویل میں رکھو کشن لال آئے تو سب چیزیں سنبھلوا دینا یہ کہہ کر اوپر چوکی خانہ میں چڑھ گئے چاکر نے دوڑ کر گھوڑے کی گدی اتار لی اور لیجا کر بچھادی میں وہیں اس مال کی حفاظت کرتا رہا۔ تھوڑی دیر میں لشکر کا تانتا بندھ گیا۔ تمام صحن آدمیوں سے بھر گیا کہ کشن لال چیلہ گھوڑی پر سوار آیا۔ اور وہیں

آکر اُترا میں نے کہا کشن لال جی یہ سامان سنبھال لو۔ غرضکہ مشعل کی روشنی میں وہ سب سنبھلوا دیں۔ کوئی چیز باقی نہ چھوڑی جتنی بکار آمد چیزیں ہوتی ہیں۔ سب اُن میانوں میں موجود تھیں۔ انگریزی قلمدان بھی پنسل بھی۔ کاغذ بھی سبھی چیزیں۔ اب سُنیئے بٹوے کا حال۔ بٹوے میں دو سو روپیہ۔ سو اشرفی۔ کوئی سو دونیاں چونیاں ڈبل پیسے کوئی آٹھ آنے کے کوئی ایک پیسے کی چھوٹی چھوٹی کوڑیاں اور ایک مٹھ نوٹوں کا مگر وہ موم جامہ کیا ہوا تھا۔ اُس کی تعداد معلوم نہیں ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد مندر میں گئے وہاں بلدان کرایا گیا۔ چار گھڑی کے بعد فارغ ہو کر مندر سے باہر آئے تو پسینے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ باہر مندر کی سیڑھیوں پر آ کر بیٹھ گئے میں نے رومال بچھا دیا۔ ہوا آ رہی تھی میں اور کشن لال پیچھے کھڑے ہو گئے۔ حکم ہوا بیٹھ جاؤ۔ مجھ سے ارشاد ہوا تم کتنے روز سے اس تھانہ میں تبدیل ہو کر آئے ہو میں نے عرض کی حضور پانچ مہینے ہوتے پھر پوچھا پہلے کون تھانے پر تھے میں نے عرض کی تھانہ کھنڈہار پر۔ فرمایا شملہ سے نواب صاحب نے تمہاری منظوری کرا کے بھیجی تھی۔ میری دستی مہر تھی حکم پر میں نے عرض کی میرے واسطے حکم صادر ہوا تھا۔ پھر پانچ روز مہاراج وہاں رہے میں ہر وقت خدمت میں حاضر رہا۔ بعد جب تشریف لاتے ہر وقت میں پاس رہتا تمام دنیا کے ذکر ہوتے رہتے۔ گنجفہ چوسر وغیرہ بھی ہو جاتا۔ تمام حال میرا اور میرے بزرگوں کا اور تعلقاتِ شاہی کا مجھ سے دریافت فرما کر فرما دیا تھا کہ ابھی تم اس گھر کو بھی وہی تصور کرو۔ یہ نوکری ویسی ہی نوکری ہے اس گھر میں سے آدمی آ کر پھر علیحدہ نہیں ہوتا ہے جو ایک دو کام ایسے بن آئے کہ اُس نوکر سے نہایت خوش ہو گئے تو اس وجہ سے زیادہ تر آبرو فرماتے تھے اور سوائے اپنے فرض منصبی

کے جو کام اہم ہوتا تھا اس کی تعمیل کے لئے مجھے حکم ہوتا تھا اور اکثر چوکیخانہ میں بھی
مجھ سے کام لیا جاتا تھا اور میری معتمدی میں بھیجا جاتا تھا۔ بلکہ ایک بار ایک مہم عظیم
درپیش تھی تجویز ہوئی کسے بھیجیں۔ خود مہاراج صاحب نے فرمایا اُسے بلوا کے بھیجدو
وہ اس مہم کو بخوبی انجام دے سکتا ہے۔ غرضکہ خاص رسالہ کا سوار رات کے وقت
میری طلب میں روانہ ہوا۔ مگر میری نوکری دلّی میں مینڈھی پہنچانے کی نکل آئی تھی۔
میں ایک منزل کوچ کر چکا تھا۔ تھانہ میں موجود نہ تھا۔ چونکہ حکم حضوری تھا سوار آدھے
بجے مقام اجردل میں میرے پاس پہنچا اور حکم سُنایا کہ اُسی وقت جے پور روانہ ہوا اور
شب باشب جے پور پہنچو۔ میں نے تھانہ دار چند واجی کے نام رقعہ لکھا کہ میری نوکری
مینڈھی دلّی پہنچانے کی نکلی تھی مگر حکم حضوری واپسی کا ہے کار سرکار واحد ہے
اب تم یہ بندہوی آکر یہاں سے لو۔ اور ان کو دلّی پہنچا کر رسید سررشتہ لا کر بندہوی
داخل کرو۔ اور بندہوی اپنے سواروں کے سپرد کر کے جے پور کو روانہ ہوا سوار سے
کہا تم تیرہ کوس آئے ہو آرام لو صبح آجانا اور میں نے گھوڑے پر سوار ہو کر گھوڑے
کی باگ اٹھادی اور ایک سوار ردلی میں لیا۔ چار بجے امر کا دروازہ کھلوایا۔ تھانے
میں آکر گھوڑا دوسرا تیار کرایا اور اس عرصہ میں حوائج ضروری سے فارغ ہو کر مُنہ
ہاتھ دھویا اور دوسرے گھوڑے پر سوار ہو کر سرپٹ اُٹھادیا۔ اور گھاٹی کا دروازہ
کھلوا کر آناً فاناً میں زوراور سنگھ کے دروازہ پر جا پہنچا اُس وقت پہلے دروازہ میں
داخل ہو کر بگھی خانہ کے آگے ہوتا ہوا صلیب چوک میں سے نکل کر ڈیوڑھی پر پہنچا
چیلے سے حضور میں اطلاع کرائی۔ وہاں تو سب راہ دیکھ رہے تھے خبر ہوتے ہی
محل میں بُلوایا میں جس وقت کہ حضور کے سامنے گیا ہوں تو حضور مسواک کر رہے تھے

میں نے سلام کیا فرمایا آگیا بڑی دیر لگائی۔ میں نے عرض کی تیرہ کوس سے آیا ہوں
فرمایا شاباش!! اب تم کو ایک مہم پر بھیجا جائے گا۔ جیسے تیرے بزرگوں نے سرکار
بادشاہی میں کام انجام دیئے ہیں اسی طرح اس کو انجام دو۔ جاؤ خدا کو سونپا نواب صاحب
تم کو اُس سے مطلع کردینگے۔ نواب فیض علی خاں صاحب اور منشی رام جیداس میرا
ہاتھ پکڑ کے چندر محل میں علیحدہ لے گئے اور اُس راز سے آگاہ کیا حالانکہ وہ غیروقت
تھا اُس وقت مدار المہام احضور میں کیا کام تھا مگر بعد کو معلوم ہوا کہ یہ تینوں صاحب
رات بھر حضور میں موجود ہے اور میرے منتظر تھے۔ مجھ سے نواب صاحب نے
فرمایا جس قدر تم کہو روپیہ ساتھ کردیا جائے اور جتنی جمعیت درکار ہو ساتھ لو میں نے
جواب دیا جمعیت درکار ہے نہ روپیہ نواب صاحب حیران ہوئے پھر کارگذاری
کیا کرے گا میں نے کہا جس کارگذاری پر مجھے بھیجا جاتا ہے خوشی تو یہی ہے کہ
ایک پیسہ خرچ نہ ہو۔ ایک آدمی ساتھ نہ ہو اور مقصد حاصل ہو جائے آپ کو کام
سے کام ہے خدا چاہے کام بخوبی انجام پا جائے گا پھر فرمایا کہ ایک اہلکار ذیہ بندی
کا ہمراہ ہے ایک اہلکار ایجنسی جے پور کا ہے بغیر اس سے ساز کئے ہوئے کاربرآری
مشکل ہے میں نے عرض کی کہ اگر اُس سے ساز کرکے کارروائی کی تو میری کارگذاری
کیا ہے۔ خدا چاہے تو ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو اور کام انجام پا جائے پھر کہا
آخر اُن کے صرف خورد ونوش کی تو تجھے ضرورت پڑے گی خزانہ سے لیجانا چاہیئے
میں نے عرض کی پانسو روپیہ جمعدار خیر کے پاس رکھوا دیئے جائیں وہ اُن کے
کھانے پینے کی خبر گیری کرتا رہیگا۔ مگر ہاں ایک حکم نامہ کونسل کا جاگیرداران اور
تھانہ سپرنٹنڈنٹ وغیرہ کے نام اس مضمون کا ہو جائے کہ جس جاسے جس قدر

امداد کی مجھے ضرورت ہو فوراً میرے پاس پہنچ جائے اور کوئی عدول حکمی نہ کر سکے چنانچہ ایسا ہی ہوا وہ حکم نامہ مجھے دلا دیا گیا وہ مقام چار منزل جے پور سے تھا۔ میں اُن اہلکاران کو ہمراہ لیکر روانہ ہوا۔ اور موقع واردات پر پہنچنے سے پہلے میں نے اپنی کارگذاری کر دی اور وہاں پہنچ کر جس امر کی تحقیقات کے واسطے یہ لوگ میرے ہمراہ گئے تھے اُس کا نام و نشان نہ پایا۔ قائل معقول ہو کر واپس آئے اور ترمبندی کو رپورٹ کی کہ وہ ابرام و اتہام بیجا تھا اس کا کچھ اثر پتا پایا نہیں گیا۔ جب میں نے واپس آکر مہاراج کو سلام کیا تو مہاراج نے فرمایا کہ اگر کوئی سردار ریاست جاتا تو وقت چار لاکھ روپیہ ریاست کے بگاڑ آتا۔ ایسے ایسے اکثر کام نمایاں اس نوکری میں ظہور میں آئے تھے۔ جب میری کارگذاری کا مہاراج کے دل میں گھر ہوا تھا اور عزت و آبرو فرماتے تھے اور وعدہ پرورش بے حد کا فرمایا تھا پھر مجھ سے فرمایا تم اپنی تبدیلی تھانہ سانگانیر پر کرالو مجھے زیادہ تر اتفاق سانگانیر میں رہنے کا ہوتا ہے۔ میں نے عرض کی یہ بھی اختیار حضور کو ہے۔ چنانچہ کونسل میں حکم لکھوا دیا گیا تھا کہ ظہیر الدین حسین افسر کراہہ کی تبدیلی سانگانیر میں ہو جائے اور بغیر منظوری مہاراج دولت نہ تبدیلی ہو نہ معطلی ہو نہ برخاستگی۔ پھر میں ایسا در خور خدمت ہو گیا تھا کہ بڑے بڑے مصاحبین کو رشک و حسد ہوتا تھا ہوا خوری کے وقت نکلتے تھے تو سوائے ہم دو آدمیوں کے تیسرا نہ ہوتا تھا آگے مہاراج اور عقب میں کشن لال چیلا اور میں سب کھڑے دیکھا کرتے کسی کو ہمراہی کا حکم نہ ہوتا تھا اکثر راز ایسے تھے کہ وہ مجھے معلوم تھے یا مہاراج کو یا خدا عالم الغیب ہے میں بہت بڑا بدنصیب ہوں اگر مہاراج اور دو چار برس زندہ رہتے تو خدا جانے میں کس پایۂ اعلےٰ کو پہنچتا جب

میری ترقی عہدہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹی پر فرمائی تھی تو مجھ سے فرمایا تھا تجھے ڈپٹی نہیں کیا
جنرل سپرنٹنڈنٹ کیا ہے۔ سرسہ بھگتانے کے واسطے تمہیں بھیجتا ہوں بعد چھ ماہ
کے جنرل سپرنٹنڈنٹ ہو جائے گا۔ میری شومی طالع سے وہ کوئی تین مہینے میں
انتقال فرما گئے ✦

آٹھواں باب

مہاراجہ جے پور کے حالات

مہاراجہ صاحب بہادر مہاراجہ رام سنگھ جی سری سوامی نہایت دانشمند روشن دماغ بیدار مغز۔ مدبّر مصلحت اندیش۔ موحد کیش۔ رعایا پرور۔ داد گستر۔ عادل۔ فیاض بلا تعصّب۔ انصاف دوست۔ حلیم الطبع سلیم الفکر۔ خوش تدبیر مستقل المزاج خوش رُو۔ خوش خو۔ بجمیع محامد ذاتی و صفاتی موصوف تھے۔ اس مزاج کا کوئی رئیس ہندوستان میں نہ تھا۔ ان مہاراجہ بہادر سے اتر کر شاید نواب یوسف علی خاں صاحب بہادر والیٔ رام پور تھے کہ وہ بھی نہایت درجہ منتظم اور حلیم و سلیم تھے۔ مہاراجہ صاحب کی بنا، فرمانروائی خردمندی ہے کئی سو پرچہ نویس چوکی خانہ میں متعین تھے۔ تمام ہندوستان کا روزنامچہ روزانہ مہاراجہ صاحب کی نظر سے گذرتا تھا جتنی ریاستیں ہندوستانی ہیں سب جا اُن کا خبر نویس موجود رہتا تھا۔ حتّٰے کہ حیدر آباد و دیپور وغیرہ میں اور دفتر گورنری میں خبر نویس موجود تھا۔ گورنر بہادر کے ہمراہ پھرتا تھا اور ذرا ذرا سی خبر مہاراج کو پہنچاتا تھا۔ ہزار ہا روپیہ کا صرف محکمہ خبر کا تھا۔ اور

جا بجا پرچہ نویسوں کو تنخواہیں معقول پہنچتی تھیں۔ اپنی ریاست میں کوئی محکمہ کوئی تعلقہ کوئی نظامت۔ کوئی تحصیل کوئی تھانہ۔ کوئی کارخانہ ایسا نہ تھا جہاں خبر نویس نہ ہو خبر کے داروغہ کو حکم تھا کہ اگر کوئی ضروری خبر ہو اور ہم زنانے محل میں آرام کرتے ہوں تو ہم کو بیدار کرکے خبر پہنچا دو۔ لندن میں ملکہ معظمہ کی خدمت میں مزاج پرسی کا تار روز روانہ ہوتا تھا کسی ایجنٹ رزیڈنٹ کی مجال نہ تھی کہ ان کے منشا کے خلاف ورزی اختیار کرے۔ ہاں اُس کی خاطر و مدارات دلو و دہش مہمانداری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہوتا تھا۔ ایک ادنٰے وصف اُن کا یہ تھا کہ تمام عمر کسی نوکر یا مجرم وغیرہ کی نسبت کوئی کلمہ خلافِ تہذیب دشنام وغیرہ زبان سے نہیں نکلا کسی کو تُو نہیں کہا ادنٰے آدمی سے بھی جی کہہ کر خطاب کیا۔ بہت خفا ہوئے کسی پر تو جا بیوقوف تکیہ کلام تھا۔ مگر باوجود اس حلم کے رعب وجلال اُن کا ایسا تھا کہ گیا نبی گیاب ڈالتی تھی۔ جب کبھی وہ خاموش ہو گئے یہ جان لو غضب آگیا۔ لوگ سمجھ جاتے تھے کہ آج خیر نہیں۔ مزاج برہم ہے۔ تمام اراکین دولت مارے خوف کے تھراتے تھے۔

مہاراجہ صاحب کے زمانہ بے اختیاری میں راول جی صاحب مختار تھے جیپور میں خاک اُڑتی تھی۔ کُل چوبیس لاکھ روپیہ زرِ خالصہ کی آمدنی تھی نہ کوئی محکمہ بندوبست تھا فقط زبانی جمع خرچ تھا۔ رجواڑی گھس گھس تھی۔ جے پور نے جو ترقی پائی ہے اور تہذیب کی روشنی پھیلی ہے۔ وہ مہاراج کے زمانہ میں ہوئی ہے۔ مہاراج صاحب کو جب اختیار حاصل ہوئے ہیں اور پنڈت جی صاحب مصاحب اور مدارالمہام ہوئے ہیں، تب باون محکمے اور کچہریاں اور نظامتیں اور ضلع اور تحصیلیں اور تھانے قائم کئے گئے ہیں اور انتظام ملکی اور مالی۔ فوجداری کلکٹری عدالت نوشیروانی کے قانون

تصنیف ہوئے اور اُن پر عملدرآمد ہوا۔ ادنےٰ سی بات یہ ہے کہ کروڑ ہا روپیہ تعمیر بندوں اور تالابوں اور انتظام آبپاشی پر صرف کر دیا گیا۔ سڑکیں اور صفائی شہر اور مدارس اور شفاخانے تمام ممالک محروسہ میں جاری ہوگئے۔ جے پور کے پانی کا انتظام نلوں کے ذریعہ سے اور روشنی گیاس کا انتظام لالٹینوں وغیرہ کے ذریعے سے ہوا ڈاکوؤں اور قطاع الطریقوں اور رہزنوں۔ غارتگروں۔ ٹھگوں۔ پھانسی گروں وغیرہ کے انسداد کے واسطے محکمہ گرانی انسداد ڈکیتی و ٹھگی قائم کرکے ایسے سخت قانون نافذ فرمائے کہ پناہ دہندگان کے ہوش باختہ ہوگئے ورنہ جے پور کے دروازہ سے باہر رستہ نہیں تھا۔ جتنے نامی نامی غارتگر بدبین رہزن تھے سب پکڑ پکڑ کر قلعوں پر چڑھا دیئے گئے اور سب سرکشوں اور پناہ دہندوں کے کان میں کوڑی ڈال دی گئی۔ مہاراجہ صاحب کو اپنے ادنےٰ آدمی کا پاس تھا۔ اور یہ حکم تھا کہ مار کر آنا پٹ کر نہ آنا میں سمجھ لونگا پھر تو یہ حال ہوگیا سونا اُچھالتے ریاست جے پور میں پھرو کیا مقدور ہے کوئی نظر اُٹھا کر دیکھ لے یہ انتظام ہوگیا کہ شیر بکری ایک گھاٹ پانی پینے لگے۔

عدل و انصاف کا یہ حال تھا کہ چند انصاف مہاراجہ صاحب کی ذات سے ایسے ظہور میں آئے ہیں جیسے بادشاہان سلف کے مشہور روزگار ہیں ازانجملہ ایک یہ معرض بیان میں آتا ہے۔ ریاست ٹونک کے چند قصاب کچھ مویشی خرید کے ریاست جیپور سے ٹونک کو لئے جاتے تھے اثنا دراہ میں ایک منزل پر مقیم ہوئے کچھ گھانس وغیرہ خرید کر مویشی کے آگے ڈال دیا اُس قصبہ کا ایک سانڈ آیا اور اُسے کھانے لگا اور مویشی کو مار کر ہٹا دیا۔ قصابوں نے جو یہ امر دیکھا تو اُس نرگاؤ کو لکڑی سے مار کر بھگا دیا۔ پھر تھوڑی دیر میں وہ آکر چرنے لگا۔ پھر ہٹا دیا گیا۔ جب دو چار مرتبہ ایسا ہوا تو

ایک قصائی کو غصہ آیا اور اُس نے تلوار کھینچ کر اُس کے پاؤں پر ہاتھ مارا نر گاؤ کا پاؤں قلم ہو کر دور جا پڑا۔ پھر کیا تھا ہندو کی عملداری تھی تمام قصبہ میں غل مچ گیا۔ ہاں ہاں لیجو دوڑیو۔ پکڑیو۔ ماریو چہار طرف سے ہونے لگا۔ بیچارے قصاب گرفتار ہوئے۔ تھانہ دار نے مثل تیار کر کے معہ مجرمان ضلع کو چالان کر دی وہاں سے بعد تحقیقات فوجلدری کو روانہ ہوئے فوجداری چونکہ مقدمہ مذہبی ہے تجویز سزائے سنگین کی رائے لکھی گئی اور مثل محکمہ اپیل کو روانہ ہوئی محکمہ اپیل سے کوئی اور رائے ظاہر کی گئی حتیٰ کہ محکمہ کونسل میں پہنچی ممبران کونسل کی یہ رائے قرار پائی کہ یہ مقدمہ مذہبی ہے۔ اس میں دھرم شاستر سے موسمہ لیا جائے اُس کے بموجب تجویز سزا ہونی مناسب ہے چنانچہ دھرم شاستری جی کو بلایا گیا اور موسمہ لیا گیا تو انہوں نے حکم قصاص کیا یعنی درجہ اوّل کی سزائے موت درجہ دوم کی سزا قطع یدین درجہ سوم حبس دوام اب اختیار مزاحکام کو ہے۔ غرضکہ منظوری کے واسطے پیشی رکھی گئی۔ اور کسی وقت پر مہاراج کے سامنے پیش ہوئے۔ مہاراج نے از ابتدا تا انتہا مسل کا ایک ایک حرف سنا اور سب محکمہ جات کی رائے سُنی پھر حکم دیا کہ شاستری جی کو بلاؤ جب شاستری جی آئے تو اُن سے فرمایا کہ آپ نے یہ سزا بموجب اپنے مذہب کے تجویز کی ہے یا بموجب شریعت مسلمانان انہوں نے جواب دیا بموجب دھرم شاستر مسلمانوں کے مذہب سے کیا کام ہے مہاراج نے فرمایا کہ مجرم غیر مذہب کا آدمی ہے شرطِ عدالت یہی ہے کہ اُس کے مذہب کے موافق سزا دینی تھی۔ اس مقدمہ میں شرع اہل اسلام سے فتوےٰ لینا تھا یہ کارروائی ناجائز ہے کیونکہ اُن کے مذہب میں اُس کا کھانا روا ہے ہمارے نزدیک یہی سزا کافی ہے کہ دورانِ مقدمہ کو عرصہ ڈیڑھ سال کا منقضی ہو گیا ہے۔ یہی میعادِ قید کافی ہے مجرم کو رہائی دی جائے اور اُسی

وقت اُس کو رہا کر دیا۔ یہ انصاف بھلا کسی ہندو راجہ سے ہو سکتا ہے ہرگز نہیں ہو سکتا ہے۔ اسی طرح کے بہت سے انصاف مہاراج کیے ہیں۔ مہاراجہ صاحب اپنے وقت کے نوشیروان عادل تھے حلم و تحمّل کا یہ حال تھا کہ ایک بار ایک غریب مسافر امیدوار بہت روز سے اس جستجو میں ہے۔ کہ کسی طرح مہاراجہ صاحب تک باریابی ہو تو کچھ اپنا عرض حال کیا جائے مگر کوئی موقعہ دستیاب نہ ہوتا تھا۔ ایک دن یہ محل کی ڈیوڑھی پر کھڑے تھے کہ پہرہ دار ڈیوڑھی سے ٹہلتا ہوا پرے کو سرک گیا۔ یہ موقعہ پاکر جب ڈیوڑھی کے اندر داخل ہوئے اور سیڑھیوں پر سے چڑھ کر خاص اُس کمرے میں پہنچے۔ جہاں مہاراجہ تشریف رکھتے تھے اور اتفاق سے اُس وقت پردہ تھا اور زنانی سواریاں تشریف رکھتی تھیں اور خاص مہارانی صاحبہ موجود تھیں پس یہ دیکھتے ہی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر پچھلے قدموں پلٹے اور مہاراجہ صاحب نے ان کو دیکھا اور اُٹھ کر آئے انہوں نے سلام کیا مہاراجہ صاحب نے آکر اُن کے دونوں ہاتھ پکڑ لیئے اور پوچھا تم کون ہو انہوں نے بیان کیا بندہ اللہ کا۔ پھر مہاراج نے فرمایا بندے اللہ کے تو سب ہیں آپ کون ذات ہیں اور کون ہیں انہوں نے جواب دیا مسافر ہوں اور مولوی ہوں۔ مہاراجہ صاحب۔ اس مقام پر کیا کام ہے۔ مولوی صاحب آپکے پاس کچھ عرض کرنے آیا تھا۔ مہاراجہ صاحب کیا عرضِ حال ہے۔ مولوی صاحب: عیال دار ہوں بیدستگاہ ہوں امیدوار روزگار ہوں۔ مہاراجہ صاحب۔ پہرانی نے تم کو نہ روکا۔ مولوی صاحب اُس کا قصور نہیں وہ ٹہل کر پرے کو گیا میں آنکھ بچا کر یہاں چلا آیا قصور میرا ہے میں حضور کا قصوروار ہوں جو چاہیں میری نسبت سزا تجویز فرمائیں بہرحال مستوجبِ عقوبت ہوں کہ ایسے محل پر حاضرِ خدمت ہوا مگر حضور بادشاہ

وقت ہیں اور شہزادی اور بیگمات رعیت۔ کے ماں باپ ہوتے ہیں اور رعیّت بمنزلہ فرزند و اولاد ہوتی ہے پھر اولاد سے ماں باپ کا کیا پردہ ہوتا ہے۔ مہاراجہ صاحب آپ مولوی ہیں۔ آپ نے تحصیلِ علوم کہاں کی۔ مولوی صاحب۔ لکھنؤ میں۔ مہاراجہ صاحب۔ صداقت اس کی۔ مولوی صاحب .... میرا امتحان لیا جائے۔ مہاراجہ صاحب آپ اگر مولوی نہ ہوتے تو اس وقت آپ کی نسبت خدا جانے کیا سزا تجویز کرتا میں فرقۂ علماء و فضلا کو اپنا مقتدا اور پیشوا سمجھتا ہوں۔ خیر یہ حرکت آپ سے ہوئی تو بسبب نادانی کے ہوئی میں نے معاف کی چیلوں کو آواز دی۔ ایک چیلا آکر حاضر ہوا۔ مولوی صاحب کو مولوی رشید الدین صاحب کے پاس لے جاؤ اور مولوی صاحب کے پاس جاکر کہو ان مولوی صاحب کو آپ کے پاس بھیجا جاتا ہے کہ ان کے علم و فضل کا امتحان لے کر آپ اسی وقت مجھی اطلاع دیجیے اگر امتحان میں درست اتریں تو ان کو کسی مدرسہ کی مدرسی پر مامور کر کے مجھے اطلاع دیں چنانچہ ایسا ہی ظہور میں آیا اور مولوی رشید الدین صاحب نے ان کے علم و فضل کی تعریف لکھ کر تیس روپیہ ماہوار کی اسامی پر مامور کیا۔ بھلا ایسا حلم و تحمل کسی دوسرے رئیس سے ہو سکتا ہے یہ مہاراج رام سنگھ جی کا ظرفِ عالی تھا +

مہاراجہ کے خصائل

مہاراج رام سنگھ کی صحبت میں ہر قسم کے اشخاص موجود رہتے تھے۔ دو چار درویش مصری مسلمان صوفی الطریق دو چار ہندو فقیر بیراگی موحّد خدا پرست مہاراجہ کا طریقہ صوفیہ موحدانہ تھا۔ بیشتر مسائلِ تصوف کا ذکر کرتے رہتے تھے درویشانہ مزاج رکھتے تھے۔ زیبائیش امیرانہ سے نفور تھے۔ لباسِ شاہانہ رکھتے تھے تکلف سے

برکنار رہتے گھوڑے کی کرڑی بچھا کر سوجایا کرتے تھے۔ پلنگ۔ چھپرکھٹ کی استراحت پرزام رکھتے تھے۔ بے تکلفی کو بہت پسند کرتے۔ مزاج میں عجز و انکسار بدرجۂ غایت تھا۔ نخوت اور رعونت کسی طرح کی نہ تھی۔ صحبت میں دس پانچ فقیر۔ دوچار حکیم۔ ایک دو ڈاکٹر۔ ایک دو انگریز۔ دوچار رنڈیاں۔ ایک دو ارباب نشاط۔ ہر فن کے ایک دو شکار جاننے والے۔ ایک دو تیتنگ باز وغیرہ ہر وقت موجود رہتے تھے۔ جہاں جاتے تھے۔ یہ جمگھٹا ان کے ساتھ جاتا تھا اور تھوڑے سے راجپوت سرحالہ بھی ساتھ ہوتے تھے۔ مسلمانوں سے بہت رغبت تھی۔ اُس قوم سے ایک مرد پیر نابینا یاجو میاں نام پرانا رفیق تھا اور شب و روز پاس رہتا تھا۔ حتیٰ کہ مہاراج کے تشبخوابی کے کمرے کی خدمت بھی اُس کا حجرہ تھا۔ صبح کو مہاراج اُس کا مُنہ دیکھ کر بیدار ہوا کرتے تھے۔ وہ مرد باخدا قبل از نماز صبح بیدار ہو کر حوائج ضروری سے فارغ ہو کر نماز پڑھتا اور بعد ورد وظائف مہاراج کے پاس جاکر مونہ بالاپوش یا چادر اُٹھاتا اور آواز دیتا کہ مہاراج صبح کا وقت ہے بیدار ہو کر خدا رسول کا ذکر کرو تو مہاراج فوراً آنکھیں کھول کر پہلے اُس کا مُنہ دیکھتے تھے بعد اور اشخاص کا مجرا لیتے تھے لاکھوں روپیہ لوگوں کو داد و دہش کے مسافر خانوں میں بھی غربا مساکین فقرا مسافرین کو سدابرت تقسیم ہوتا تھا۔ ایک ایک پیٹیا فی کس ملتا تھا۔ پیٹیا کی مقدار یہ تھی۔ آرد گندم سیر بھر دال پاؤ بھر۔ روغن زرد چھٹانک بھر۔ قند سیاہ پاؤ بھر۔ دو پیسے نقد یہ کئی سو پیٹیاں معمولی روز تقسیم ہوتا تھا۔ علاوہ خیر خیرات جے پور کی مشہور ہے۔

محرّم

محرّم کی تعزیہ داری کے واسطے بارہ بڑے فوج کے تھے اُن کو ڈھائی ڈھائی سو روپیہ تقسیم ہوتے تھے اور خاص تعزیہ داری جو حضور کی ہوتی

بھی اُس کا صرف نیاز نذر علیحدہ تھا - اور بڑے پیچھے پچاس جمان کی نوکری معاف

تھی - تعزیہ تیاری کے لئے -

حجاج کی امداد

حجاج کو ہر سال بیس پچیس ہزار روپے زادِ راہ حج کے لئے اور چھ ماہ کی رخصت عطا ہوتی تھی - نتیجہ اس خیر و برکت کا یہ ہوا کہ آمدنی نذرِ خالصہ کی کروڑ روپیہ سے اوپر ترقی کر گئی - اور جاگیر اور صیغہ خیرات علیحدہ -

وفات

جب مہاراج رام سنگھ جی نے انتقال فرمایا ہے - تو رعیت آسودہ حال فارغ البال خزانے مالا مال ملازم شاد و آباد تھے تمام شہر میں تین روز ماتم رہا ہے -

شہر جے پور باعتبارِ خوش حالی عمارت و لطافت اور بحالی بلادِ ہند میں اپنا نظیر نہیں رکھتا ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است　　ہمین است و ہمین است و ہمین است

اللہ اس ریاست کو آباد رکھے بڑا غریب پرور ملک ہے -

بعد انتقال مہاراج رام سنگھ کے ایک انقلابِ عظیم برپا ہوا اور مہاراجہ مادھو سنگھ بہادر تخت نشین ہوئے - ان کے زمانہ بے اختیاری میں ایک عجب طوفانِ بے تمیزی برپا تھا - ایک کو ایک کھائے جاتا تھا ٹھاکر فتح سنگھ جی اور سلس صاحب ایجنٹ جے پور ریاست کا کام کرتے تھے - عجیب ایک اندھیر تھا کہ کچھ بیان نہیں ہو سکتا - جے پور کے عہدے کے لئے بازار بھرے تھے اخباروں میں شائع ہوتا تھا -

جے پور کی نوکری مالن کا ٹوکرا ہے جس کے جی میں آئے خرید لے -

غرضکہ اس انقلاب پُر آشوب میں جتنے ملازم مہاراج کے وقت تھے ۔ سب خانہ نشین ہو گئے اور نئے نئے آدمی روپے خرچ کر کے نوکر ہو گئے ایک ٹھاکر سردار جنرل سپرنٹنڈنٹ ہوئے اور اُنھوں نے قدیمیوں کو بطمعِ مال موقوف کرنا شروع کیا اور جدید نوکر رکھے گئے ۔ ہم چار اضلاع میں چار ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تھے ۔ چاروں یک قلم موقوف ہوئے ۔ مجھے ڈیڑھ دو برس تک نالش و فریاد رہی ۔ آخر وہ صاحب ایجنٹ بھی موقوف ہوئے اور ٹھاکر فتح سنگھ بھی موقوف اور بے دانہ تیا پانی ہو گیا ۔ اور وہ جنرل سپرنٹنڈنٹ بھی قید ہو گئے ۔ مگر فریادیوں کی کچھ داد رسی نہ ہوئی ۔ اور کوئی بحال نہ ہوا ۔ چونکہ میں بھی اُن ہی ہر چہار ڈپٹیوں کی موقوفی میں شامل تھا ۔ مجبور خانہ نشین ہونا پڑا ۔ چودہ برس تک مہاراج رام سنگھ کی نوکری کی تین برس مہاراج مادھو سنگھ بہادر کی اس کا صلہ کارگذاری یہ ملا کہ بےقصور موقوف ہو کر گھر بیٹھنا پڑا ۔ مگر ریاست نے میرے حقوق قدیم الخدمتی پر نظر کر کے میرے فرزند سجّاد مرزا کو تھانہ دار کر دیا تھا ۔

ریاست کی آمدنی

مجھے اس ملک میں وارد ہوئے قریب چالیس سال کے عرصہ منقضی ہونے کو آیا ہے ۔ اس ملک کا گوشہ گوشہ میرا دیکھا ہوا ہے ۔ اس کا طول جنوب و شمال میں قریب تین سو میل کے ہوگا اور عرض مشرق و مغرب میں قریب ڈیڑھ سو میل کے ہوگا ۔ زرِ حاصل اس ملک کا ایک کروڑ روپیہ کا تخمینہ تھا اُس کی تقسیم تین حصّوں پر منقسم کی گئی تھی ۔ ایک حصّہ زرِ خالصہ ریاست یعنی تینتیس ۳۳ لاکھ روپیہ آمدنی ریاست اور اسی قدر تینتیس لاکھ جاگیرداران ان میں سب بھائی بیٹے ریاست کے تیسرے حصّہ میں صیغہ یعنی صیغہ خواب وہ بھی تینتیس لاکھ اس میں پرورشِ برہمنان اور خرچ اخراجات معبدگاہان و مندران وغیرہ اور کل انعامات

وغیرہ میں بصیغہ یہ امر قبل از اختیارات مہاراجہ رام سنگھ بہادر الیا شمار کیا جاتا تھا مگر زمان مہاراجہ صاحب ممدوح میں نہایت خوشی سے داد و دہش مہاراجہ صاحب سہ چند ترقی پاگیا۔ اب تقریب ایک کروڑ سے زرِ خالصہ کی نشست ہے ؀

نواب احمد علی خاں رونق

قریب اٹھارہ اُنیس سال کے میرا زمانہ نوکری سرکار میں بسر ہُوا۔ اس عرصہ میں شعر و سخن کی بھی بہت کم فرصت ملی۔ اس عرصہ میں شاید کوئی پچاس چالیس غزل اور ایک دو قصیدے کا اتفاق ہُوا وہ بھی بجبر جب کبھی نہایت تاکید اور میرے دوست آشنا نے از حد جبر کیا تو مجبور مشاعرہ کی غزل لکھ کر شریک بزم ہو گیا۔ اکثر حکیم محمد سلیم خاں صاحب فرمائش کر کے غزل لکھواتے تھے۔ بالطبع میری طبیعت راغب نہ تھی اور احباب کے فرمان سے مجبور تھا۔ ایک روز حسنِ اتفاق سے میں اپنے تھانہ سانگانیر میں تھا اور مہاراجہ صاحب بھی وہیں تشریف رکھتے تھے اور ڈیوڑھی پر میرا بندوبست اپنی نوکری پر حاضر تھا جس باغ میں مہاراجہ صاحب فروکش تھے اُس کے دروازہ کی چوکی پر میں بیٹھا ہوا قلیان پی رہا تھا۔ تو دیکھتا کیا ہوں کہ ایک بزرگوار ساٹھ پینسٹھ برس کا سن و سال جسیم۔ شکاری لباس ماشی رنگ کا انگرکھہ مانسی پاجامہ مانسی عمامہ جیسر سے وارد ہوئے اور تانگہ پر سے اُتر کر میرے پاس آئے۔ میں نے تعظیم دی۔ میرے پاس بیٹھ کر فرمایا میں حقہ پیوں گا۔ میں نے کلی پیش کر دی۔ حقہ پینے لگے۔ مجھ سے دریافت کیا کہ تیرا نام کیا ہے۔ میں نے جواب میں کہا حقیر کو ظہیرالدین کہتے ہیں یہ سُنکر ذرا متامل ہوئے۔ بعدہٗ دریافت کیا کہ آپ یہاں کیوں ہیں۔ میں نے کہا نوکری پر میں یہاں تھانہ دار ہوں پھر فرمایا ظہیر دہلوی تو آپ نہیں۔ میں نے کہا دہلوی تو

کا کلام ہیں یا ہی ہوں مگر وہ ظہیر کوئی اور ہوں گے جن کی تلاش آپ کو ہے ۔ یہ سُنتے ہی ایک قہقہہ لگایا اور یہ شعر پڑھا۔

یار در خانۂ و ما گردِ جہاں میگردیم   آب در کوزۂ و ما تشنہ لباں میگردیم

اور جلدی سے بغلگیر ہو کر فرمایا کہ ایک عرصۂ دراز سے مجھے اور میرے بڑے بھائی نواب عبدالکریم خاں صاحب کو اس نام کی تلاش تھی وہ اسی آرزو میں انتقال فرما گئے مگر الحمد للہ کہ میری تمنا آج برآئی کہ آپ سے ملاقات ہوئی میں نے پوچھا کہ آپ مجھے کیا جانیں فرمایا کہ آپ کی غزل ایک محفل میں میں نے اور میرے بھائی نے ایک مغنیہ کی زبان سے سُنی تھی اُس روز سے مجھے اس کلام سے تعشق ہوا ۔ اور میرے بھائی بھی یہ کہتے تھے کہ صاحبِ غزل کا پتہ مل جائے تو میں شاگرد ہو جاؤں اُس غزل کے دو تین شعر مجھے یاد ہیں وہ غزل یہ تھی۔

بتوں سے بچکے چلنے پر بھی آفت آہی جاتی ہے   یہ کافر وہ قیامت ہیں طبیعت آہی جاتی ہے

پھر فرمایا کہ مجھے بھی ابتدائے عمر سے شعر و سخن کا شوق ہے اور شوق کیسا کہ بیماری ہے اس شوق میں لکھنؤ گیا اور شیخ امام بخش ناسخ سے خواجہ حیدر علی آتش سے اور دیگر شعرائے نامور سے مل کر آیا ہوں تین دیوان بھی لکھ چکا ہوں ۔ میاں خدا بخش صاحب تنویر بھی ٹونک میں آئے تھے ۔ میرے پاس نوکر رہے پھر چلے گئے ۔ آپ کی تلاش تھی ۔ اب آپ مجھے شاگرد کیجئے اور کچھ بتائیے میں نے کہا جناب آپ کا سن میرے والد کے برابر ہے میرا سن تینتیس چونتیس سال کا ہوگا ۔ آپ کا سن ساٹھ سے تجاوز کر گیا کہا آپ کیا فرماتے ہیں ۔ بزرگی بعقل است نہ بسال ۔ یہ باتیں ابھی مجھ سے ہو ہی رہی تھیں کہ سامنے سے مہاراجہ صاحب نے دیکھا اور کہا کہ میاں یہاں

کیوں نہیں آتے ہو۔ پان رکھے ہیں۔ کیوں بیٹھ گئے۔ نواب صاحب! ابھی حاضر ہوتا ہوں۔ یہ میرے اُستاد ہیں ان کے پاس بیٹھ کر حقہ پی رہا تھا۔ مہاراجہ صاحب۔ پھر میاں گیا تمہارے واسطے یہاں حقہ کی ممانعت ہے۔ نواب صاحب نہیں حضور ان سے کچھ باتیں کرتا تھا۔ حاضر ہوا۔ غرضکہ نواب صاحب اُٹھ کر مہاراج صاحب کے پاس آئے۔ مہاراجہ صاحب نے متعجب ہوکر پوچھا کہ یہ آپ کے اُستاد کس بات کے ہیں۔ نواب صاحب۔ آپ کو معلوم ہے کہ مجھے شعروسخن کی دھت ہے۔ مہاراجہ صاحب! تو آہا یہ شاعر بھی ہیں مجھ سے تو آج تک انہوں نے بیان نہیں کیا کہ شعر کہتا ہوں نہ مجھے کبھی کچھ سُنایا۔ انہیں بُلا ہی لو۔ غرضکہ نواب صاحب نے مجھے آواز دی کہ حضرت یہاں آئیے۔ مہاراج صاحب یاد فرماتے ہیں میں قریب گیا تو مہاراج صاحب نے فرمایا تھانہ دار جی آج تک تم نے کبھی ذکر شعروسخن کا نہیں کیا میں نے عرض کیا کبھی اس قسم کا تذکرہ سرکار میں آیا نہیں۔ میری عادت نہیں کہ خود اپنے مُنہ سے میاں مٹھو بنوں۔ مہاراج صاحب اچھا تو اب کچھ سُناؤ۔ میں نے عرض کی پھاٹک تک جانے کی اجازت ہو جائے تو کچھ لاؤں فرمایا جاؤ میں نے تھانہ میں آکر بستے میں دیکھا ایک قصیدہ ناتمام سا نکل آیا۔ اُسے جلدی جلدی گھسیٹ کر اور اُس ہی نام درج کرکے دو گھنٹہ میں لے گیا اور مہاراج صاحب کو سنایا دونو صاحب نہایت خوش ہوئے اور بہت داد دی نواب احمد علی خاں صاحب نے فرمایا حضور یہ اس وقت فی البدیہہ لکھ کر لائے ہیں۔ مہاراج کو زیادہ تعجب ہوا پھر مہاراج صاحب نے فرمایا مجھے بھی سُننے کا شوق ہے۔ سُناتے رہا کرو یہ حال تو مجھے آج ہی معلوم ہوا ہے میں مشاعرہ کروں گا۔ اُس میں لکھنا میں نے عرض کی بہت بہتر لعبہ کو نواب صاحب نے عرض کی کہ میں اب سامنے کے

باغیچے میں ٹھہرتا ہوں نماز پڑھ کر پھر آؤں گا۔ یہ کہہ کر میں اور وہ باہر آئے اور سامنے
والے باغیچہ میں جاکر بیٹھے۔ نواب صاحب نے اسی وقت پانچ روپیہ کی شیرنی منگائی
اور کہا نیاز دیجئے۔ میں نے نیاز دی۔ وہ شیرینی تقسیم ہوئی۔ بعد نواب صاحب نے کہا
میری غزل کی اصلاح کی کیا صورت ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نے بچشم خود دیکھ لیا کہ مجھے
فرصت ہی سارا دن میسر نہیں ہوتی۔ میرا کہنا سننا سب ترک ہو گیا ہے۔ اب میرا چھوٹا
بھائی امراؤ مرزا انور مجھ سے بہتر کہتا ہے۔ آپ اُس سے اصلاح لیجئے اور وہ آپ کو
دل سے بتائے گا اور وہ اب جے پور آئے گا۔ جب مہاراجہ صاحب یہاں سے
تشریف لے جائیں گے اُس وقت میں اپنے بھائی کو لے کر مکان پر حاضر ہوں گا۔ غرضکہ
بعد دو تین روز کے مہاراج صاحب جے پور میں تشریف لے گئے اور میں نے جے پور
جاکر امراؤ مرزا کو بلوایا اور نواب صاحب نے غزل دکھائی اُس نے ان کے مواجہہ میں
غزل کی اصلاح دی اور جو نقص اس میں تھے اُس سے آگاہ کیا بس پھر کیا تھا آنکھیں
کھل گئیں۔ مرد جہاندیدہ اور سنجیدہ سردار تھے اشارہ کافی تھا طبیعت تو موزوں تھی۔
بنانے کی دیر تھی پھر میں ایک ماہ بعد جب جاکر ملا ہوں تو مجھ سے بیان کیا کہ اُستاد
تمہارے بھائی نے میری آنکھوں سے پردہ اٹھا دیا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ میں کچھ
بھی نہیں جانتا تھا اور اور لوگ بھی ناواقف ہیں۔ تنکے کے اوجھل پہاڑ ہے میں نے
اپنے تینوں دیوان چھپوا دیئے اور اب نئے سر سے پھر کہنا شروع کیا ہے دو غزلیں
بلا ناغہ میں لکھتا ہوں اور اصلاح ہوتی جاتی ہے۔ اور وقت فرصت میں نے شعر گوئی
کا مقرر کیا ہے دس بجے رات کے میں پلنگ پر لیٹتا ہوں لکھنے والے میرے پلنگ
کے نیچے بیٹھے لکھتے جاتے ہیں اور میں کہتا جاتا ہوں حاصل کلام یہ کہ ایک دیوان لکھکر

اور تیار کیا اکثر اُن کے یہاں میری صحبت رہتی تھی اُس میں کچھ سُننے کا اتفاق مجھے
ہو جاتا تھا۔ اور نہ نوکری سے فرصت تھی ورنہ آج تک میرا کلام بہت ہوتا۔ اب نوکری
سے یکسو ہو کر خانہ نشین ہوا ہوں اور میرا بھائی دلّی جا کر ملازم ہو گیا ہے۔ دو تین سال
میں بے روزگار رہا۔ پھر میں بھوپال گیا ہوں اور وہاں مشاعرہ نواب شاہ جہاں بیگم
صاحبہ کے مواجہہ میں ہوتے ہیں۔ اُن مشاعروں میں شریک رہا ہوں۔ چند غزلیں جب
لکھی گئیں۔ نواب صدیق حسن خاں نے مجھے امیدوار کیا تھا۔ چار ماہ میں ٹھہرا پھر
مجھے انتقال برادر مرحوم کی خبر پہنچی میں واپس جے پور آ گیا تو نواب صاحب نے فرمایا
کہ تمہارے بھائی کا انتقال ہو گیا۔ مجھے اُس کا نہایت صدمہ ہے۔ اب آپ میرے
پاس رہیئے۔ مجھ سے جدا نہ ہو جیئے جو سلوک میں اُن سے کرتا تھا وہ آپ سے کرونگا
چنانچہ میں اُس روز سے اُن کی رفاقت میں رہا۔ ایک دیوان دوم کی میں نے اصلاح
کی اور ایک میرے بھائی نے پہلا دیوان جو میرے بھائی نے بنایا تھا وہ چھپ گیا
دیوان رونق موجود ہے دوسرے کے چھپنے کی تیاری تھی کہ وہ انتقال فرما گئے مگر دونو
دیوان اُن کے ایسے ہیں کہ ہم دونوں بھائیوں کے برابر بلکہ کسی درجہ اوّل ہیں کیونکہ ہم
دونوں نے جان توڑ کر لکھے ہیں اپنے کلام سے اُن کے کلام کو بڑھا دیا جب ایسا شاگرد
لائق فائق قدردان خوش عقیدہ ہو تو محنت کرنے کو جی چاہتا ہے نواب احمد علی خاں
صاحب مرحوم نے جو میری قدر و منزلت کی ہے ایسی کوئی شاگرد اُستاد کی نہ کریگا۔
کوئی چیز ایسی نہ ہو گی کہ وہ مجھ سے دریغ کرتے ہوں حتّٰے کہ وہ انگ پیتے تھے۔
تو مجھے پلا دیتے تھے نسخہ معجون یاقوتی سات روپے میں کرایا تھا اُس میں سے
بھی مجھے ایک ماشہ بھیج دی یہاں تک اُن کو مجھ سے عقیدت تھی کہ اکثر ایسا ہوا ہے

کوئی عمدہ شے اُن کے آگے رکھی گئی۔ تو پہلے کہتے تھے کہ ایک چمچہ اُس میں سے تو کھالے تو میں کھاؤں میں کہتا حضرت آپ کیا فرماتے ہیں وہ کہتے اس لئے کہ تیری زبان کا اثر میری زبان میں آجائے۔ جس وقت اُنہوں نے انتقال فرمایا ہے تو میں اوپر پلنگ کے بیٹھا ہُوا تھا اور میرا ہاتھ اُنہوں نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے اپنے سینہ پر رکھ چھوڑا تھا۔ اسی طرح اُن کا دم نکلا بڑے صاحبزادے اُن کے سامنے بیٹھے ہوئے دیکھ رہے تھے زندگی بھر اُنہوں نے مجھے اپنے سے جدا نہ ہونے دیا بارہا نواب ابراہیم علیخاں صاحب بہادر نے مجھے طلب کیا کہ دادا تم استاد کو مجھے دے دو صاف جواب دیا آج تو تم استاد کو مجھ سے طلب کرتے ہو اور پھر اُن کی تعظیم و تکریم میں فرق آیا تو مجھے رنج ہوگا اور مجھے تم سے کشیدگی ہو جائے گی میں اپنی زندگی میں تو دیتا نہیں بعد میرے مرنے کے تم کو اختیار ہے تم بُلا لینا۔ چنانچہ ایسا ہی ظہور میں آیا۔ بعد انتقال نواب احمد علی خاں صاحب کے نواب صاحب بہادر نے اُن کے صاحبزادوں سے کہلا بھیجا کہ تم اب اُستاد کو میرے پاس بھیجدو۔ اور حسب الطلب نواب صاحب بہادر کے میں ٹونک میں گیا۔

جس زمانہ میں کہ میں نواب احمد علیخاں صاحب مرحوم کی رفاقت میں تھا تو نواب صاحب کو مشاعرہ کا شوق از حد تھا۔ ہمیشہ مشاعرہ وغیرہ ہوتے رہتے اور نواب صاحب کی بھی بتاکید غزلیں منگواتے تھے البتہ دو سو غزل کے قریب مجھ سے نواب صاحب نے لکھوائیں۔ دیوانِ اول گلستانِ سخن اُن کے زمانہ حیات میں قریب اختتام پہنچ گیا تھا۔

ملازمتی کارگزاریاں | جس زمانہ میں میں تھانہ دار تھا اور نظر پر ورش مہاراجہ

صاحب کی میرے حال پرتھی تو اکثر کارہائے نمایاں کا انجام ظہور پذیر ہوتا رہتا تھا
اور حکام بالا دست اکثر مہمات اہم پر مجھ کو بھیجتے رہتے تھے جانتے تھے کہ یہ کسی
حمایتی سے دبنے والا نہیں۔ ریاست جےپور میں قدیم الایام سے یہ بات چلی آتی
تھی۔ کہ بڑے بڑے جو سردار جاگیر ریاست تھے اُن کے دیہات میں جو کوئی مجرم
جاکر پناہ گزین ہوتا تھا وہ اس کو گرفتار کرادینا بہت معیوب جانتے تھے یہ امر گویا ایک
طرح کی بہادری میں تصوّر کیا جاتا تھا کہ فلاں مکان میں سے مجرم گرفتار نہیں ہوتا اور
پناہ دہندہ پناہ پذیر کو ہرگز نہیں دیتا۔ خصوصًا وہ جاگیردار جو اراکین ریاست متصور
ہوتے تھے۔ راول جی صاحب اور اُن کے بھائی ٹھاکر صاحب کہ جن کے خاندان میں
قدیم سے مدارالمہامی ہوتے چلے آئے تھے تو ایسے مواضعات سرکش اور حمایتی کی تعمیل
احکامات کے واسطے مجھے بھیجا جاتا تھا ایک بار حسن اتفاق سے قصبہ ساہدہ ٹھاکر
راول جی صاحب کا خاص مولد و مسکن اس کا تھا۔ اُس میں تین مجرم واردات غارتگری
کے پناہ گزین ہیں اور مجھے پتہ لگا اور میں نے جاکر خاص ساہدہ میں اُن کو گرفتار کیا۔
کامداران راول جی صاحب مارج اور مانع ہوئے کہ ایسا کبھی نہیں ہوا مجرم یہاں
سے کوئی تھانہ دار یا ملازم فوجداری گرفتار کرکے لے گیا ہو تم ان کو چھوڑ دو۔ اگر
راج کو ان کی طلبی منظور ہے تو بذریعہ تحریر طلب کرے۔ ہم اپنے طور پر بھیجدینگے
میں نے جواب دیا پھر راج کی حکومت ہی کیا ہوئی جب مجرم کو گرفتار نہیں کر سکتا
میں ان کو ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔ اسی طرح ہتکڑی بیڑی ڈال کر لے جاؤنگا۔
اُنہوں نے دیکھا کہ یہ ان دھمکیوں میں نہ آئیگا تو نرمی پر اترے اور طمع دینے لگے
حتےٰ کہ تین ہزار روپیہ کا لالچ دیا کہ تم ان کو چھوڑ جاؤ تین ہزار روپیہ ہم دیتے ہیں۔

فقط اتنی بات کہ ٹھکانے کی آن ٹوٹتی ہے اور تمام ریاست میں بدنامی ہے کہ ٹھکانے
میں سے بناہ پذیر گرفتار ہو گئے تھے جواب دیا کہ بیشتر تو شاید میں رسید لے کر تمہارے
حوالہ بھی کر دیتا۔ مگر اب تم نے رشوت کا نام لے دیا ہے تو میں ہرگز نہ چھوڑوں گا کس
لئے کہ آج تو یہ میری قید میں ہیں اور ہتکڑی بیڑی میں نے ڈال رکھی ہے اور کل اسی
طرح ہتکڑی اور بیڑی میرے ہاتھ پاؤں میں ہو گی۔ اس پر گفتگو طول کھنچ گئی۔ راول جی
صاحب کے کامدار سے اُنہوں نے کہا۔ بھلا دیکھیں تو کیسے تم ان مجرموں کو لے جا سکتے
ہو بیسیوں تھانہ دار آئے اور یوں ہی ہم نے چلا دیئے میں نے جواب دیا کہ کوئی تھانہ دار
ہی نہ آیا ہو گا نمک حرام رشوتی والے ہوں گے میں ان کو لے جاؤں اور ڈنکے کی چوٹ
لے جاؤں اور سامنے ایک مکان محفوظ مندر کا تھا۔ اُس پر قبضہ کر لیا اور اُن مجرموں کو
اُس کی کوٹھڑی میں بند کیا اور باہر اپنے ہمراہیاں جمعیت کا بندوبست کر دیا۔ اور برابر
کے تھانہ داران کو اور سر گرداور کو بذریعہ رقعہ جات بنا بر امداد طلب کیا اور جنرل سپرنٹنڈنٹ
کو اس مضمون کی عرضی لکھی اور امداد طلب کی اور سواران کے ہاتھ رقعہ روانہ کئے غرضکہ
دوپہر کے عرصہ میں دونو تھانہ دار اور گرداور میری امداد کو آپہنچے اب میرے پاس پچاس
سوار اور دس پندرہ سو کی جمعیت ہو گئی سب ملازمان راول جی صاحب نے یہ کام کیا
کہ دروازہ شہر پناہ کے بند کرا دیئے اور ہر ایک دروازہ پر تین تین سو چار چار سو آدمیوں
کی جمعیت رکھ دی کہ ملزموں کو باہر نہ لے جا سکیں اُدھر ساہو و بقالوں کو منادی کرا دی
کہ کوئی ملازمان سرکاری کو رسد نہ دے اب گھوڑے بھوکے ہیں اور آدمی بھوکے
ہیں سب حیران ہیں کہ یا الٰہی کس مصیبت میں گرفتار ہو گئے سوچتے سوچتے ایک بات
خیال میں آئی۔ مندر کے سامنے ایک گھاس کی گاڑی لگی ہوئی تھی اور وہ ایک بنیے

کی تھی اور اُسی کی دوکان آٹے دال کی تھی جاتے ہی اُس بقال کا کان پکڑ کے اُٹھا
لایا۔ اور مندر میں لاکر اُسے اوندھا ڈال کر اُس کی کمر پر ایک من بھر کا پتھر رکھ دیا اور
اُسے کہا کہ اب ہم بھوکے مریں گے مگر پہلے تجھے مار ڈالیں گے تو جانتا ہے۔ کہ
بڑے راج کے نوکر ہیں اور راج نوکری پر آئے ہوئے ہیں۔ ہمارا کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔
یا تو سیدھی طرح ہم کو رسد دیدے اور نہیں تیری دوکان گھر بار سب لوٹ لیں گے
وہ لگا واو فریاد مچانے۔ اب راول جی کے آدمیوں کا یہ مقدور نہیں کہ ہم سے اگر زبردستی
بنیئے کو چھوڑا کرے جاتے فقط زبانی گیدڑ بھبکیاں تھیں جب بنیئے نے دیکھ لیا کوئی فریاد
کو نہیں پہنچ سکتا تو مجبور منت معذرت کرنے لگا مجھے چھوڑ دو میں رسد دیتا ہوں۔
میں نے کہا چھوڑ دینا بس ویسے نہیں ہو سکتا سب چیز بست یہیں ہمیں منگا دے
اُس نے اپنے بھائی بندوں کو آواز دی ارے جلدی آؤ اور مجھے اس بلا سے نجات دلاؤ
اُسی وقت اُس کا بھائی اور بیٹا دوڑے ہوئے آئے اور اُس نے اُن سے کہا کہ سب
چیز سب سامان رسد کی یہیں اٹھا لاؤ وہ جلدی جلدی سب تھیلے اٹھا لائے۔
مندر میں دوکان لگا دی جب میں نے کہا اٹھا لو پتھر اُس کی پشت پر سے اور اُس سے
کہا آٹھ روز کی رسد تو اب لشکر کو لادے باقی پھر دیکھی جائے گی اور سواران سے کہا
کہ گھاس کے گٹھے باندھ لاؤ اور اُس کے سامنے لاکر رکھ دو اور مناسب قیمت اُسے
دیتے جاؤ۔ اور لیتے جاؤ اور جس کے پاس قیمت نہ ہو وہ اپنا نام اور جمعیت کا اور اپنے
جاگیردار کا اُس کی بہی میں لکھواتے جاؤ۔ غرضکہ خوراک کا بندوبست کر کے بنیئے کو رہا
کر دیا گیا۔ اب حال یہ ہے کہ روز ایک عرضی طلب امداد میں محکمہ صدر سپرنٹنڈنٹی بندوبست
پیادگان روانہ ہوتی ہے۔ کیونکہ دروازے شہر کے بند ہیں۔ سوار تو نہ نکل سکتا تھا۔

کھڑکی کی راہ سے پیدل روانہ ہوتا تھا۔ سات روز تک یہی کیفیت رہی اور محکمہ صدر سے کچھ حکم نہ آیا اور نہ مدد آئی۔ آخرالامر ناچار ہو کر میں نے ایک رقعہ بنام حکیم محمد سلیم خاں صاحب داروغہ محکمہ خبر روانہ کیا اور تمام کیفیت از ابتدا تا انتہا لکھ بھیجی کہ آپ بذریعہ پرچہ خبر مہاراجہ صاحب کو اطلاع دیجئے اور جیسا حکم صادر ہو مجھے مطلع کیجئے چنانچہ حامل رقعہ تین بجے رات کے جے پور پہنچا کیونکہ مقام سامود جیپور سے بارہ تیرہ کوس تھا۔ داروغہ خبر نے لفافہ چاک کر کے رقعہ کو پڑھا اور پڑھ کر پالکی میں سوار ہو کر رقعہ کو لئے ہوئے محل کی ڈیوڑھی پر پہنچے اور مہاراجہ صاحب کو اطلاع کرائی کہ کوئی خبر ضروری زبانی حضور سے عرض کرنی ہے۔ فی الفور حکیم صاحب کو طلب کر لیا گیا اور حکیم صاحب گئے میرا رقعہ جو اُن کے نام تھا وہ حرف بحرف پڑھ کر مہاراج صاحب کو سنا دیا۔ بمجرد استماع اس خبر کے مہاراج صاحب نے حکم دیا کہ شفیع میاں جنرل سپرنٹنڈنٹ کو حاضر کرو اور بخشی فوج اور بخشی خانہ جاگیر ہیں دونوں بخشیوں کو حکم پہنچا دو کہ جس قدر سوار اس وقت موجود ہوں سب تیار ہو کر سامانِ جنگ گولی بارود وغیرہ لے کر ڈیوڑھی پر حاضر ہو جائیں۔ مہاراج کا حکم سنتے ہی لے دے ہو گئی جابجا ہرکارے دوڑ گئے رسالے تیار ہو ہو کر آنے لگے کہ اسی اثنا میں سپرنٹنڈنٹ حاضر ہوا فرمایا کیوں جی ہم نے اسی واسطے تم کو سپرنٹنڈنٹ کیا تھا کہ آٹھ روز سے ہمارے نوکر قید ہیں اور تم نے اُس کا کچھ انتظام نہ کیا اور اُن غریبوں کی کچھ خبر گیری نہ کی نہ مدد پہنچی۔ سپرنٹنڈنٹ نے عرض کی حضور مصاحبین کا معاملہ تھا اس لئے مجھے تامل تھا۔ فرمایا مصاحبین ہم سے بڑھ کر نہیں ہیں تعمیل حکم میں ایک سپاہی برابر مصاحب کے ہوتا ہے وہ لوگ ہمارے حکم کے بموجب اپنا فرض منصبی ادا کرنے گئے تھے۔ جاؤ

ہمارے آدمیوں کو چھڑا کر لاؤ اور یہ سن لو کہ اگر میرا ایک آدمی بھی ضائع ہو گیا تو مجھ سے
بُرا کوئی نہ ہوگا۔ تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ سامود کا چبوترہ بنا کر آنا کوئی یہ نہ جانے۔ کہ
سامود کبھی آباد تھی یا نہیں سپرنٹنڈنٹ نے عرض کی بہت بہتر ایسا ہی ہوگا۔ غلام
سوار ہوتا ہے پھر مہاراج صاحب نے فرمایا تم بوڑھے آدمی ہو تم کہاں جاؤ گے اپنے
بیٹے کو سوار کرا دو۔ احمد میاں اُن کے بیٹے بھی حاضر تھے اُنہوں نے آگے بڑھ کر
آداب بجا لایا اور رخصت ہو کر سوار ہوئے اور بارہ بجے رات کے چاندپول دروازہ
کھلوا کر معہ جمعیت سواران روانہ ہوئے ادھر جیسے توپ خانہ اور دو پلٹنوں میں حکم
پہنچ گیا کہ تیار رہیں اور حکم کے پہنچتے ہی روانہ ہو جائیں ادھر راول جی صاحب وہیں
چلینی کے برج میں موجود تھے وہ سن کر آتے ہی قدموں میں گر پڑے اور عرض کی کہ
حضور فوج کو کیوں تکلیف دیتے ہیں میں اُن مجرموں اور ملازموں کو جنہوں نے عدول
حکمی کی ہے۔ دوپہر تک ڈیوڑھی پر حاضر کئے دیتا ہوں۔ ارشاد ہوا کوئی ضرورت نہیں
جس تھانیدار نے مجرم گرفتار کئے ہیں وہی لے کر آئے گا۔ اُس نے اتنی بڑی تعمیل
حکم کی ہے میں اس کی دلشکنی کیونکر روا رکھونگا۔ آپ جا کر اپنے مکان میں بیٹھے کل
سب ظہور میں آجائے گا۔

آج آٹھواں دن ہے صبح کا وقت ہے چار گھڑی دن چڑھا ہے میں ہاتھ مُنہ
دھو کر دروازہ مندر کے آگے کے چبوترہ پر بیٹھا ہوا کلی پی رہا ہوں پانچ سوار میرے
پاس بیٹھے ہیں میں اپنے دل میں یہ منصوبے کر رہا ہوں کہ دیکھئے آج اُس رقعہ کا
کیا جواب آتا ہے کہ دو شخص سامنے کے دروازہ کی کھڑکی میں سے نکل کر آئے
اور میرے پاس آکر سلام علیک کی اور کہا کہ حضرت ہم بھی مسافر ہیں حقہ کی طلب ہے

اگر حقہ عنایت ہو تو دو گھونٹ ہم بھی پی لیں میں نے کہا آؤ بیٹھ جاؤ حقہ پی لو۔
وہ دونو بیٹھ گئے ایک حقہ پینے لگا اور ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ آپ سے کچھ
علیحدہ عرض کرنا ہے میں سمجھا یہ مسافر ہیں کچھ سوال کریں گے میں اُس کا ہاتھ پکڑ کے
علیحدہ لے گیا اور پوچھا کیا اُس نے چپکے سے کہا تمہاری مدد آگئی ہے مگر دروازہ
شہر بند ہے اندر کس طرح آسکتے ہیں میں سمجھا سو پچاس سوار آئے ہوں گے پھر
میں نے پوچھا کس قدر جمعیت تمہارے ساتھ ہے اُس نے بیان کیا پانچہزار سوار
تو اس وقت موجود ہے اور جبیبے کا توپخانہ اور پیدل فوج عقب سے آئے گی
یہ سنتے ہی ایک بار تو میرے ہوش پرواز کر گئے میں سمجھا یہ ہنسی کرتا ہے پھر میں نے
کہا کیا یہ بات سچ ہے یا از راہ ہنسی اُس نے کہا اب آنکھ سے دیکھ لینا مگر ترکیب اندر
آنے کی بتاؤ میں نے کہا دروازہ کے سامنے سے چکر کاٹ کر شمالی دروازہ سے آنا
چاہیئے وہ دروازہ کھلا ہوا ہے اور اس طرح دوڑ سے گھوڑے اٹھا کر آنا چاہیئے
کہ دروازہ بند نہ کرنے پائیں اور میں اُس دروازہ پر جا موجود ہوں گا دروازہ بند ہونے
دوں گا۔ تم جاؤ بسم اللہ کرو اُن دونوں کو تو میں نے اُدھر روانہ کیا اور اپنی جمعیت کو
الگ بلوا کر چپکے سے کہہ دیا کہ کمر بندی کر کے مسلح ہو جاؤ۔ گھوڑے تو کسو نہیں تا کہ
معلوم نہ ہو جائے مگر پیدل مسلح ہو جاؤ۔ دس آدمی تو مندر کی حفاظت پر رہو اور باقی
دروازے تک پھیل جاؤ جس وقت کچھ فساد ہوتا دیکھو دروازے پر دوڑ آؤ۔ میں
ٹہلتا ہوا دروازے پر جاتا ہوں غرضکہ سب جلدی سے تیار ہو گئے اور میں تلوار ہاتھ
میں لے کر اور ایک ہاتھ میں حقہ پیتا ہوا دروازے کی طرف کو چلا۔ خدمتگار کاندھے پر
بندوق وہ میرے عقب میں تھا اور ٹہلتا ہوا دروازے پر پہنچا۔ دروازے پر کوئی

ڈیڑھ سو دو سو آدمی کی جمعیت میں وہ لوگ اُٹھ کھڑے ہوتے مجھے سلام کیا اور کہا۔
آج تھانہ دار جی ادھر کیسے تشریف لائے میں نے جواب دیا بھئی ہم تو تمہارے قیدی
ہیں کہیں جا تو سکتے نہیں شہر میں پھر کر جی بہلاتے ہیں۔ سپاہیان دروازہ نے کہا تھانیدار
جی تم کو کون قید کر سکتا ہے تم پھر بھی راج کے نوکر ہو۔ یہ بھی کوئی دن کا غلبہ ہے
میری اُن کی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ میں نے دیکھا۔ یکایک دروازہ کے سامنے سے
ایک رسالہ کا نائب رسالدار گھوڑا دوڑاتے ہوئے بے تحاشا چلا آتا ہے اور اُس کے
پیچھے ہی سواران کا غٹ ہے اور اُس نے آتے ہی کمر سے تلوار کھینچ کر علم کی اور بولی
قواعد کی بولی اور سب سواروں نے تلواریں کھینچ لیں۔ نگہبان دروازہ سہم کر سکتہ کے
عالم میں ہک دھک رہ گئے اور نائب رسالدار نے ڈانٹ کر دروازہ والوں سے کہا کہ
خبردار اگر اپنی جا سے جنبش کی تو مارے تلواروں کے ٹکڑے اُڑا دیئے جائیں گے۔
جیسے بیٹھے ہو یوں ہی بیٹھے رہو پھر کس کا مقدور تھا کہ چوں کر سکے۔ اور افسر نے
گھوڑا بڑھا کر کہا آؤ مردو آجاؤ۔ بس پھر کیا تھا ایک ریلہ سواروں کا ایسا داخل ہوا کہ
دروازے میں سے بمشکل برآمد ہوئے اور سواروں کے غٹ کے غٹ چلے آتے ہیں
اور سامود میں داخل ہوتے جاتے ہیں اُن کے عقب میں نقارے پر چوٹ دیتا ہوا
نقارچی داخل ہوا اور احمد میاں نے آکر مجھ سے سلام علیک کی اور پیچھے اُن کے
خاص رسالے آٹھوں رسالے نقاروں پر چوٹ دیتے ہوئے داخل ہو گئے اُن کے
عقب میں تین ہزار جاگیرداروں کا غول داخل ہو گیا۔ اب سامود میں تل دھرنے کو
جا نہ رہی۔ تمام شہر سواروں سے بھر گیا۔ اُس وقت احمد میاں نائب سپرنٹنڈنٹ
نے مجھ سے کہا کہ وہ تمہارے قیدی کہاں ہیں لاؤ اُن کو میں نے کہا موجود ہیں مندر

میں قید ہیں۔ اُسی وقت ساہوؤں میں سے ایک گاڑی بیگار میں پکڑی اور قیدیوں کو مندر سے برآمد کر کے چھکڑے پر سوار کیا اور مجھ سے کہا کہ چلو میں نے کہا کہ ایک پانچ منٹ اور توقف کیجئے کہ میں ذرا بھائی جی کے مدار اول جی صاحب سے چل کر دو دو باتیں کر لوں احمد میاں بولے اچھا میں نے کہا ایک امر اور ہے ذرا ان نقارچیوں کو میرے ہمراہ کر دو غرضکہ نقارے گھوڑے ہمراہ لے کر میں کا مدار صاحب کے مکان پر پہنچا تو دروازہ کو تیغا لگا ہوا پایا میں نے اُس وقت بآواز بلند دیا بھائی جی کا نام لے کر آواز دی کہ دروازے کھلوا کر مجھ سے دو دو باتیں کر لو۔ ہر چند میں نے اور میرے ہمراہیوں نے پکارا مگر دروازے میں سے صدائے برخاست کا عالم پایا۔ اُس وقت میں نے بہت بڑی آواز سے پکار کر کہا کہ دیا بھائی جی آپ کہتے تھے کہ بیسوں تھانہ دار چلا دیئے ہیں کسی نے آج تک ٹھکانے کی آن نہیں توڑی ہے اُس کے جواب میں میں نے آپ سے کہا تھا۔ کہ کوئی تھانہ دار نمک حلال نہ آیا ہوگا۔ ورنہ ڈنکے کی چوٹ گرفتار کر کے لے جائیگا تو دیکھو مرد جو بات زبان سے نکالتے ہیں اُسے پورا کر کے دکھا دیتے ہیں۔ لو دیکھ لو۔ میں ڈنکے کی چوٹ ان کو گرفتار کر کے لئے جاتا ہوں اگر ہم سے چھوڑانا چاہتے ہو۔ چھڑا لو۔ یہ کہہ کر میں نے نقارچیوں کو حکم دیا ہاں بھائی اب تم نقارے پر چوب دو یکبارگی دس بارہ نقاروں پر چوب پڑی۔ تمام شہر اور پہاڑ گونج اٹھا اور ہم سب مع قیدیوں کو لے کر شہر سے باہر ہوئے اور شہر سے ایک کوس کے فاصلہ پر ماؤلی جی کا ایک باغ تھا وہاں جا کر فوج کا ڈیرہ کیا احمد میاں نے دیا بھائی سے کہلا بھیجا کہ اگر اپنی خیر منظور ہو تو سرکاری لشکر کے لئے بہت جلد رسد کا سامان اور بنیوں کی دکانیں روانہ کرو۔ میں نے یہ ٹھکانے کا لحاظ کیا ہے کہ فوج کو شہر کے

باہر لے آیا ہوں ورنہ سامو ولٹ جاتی۔ اس پیغام کے تھوڑی دیر بعد سامان رسد وغیرہ سب آموجود ہوا اور لشکر نے دن بھر اپنا کھانا دانہ کیا۔ رات کو وہیں شب باش ہوئے صبح کو سہلنے وقت کوچ ہوا گیارہ بجے دن کے مقام ہرمارہ پر جہاں میرا تھانہ تھا پہنچے۔ وہاں درختوں کے سایہ میں سواروں نے آرام کیا۔ گھوڑوں کو پانی پلوایا۔ اب کچھ چنا چبینا وغیرہ جو کچھ دستیاب ہوا لے کر ناشتہ کیا۔ اودھر میرے آدمیوں نے ناسا دال وغیرہ تیار کی۔ احمد میاں اور گرداور اور تھانہ داران ہمراہی اور افسران سوار نے وہ ناشتہ کیا بعد دو بجے وہاں سے روانہ ہوئے۔ جب ہم اماتی شاہ پر پہنچے۔ تو شہر کی خلقت کا ایک اژدحام پایا۔ جیسے کوئی میلہ ہوتا ہے۔ شہر کے تماشائیوں کا میلہ اماتی شاہ سے لے کر جیب چوک تک وہ اژدحام تھا کہ سواروں کو رستہ نہ ملتا تھا۔ غرضکہ اسی طرح ہم سب اُن قیدیوں کو لئے جیب چوک میں پہنچے تو مہاراج صاحب اور مہاراجہ جسونت سنگھ بہادر فرمانروائے جودھپور اس وقت ہوا محل کے دروازہ کی سیڑھیوں کے برابر کے برج میں بیٹھے ہوئے منتظر تھے اور تمام اہلکار محکمہ جات جیب چوک میں راہ دیکھ رہے تھے میں نے اور احمد میاں نے اور افسروں نے جاکر سلام کیا۔ مہاراجہ صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا تو کہاں جا پھنسا تھا میں نے عرض کی حضور سرکار کی نوکری ہے ایسا اتفاق بھی ہو جاتا ہے۔ فرمایا شاباش نمک حلال ایسے ہی ہوتے ہیں۔ قیدیوں کو سپرد فوجداری کر کے جاؤ مکان پر کمر کھولو تمہاری نوکری ہو گئی میں تعمیل حکم کر کے اور فوجداری سے رسید لے کر گھر کو روانہ ہوا اور جب لوگ اپنے اپنے قیام گاہ کو گئے میں گھر پر پہنچا ہوں تو سب بریت کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ دیکھتے ہی خوش ہو گئے۔ صدقے بیلے اتارے گئے۔ اسی طرح

ایک اور معاملہ ٹھاکر گوبند سنگھ جی کے گاؤں میں واقع ہوا تھا اگر اُس کی تشریح کی جائے تو ایک دفتر ہو جائے۔ خلاصہ یہ کہ ایک سوامی بیراگی کہ سب خلقت کو صاحب نسبت ہونے کا گمان تھا۔ اور مہاراجہ صاحب کو اُس کے ساتھ حسنِ عقیدت بدرجہ غایت تھی اُس کی ایک بھینس چوری ہو گئی تھی اس نے خود جاکر مہاراج سے عرض کی کہ آپ کیا راج کرتے ہیں آپ سے میری ایک بھینس تو منگائی جاتی ہی نہیں۔ مہاراجہ صاحب نے سنتے ہی سپرنٹنڈنٹ پر دس روپیہ روز کی دستک جاری کرنے کا حکم دیا اور ایک روپیہ یومیہ کی دستک جاری ہوئی میں نے جاکر مدعی سے کہا۔ کہ تم نے مجھے کیوں نہ اطلاع کی مہاراج سے کیوں فریاد کی۔ سوامی جی نے مجھ سے کہا کہ بابا تیرے بس کی بات نہیں میری بھینس بہت بڑے ٹھکانے میں گئی ہے تو نہیں لا سکتا مجھے سب حقیقت معلوم ہے میں نے سوامی جی سے کہا کہ اچھا تم مجھے نشاندہی کردو میں گرفتار کرلاؤں گا سوامی جی نے کہا ایک اشتہاری مجرم کا قصور معاف کرادے تو وہ تیرے ساتھ جاکر نشاندہی کرادے۔ میں یہ بات سن کر کونسل میں پہنچا اور حکام سے عرض کی کہ ایک اشتہاری مجرم کا قصور معاف کیا جائے تو مال مجرم پیدا ہو سکتے ہیں چونکہ مہاراج کا حکم بادہ میں صادر ہو چکا اُسی وقت معافی قصور کا پروانہ بایں شرط کہ اگر مال مجرم گرفتار کرادے تو مجرم کا قصور معاف کیا جائے میں وہ پروانہ لے کر پھر سوامی جی کے پاس پہنچا اور سوامی نے بیجنا تھ اشتہاری کو میرے سامنے بلا کر موجود کر دیا۔ وہ مجرم میرے علاقے کا نہیں تھا غرضکہ اُس کے دوسرے دن دس سوار خاص رسالے کے میں ہمراہ لے کر روانہ ہوا بیجنا تھ میرے ہمراہ تھا۔ وہ ایک گاؤں جاگیر ٹھاکر گوبند سنگھ جی میں مجھے لے کر پہنچا وہ

گاؤں جے پور سے چودہ کوس تھا۔ شام کو ہم وہاں جا کر پہنچے تعلقدار دبہ سے
سربراہ کے واسطے کہلا بھیجا گیا کہ ہم واسطے کارِ سرکار کے آئے ہیں تم سربراہ بھیجو د
اور خود آؤ جو کچھ سرکار سے کام ہے اُس کی تعمیل کرو۔ اس کے جواب میں تعلقدار نے
کہلا بھیجا کہ سربراہ دینے کا ہماری سرکار سے حکم نہیں ہے اور مجھے اِس وقت
فرصت نہیں صبح کو ملوں گا۔ پھر میں نے ایک سوار بھیجکر کہلا بھیجا کہ سربراہ نہ دو
مگر حکم تو سن جاؤ۔ کہا صبح کو آؤں گا میں نے مخبر سے کہا کہ پولیس کی نشاندہی کر
بھینس تو گرفتار کر لی جائے بعد میں دیکھا جائے گا وہ اُٹھ کر گیا اور تھوڑی دیر میں
آ کر جواب دیا کہ میں جس مکان میں بھینس بندھی ہوئی دیکھ گیا تھا۔ اب وہاں نہیں ہے
اور میں بھینس کی پونچھ پر ہاتھ پھیر کر گیا تھا۔ اور تعلقہ دار جی کو جتا کر گیا تھا کہ یہ بھینس
جانے نہ پائے۔ اور یہ مجرم اور زمینداروں کو بھی کہہ گیا تھا بھینس ابھی ابھی انہوں نے
یہاں سے چلا دی ہے اور اسی واسطے تعلقدار نہ آیا۔ غرضکہ اس شب کو تو گھوڑوں کا
دانہ گھاس اور دیہات میں سے منگوا کر دیا مگر آدمی سب بھوکے پیاسے رہے صبح
کو تعلقدار صاحب آئے تو دیکھتا کیا ہوں کہ بڑے موٹے تازے لحیم شحیم آدمی ہیں۔
خیر سلام علیک ہو کر آ کے بیٹھے میں نے ان سے کہا کہ تعلقدار صاحب خاص مہاراجہ
صاحب کا تو حکم اور میں نے اُس کی تعمیل کے واسطے آپ کو بلوایا اور آپ نے عذر
کیا اس عدول حکمی کا تو مجھے جواب دیجئے پھر اور کچھ کہوں گا جواب دیا کہ یہ نہ معلوم
تھا کہ خاص حکم حضور سے ہے۔ پھر میں نے کہا کہ وہ چوری کی بھینس اور کالی ناتھ
سارق میرے حوالہ کرو تعلقدار۔ کیسی بھینس۔ کون کالی ناتھ۔ میں۔ اینجانب
سدر سے ولبے سوامی کی بھینس اور کالی ناتھ چور جس کو تم نے گاؤں میں آباد کیا اور

جس سے چوریاں کراتے ہو اور مال حرام کا کھا کر موٹے ہوئے ہو۔ تعلقدار کالیا کوئی ہمارے گاؤں میں نہیں آیا نہ بھینس آئی میں نے مخبر سے کہا کہ جواب دے۔ بیچنا تھ نے کہا کہ تعلقدار جی میں خود بھینس گاؤں میں دیکھ کر گیا تھا۔ اور آپ سے کہہ گیا تھا کہ بھینس جانے نہ پائے یہ چوری کی ہے اور کالیا بھی موجود تھا دونوں کیواسطے آپ سے یہ کہا تھا۔ اور تاکید کر گیا تھا کہ خبردار دونو جانے نہ پائیں۔

تعلقدار۔ جھوٹا ہے الزام لگاتا ہے۔ پھر میں نے تعلقدار سے کہا کہ تعلقدار صاحب میں آپ سے دوستانہ فہمائش کرتا ہوں کہ آپ اپنی خیر چاہیں تو بھینس منگادیں۔ ورنہ آپ تو کیا ہیں ٹھاکر صاحب کو بری بن جائے گی۔ یہ خاص حکم ہے۔

تعلقدار :۔ اجی حضرت بیسیوں افسر گرائی دیکھ لیئے ہیں۔ ٹھاکر صاحب پر بری بنوانے والا کون ہے۔ اینجانب۔ افسر گرائی کو بھی نہیں دیکھا ہو گا۔ ورنہ اب تک کبھی کی بیڑیاں پڑ گئی ہوتیں۔

تعلقدار:۔ اچھا تو اب آپ میرے بیڑیاں ڈلوا دیجئے۔

اینجانب:۔ انشاءاللہ اگر میں افسر گرائی ہوں تو کل اتنے وقت آپ کو زیور پہنا دوں گا۔ یہ کہہ کر میں نے گھوڑوں پر چار جامے بندھوائے اور وہاں سے روانہ ہوا۔ چار بجے جے پور داخل ہوا۔ اور سیدھا کونسل میں پہنچا۔ اور مخبر اور دو سواران ہمراہی کو اپنے ساتھ لیتا گیا اور جا کر حکام کو سلام کیا۔ نواب فیض علیخان صاحب نے پوچھا بھینس لائے میں نے ساری کیفیت بیان کی۔ سواران سے دریافت کیا۔ انہوں نے بھی میرے بیان کی تائید کی۔ بیچنا تھ مخبر کو بلوا کر پوچھا

کہ تُو نے بچشم خود بھینس کو دیکھا تھا۔ بیجناتھ مخبر دیکھتا کیسا خود بھینس کے پیچھے پر ہاتھ پھیر کر تعلقدار اور زمینداران کے سپرد کرکے آیا تھا۔ اُس کا اظہار لیا گیا اُس نے اظہار میں بھی یہی بیان کیا۔ نواب صاحب کونسل سے اُٹھ کر مہاراج صاحب کے پاس گئے اور گھڑی بھر کے بعد آکر حکم سنایا۔ کہ چہار و بیست جائیں اور ٹھاکر صاحب کے دھوئیں کو گھیر لیں۔ اور کہہ دیں کہ جب تک بھینس اور کالی ناتھ مجرم جے پور نہ آئینگا آپ یہاں سے کہیں نہ جا سکینگے۔ حکم پہنچتے ہی ٹھاکر صاحب نے سوار اور شتر سوار دوڑانے شروع کئے کہ دن نکلتے نکلتے بھینس اور چور تعلقدار اور زمیندار مسل پٹواری سب حاضر ہو جائیں۔ کونسل سے تو یہ کارروائی ہوئی میں اپنے گھر میں آکر تھکا تھکایا کھانا کھا کر سو رہا۔ اور دوسرے روز صبح کو چار گھڑی دن چڑھے تک سوتا رہا ہنوز نیند میں تھا کہ ہرکارہ محکمہ گرائی کا پہنچا کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب بلاتے ہیں خیر منہ ہاتھ دھوئے پگڑی باندھی تلوار اور چادر بغل میں دبا کر گرائی میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میر احمد علی خاں صاحب سپرنٹنڈنٹ کچہری کر رہے ہیں اور وہ تعلقدار صاحب اور پٹیل پٹواری سب موجود ہیں میں نے جاکر سپرنٹنڈنٹ صاحب کو سلام کیا سپرنٹنڈنٹ صاحب نے پوچھا تم سے اور تعلقدار صاحب سے کیا گفتگو ہوئی تھی۔ میں نے سب بیان کی۔

سپرنٹنڈنٹ۔ تم نے کیا کہا تھا۔

اینجانب۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ اگر میں افسر گرائی ہوں تو کل آپ کو زیور پہنا دونگا

سپرنٹنڈنٹ صاحب:۔ اچھا تو یہ زیور موجود ہے۔ اس میں سے جو تعلقدار صاحب کے شان کے موافق ہو وہ اُن کو پہنا دو۔ تم اپنا وعدہ پورا کرو۔ اور بیڑیاں میرے آگے

ڈلوادیں میں نے اُس میں سے ایک بھاری ڈنڈے دار بیڑی لے کر تعلقدار صاحب کی نذر گزرانی آہنگر نے فوراً پاؤں ڈال کر حلقہ میں کیل مستحکم ٹھونک دی مالیقی سب زمینداروں کے بھی بیڑیاں پڑگئیں۔ کچہری میں اظہارات ہونے لگے آخر تعلقدار صاحب قبولے کہ وہ بھینس ٹھاکر رنجیت سنگھ جی اجرول کے گاؤں میں ہم نے چلادی تھی۔ اور اب بھی وہیں ہے۔ یہ بات سُنکر میں کونسل کو پھر دوڑا گیا اور تمام کیفیت بیان کی کہ ابتک بھینس ٹھاکر رنجیت سنگھ جی حاکم کونسل کے گاؤں میں موجود ہے۔ اور ٹھاکر صاحب خود سر اجلاس کونسل میں موجود تھے نواب فیض علیخاں صاحب بہادر نے ٹھاکر صاحب سے کہا۔ واہ واہ ٹھاکر صاحب آپ کونسل کے سردار ہو کر چوروں کی پناہ دہی کرتے ہیں۔ ٹھاکر رنجیت سنگھ جی نے مجھ سے کہا کہ اچھا بھایا اگر میرے گاؤں میں بھینس ہوگی تو کل تیرے گھر پہنچ جانے کی خاطر جمع کر یہ سُنکر میں حکام کو سلام کرکے گھر کو آیا دوسرے دن دوپہر کو پھر مجھے گرائی میں بُلوایا گیا۔ جب میں گرائی میں پہنچا تو سپرنٹنڈنٹ صاحب نے کہا کہ لو بھینس سنبھال لو اور ٹھاکر رنجیت سنگھ کے آدمیوں کو رسید لکھدو میں نے رسید لکھ کر بھینس گرائی میں بھجوادی اور کونسل میں جاکر نواب صاحب سے عرض کی کہ وہ گاؤ میش مہاراج کے اقبال سے میرے پاس آگئی ہے۔ اب سرکار کو اختیار ہے جیسے چاہے حوالہ کردیں۔ نواب صاحب میرا ہاتھ پکڑ کر مہاراجہ صاحب کے پاس لے گئے میں نے جاکر سلام کیا پوچھا بھینس لے آئے میں نے ہاتھ باندھ کر عرض کی حضور کے اقبال سے موجود ہے۔ مہاراجہ صاحب نے ہنسکر فرمایا کہ نواب صاحب میں نے پہلے آپ سے کہہ دیا تھا۔ کہ وہ بھینس پیدا کر لائے گا۔ بعد حکم ہوا کہ اُس سوامی کے

حوالہ کر کے راضی نامہ لے لو۔ سوامی جی کو بُلا کر کہا کہ لو تم بھینس لو اور ٹھاکر گوبند سنگھ جی کے نام راضی نامہ کر دو۔ سوامی نے راضی نامہ سے انکار کیا۔ اب ٹھاکر صاحب کے وکیل منت کرتے ہیں اور روپیہ دیتے ہیں۔ مگر سوامی کسی طرح راضی نامہ نہیں دیتا۔ اور نہ بھینس لیتا ہے ٹھاکر صاحب نہایت تنگ ہیں غرضکہ میں نے پھر سوامی سے جا کر کہا بھینس تمہاری آگئی۔ اب تم راضی نامہ کیوں نہیں دیتے اُس نے کہا میری بھینس کے سینگ اور دم کاٹ ڈالی ہے۔ بچہ مار ڈالا ہے۔ میں نے کہا کہ اُس کا تاوان اسی روپیہ دلاتا ہوں۔

سوامی۔ راضی نامہ نہ دینے کا ایک سبب ہے مجھے کچھ بھینس کی پروا نہیں ایک بھینس نہیں دس بھینس میری چوری جائیں تو میں کبھی فریاد نہ کرتا مگر میرے پاس تمام زمیندارہ کی روز فریاد آتی ہے کسی کے بیل چوری جاتے ہیں۔ کسی کا اونٹ کسی کی بھینس کسی کا غلہ۔ جب میں نے تنگ آکر نالش کی ہے۔ جب تک زمیندار کی چوری کا بند و بست نہ ہوگا میں راضی نامہ ہرگز نہ دونگا۔ یہ کالیا مینہ جس نے میری بھینس چورائی ہے یہی چوری کرتا پھرتا ہے۔ اور کھور کے قصبہ کے اِرد گرد کے دیہات میں چوری کرتا ہے۔ اور گاؤں والوں کو تنگ کرتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ قصبہ کھور کے چوکیدارہ میں وہ بھی شامل ہے اِس کے بھائی بندوں نے اُسے وراثت سے خارج کر کے نکال دیا۔ اُس کی جو جائداد اور آمدنی۔ غلہ وغیرہ ہل پیچھے مقرر تھی وہ اوروں نے چھین لی۔ اب وہ اُنکے چوکیدارہ سے جو دیہات ہیں وہ اُن کو لوٹتا ہے اور بڑے بڑے حمایتی دیہات میں رکھتا ہے کبھی علاقہ الور میں بیٹھکر چوری کرتا ہے یا تو سرکار سے گرفتار کرے یا اُس کو مٹھا کر اس کا حصہ دلائے کہ وہ چوری نہ کرے اور عینت

کو امن ملے یہ حقیقت میں نے سن کر حکام کو گوشگذار کی۔ کونسل سے میرے لئے حکم
ہوا کہ بذات خود ان مواضعات میں جاکر تحقیقات کرو اور جو کچھ اس کی جائداد موروثی
ہو واگذاشت کرا دو۔ اور اُسے بلاکر بہ اخذِ ضمانت آباد کردو۔ تاکہ وہ فتنہ فرو ہو اور رعیت
کو آسائش ملے غرضکہ میں نے اُسکے رہنے کا حکم حاصل کرکے دیہات میں اشتہارات
لگوا دیئے کہ کالیا مینہ یا تو آٹھ روز کے اندر آکر آباد ہو جائے۔ تو اُسکی جائداد موروثی
وغیرہ اُسے دلا دی جائے گی۔ آجتک کے جرائم سرکار سے معاف کرا دئے جائیں گے
ورنہ جائداد اُس کی دوام کو ضبط کرکے اُس کی جا دوسرا چوکیدار مقرر کیا جائیگا اور
بعد اُسکے عذرات قابلِ سماعت نہ ہوں گے۔ اس اشتہار کے جاری ہونے کے
تیسرے روز وقتِ شام اُس نے تھانہ میں آکر میرے قدم پکڑ لئے میں نے اُسکا
اطمینان کیا کہ تو تھانے میں رہو میں دورہ پر چلکر تیرا سب بندوبست کرا دوں گا۔
بعد قصبہ بجنور میں جاکر سب دیہات کے زمینداروں کو بلوا کر جو اُس کا حصہ تھا وہ
جاری کرا دیا۔ اور اُس کی منجانب آباد کرا دیا۔ ٹھاکر صاحب کا اضافہ کرا دیا۔ حکام
اس کارروائی سے نہایت خوشنود ہوئے۔

بعد قصبہ نوالی علاقہ نظامت بالی پورہ میں بھی بدنظمی ہو رہی تھی۔ چوکیدار تحصیلدار
کی جبر و تعدی سے برخاست ہو گئے تھے رعیت کو ستانے تھے نوالی کے شرفا
میری تبدیلی کی درخواست کونسل سے کراکے مجھے بدلوا کر نوالی لے گئے۔ وہاں مدت
تک میں بہت حیران و پریشان رہا۔ تمام رات پچاس پچاس آدمیوں کی جمعیت لے کر
رات بھر گشت کرتا تھا۔ چور ہاتھ نہ آتے تھے میں ایک محلہ میں جاتا وہ دوسرے میں
درآمد ہوتے۔ آخر مجبور ہو کر کونسل سے آبادی چوکیداران کی درخواست کی منظور ہو کر

حکم آبادی چوکیداران صادر ہوا میں نے اشتہار لگائے شام کو سب کے سب بچے بوڑھے، جوان، عورتیں قریب تیس چالیس کے میر ندموں میں آگرے میں نے آباد کروایا۔ پھر اس روز سے قصبہ میں چوری نہ ہوئی۔ مواضعات کے دو چار دیہات سرکش تھے اُن کو ٹھونک پیٹ کے درست کر دیا۔ بندوبست ہو گیا میں جس علاقہ میں رہتا تھا وہاں واردات بہت کم ہوتی تھی۔ اور اگر ہو بھی جاتی تھی تو جب تک اصلی مجرم دستیاب ہوتے چوکیداروں کا پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ غرضکہ بعد جب مہاراجہ صاحب سارنگانیوالے نے پوچھا تھانہ دار کہاں ہے رجپوت نے عرض کی تولی بدل گیا ہے اُسی وقت سوار بھیجکر مجھے بلا بھیجا۔

ایسا ہی جب میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سماور نی تھا تو کونسل سے ایک سانڈنی سوار کیفیت لیکر میرے پاس پہنچا کہ ایک جاگیردار کے قصبہ میں باہم دونوں ٹھکرانیوں میں تنازع واقع ہوا ہے۔ فوج ایک ٹھکرانی کے جانب ہے اور کامداران ریاست دوسری ٹھکرانی کی طرف ہیں آٹھ سات ہزار آدمی کا بلوہ ہے مبادا باہم فساد چلے اور خونریزی ہو۔ اور ٹھکانا برباد ہو جائے فی الفور موقع وارادات پر پہنچکر بندوبست کر دو دنگہ و فساد کا ذمہ اپنا سمجھو اور یہی حکم ناظم میر احمد علی صاحب کے نام پہنچا۔ غرضکہ ہم دونو آدمی قریب چار سو سوار و پیدل کی جمعیت لے موقعہ پر پہنچے تو یہ دیکھا کہ دونوں جانب فوج کی مورچہ بندی ہے اور چھ سات ہزار آدمی کا بلوہ طرفین سے ہے اور توپیں بندھی ہوئیں گراب کی تیار ہیں۔ فقط بتی دینے کی دیر ہے۔ اور شہر میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ رعیت تمام معہ اہل و عیال و مال اپنی دکان سے علاقہ بیکانیر کو بھاگی چلی جاتی ہے سیٹھ، ساہوکار، مہاجن، بنیے، بقال گاڑیاں بھر بھر کر اپنا سامان

خانگی شہر سے لئے جاتے ہیں۔ اہلِ شہر تمام اپنے دیگر علاقہ جات میں لئے جاتے ہیں۔ غرضکہ غدر کا نقشہ دوبارہ نظر آگیا میں نے اُس وقت گھوڑا بڑھا کے بیچ میں دونوں بلوائیوں کے جا کر کھڑا ہو کر بہ آوازِ بلند سُنایا کہ اب ہم لوگ انتظام کے واسطے آگئے ہیں اب سے جس کی جانب سے درازی ہو گی۔ وہ راج کا قصور وار سمجھا جائیگا اور ہم لوگ دوسری جانب ہو کر اُس کی پوری پوری خبر لیں گے اور پھر مقابلہ راج سے آپڑے گا۔ جو تم کو داد فریاد کرنی ہو ہم سے آکر عرض کرو ہم بندوبست کریں گے اور ہٹا دیجئے مورچے۔ غرضیکہ میں نے اُن کے مورچے جو قریب بندھے ہوئے تھے۔ وہ فاصلے سے کرا دیئے۔ شب کو سب افسر فوج کے اور بڑی ٹھکرانی کا وکیل میرے پاس آیا اور ٹھکرانی کی اوڑھنی لے کر آیا اور مجھے ٹھکرانی صاحبہ کی جانب سے پیغام دیا کہ ٹھکرانی صاحبہ نے سلام کہا ہے۔ اور یہ کہا ہے کہ ڈپٹی جی تم میرے دینی بھائی ہو اور میں بیوہ ہوں میں نے تم کو اپنا بھائی کہا ہے اس اوڑھنی کی تم کو شرم چاہیئے۔ اب یہ ٹھکانا تم رکھو گے یا خدا رکھے گا۔ ٹھاکر صاحب کو مرے ہوئے دو برس کا عرصہ ہوا۔ یہ پانچ برس کا بچہ وہ چھوڑ گئے ہیں۔ یہ چھوٹی ٹھکرانی سے ہے اس کے پیدا ہوتے ہی میری گود میں ڈال دیا تھا۔ اب یہ کامدار چھوٹی ٹھکرانی سے مل گئے ہیں۔ اور رعیت اور فوج کو تنگ کر رکھا ہے۔ دس مہینے فوج کے چڑھ گئے ہیں۔ تنخواہ نہیں پائی جس کو کوئی زمین ٹھاکر دے مرا تھا وہ سب ضبط کر لی ہے جاگیر کو لوٹتے اس کو کھاتے ہیں آخر فوج نے لاچار ہو کر کمر بندی کر کے مقابلہ آرائی پر کمر باندھی کامدار و نے اور ٹھکانوں میں سے جمعیت فراہم کر کے وہ بھی مرنے مارنے کے لئے تیار ہو گئے اور ان کا ارادہ ہے کہ دور کر کے اُن کی توپیں چھین لیں اب تم آگئے ہو اب اسکا بندوبست

تمہارے اختیار ہے اور یہ تین سو روپیہ دعوت کے بھیجے ہیں اور یہ بھی کہا ہے۔ کہ جب تک ڈیرہ رہے گا تمہاری فوج کا خرچ میں دونگی۔

جواب اینجانب:- ٹھکرانی صاحبہ سے میرا سلام کہنا اور یہ کہنا کہ جب تم نے اپنے مُنہ سے مجھے بھائی کہا ہے تو ہم لوگوں میں یہ دستور ہے کہ بہن بیٹی بھانجی بھتیجی کا پیسہ سور مردار سمجھتے ہیں۔ یہ دعوت آپ رہنے دیجیے۔ خدا چاہے گا۔ تو ٹھکانے کا بال بھی بیکا نہ ہوگا اور برقرار رہے گا اور دشمن سب رد ہو جائیں گے اور آپ کا حکم حاصل بنا رہیگا مگر میں جو کہوں گا میرے حکم کے بموجب عملدرآمد رکھنا چاہیئے۔ میری جانب کی کارروائی تو یہ ہوئی۔ اب ناظم کے یہاں کی کارروائی کا حال سُنئے کہ کامدار وہاں پہنچے اور اہلکاران ریاست سے سازباز کرکے یہ چاہا کہ افسرانِ فوج کو ناظم صاحب گرفتار کرکے جھنجھنو کو لے جائیں تو میدان صاف ہو جائے۔ سپاہی بیچارے کیا کر سکیں گے پھر ٹھکانے پر قبض و بست برابر ہماری مداخلت ہو جائے گی حسب دلخواہ کارروائی کریں گے کوئی مانع اور مزاحم نہ ہوگا۔ ٹھکرانی بیچاری پردہ نشین ہے وہ کیا کر سکتی ہے۔ بطور نظربند کے بیدخل پڑی رہے گی۔

یہ خبر مجھ کو رات کے بارہ بجے معلوم ہوئی کہ ناظم صاحب کے یہاں یہ منصوبہ ہوا ہے کہ کامداران کی امداد کرکے افسرانِ فوج کو گرفتار کرا دیا جائے ایک رسالدار فوج نے مجھ سے آکر یہ ماجرا بیان کیا اور نیز یہ اظہار کیا کہ ہم لوگوں کا گرفتار ہو جانا کچھ سہل نہیں ہے آخر ہم سپاہی ہیں اور مرنے مارنے پر آمادہ ہیں۔ جب ناظم صاحب ہماری گرفتاری کا ارادہ کریں گے تو اس وقت ہم لوگ کچھ لحاظ حکومت نہ کریں گے کامداران کے شامل ناظم صاحب کو بھی سمجھ کر مقابلہ آرائی میں دریغ نہ کریں گے اُس

وقت حاکم محکوم سب برابر ہیں اگر سرکار جے پور کا مقابلہ ہو تو ہم آپ کو جتائے
دیتے ہیں جو ہمارے سامنے آئے گا ہم گراب ماریں گے خواہ ناظم صاحب ہوں۔
خواہ آپ ہوں۔ ہم کسی کی رُو رعایت نہ کریں گے۔ یہ سُنکر میں نے اُسے تسلّی دی کہ نہیں
ایسا امر ہرگز نہ ہونے پائے گا۔ تم خاطر جمع رکھو میں ایسی تدبیر کروں گا کہ یہاں تک نوبت
ہی نہ پہنچے گی اور رفع شر ہو جائے گا۔ یہ کہہ سُن کر وہ تو رخصت ہوا میں اپنے بستر
پر لیٹ کر سو رہا صبح کو جب بیدار ہوا۔ ہاتھ مُنہ دھو کر بیٹھا ہوا حقّہ پیتا ہوں اور اس
معاملہ میں سوچ رہا ہوں کہ یکایک ایک ہرکارہ گھبرایا ہوا آیا اور اُس نے بیان کیا کہ
ناظم صاحب نے حکم دیا ہے کہ جلدی تیار ہو کر معہ جمعیت آجاؤ۔ وہاں ہتیار چل گیا۔
جلدی چلو میں نے اپنی جمعیت کو آواز دی تیار ہو جاؤ اور آپ ہتیار لگائے۔ بندوق
بھری بارود گولی کا توڑدان کمر سے لگایا اور مکان میں سے نکل کر چلا۔ میری جمعیت میرے
ہمراہ ہوئی۔ جب میں ناظم صاحب کے مکان پر پہنچا تو میں نے دیکھا ناظم صاحب بندوق
میں گولی ڈال رہے ہیں۔ مگر اضطراب کے باعث دست و پا میں رعشہ ہے۔ مجھے
دیکھتے ہی بولے۔ وہاں ہتیار چل گیا کشت و خون ہو رہا ہے چلو اور جلدی چلو میں
نے کہا کہ آپ تشریف رکھیں مجھے جانے دیجئے آپ کا چلنا مناسب نہیں ہے۔
آپ کی صورت دیکھتے ہی توپوں پر بتّی پڑ جائے گی اگر تلوار نہ چلی ہو گی مجھے ساری
کیفیت معلوم ہے۔ آپ یہیں ٹھیریں میں اپنی جمعیّت لے جاتا ہوں جب مجھ سے
کسی طرح کی جنگ و جدل واقع ہو تو آپ میری امداد کو آجائیے گا۔ یہ کہہ کر میں معرکہ
میں آیا تو یہی کیفیت دیکھی کہ بالکل آمادگی دونوں جانب سے لڑائی کی پائی گئی اور
دونو گروہ بہت قریب ہو گئے تھے شاید سو قدم کا فاصلہ ہو گا اور عین بازار میں معرکہ

کارزار ہے۔ فوج والوں کی پشت پر توپ خانہ کی بارک ہے اور آگے توپیں بڑھا رکھی
ہیں۔ اور توپوں میں ٹکوں کا چھرا بھرا ہوا ہے توڑا سلگتا ہے توپوں کے پیچھے فوج
جمی کھڑی ہے اور نکامداران کی طرف کی جمعیت بازار کی دو رویہ دکانوں میں بندوقیں
بھرے کھڑی ہے میں ان دونوں لشکروں کے پہلو میں سے پہنچا جس وقت فوجیوں
نے مجھے آتے ہوئے دیکھا پکار کر کہا کہ ڈپٹی جی خبردار آگے نہ آنا ورنہ ہم توپ کرتی
دکھاتے ہیں میں نے پکار کر جواب دیا کہ اچھا میں اپنی جمعیت کو نہیں لاتا تنہا آتا ہوں
تم سے دو باتیں کرنی ہیں۔ یہ کہہ کر میں آگے چلنے لگا تو میری جمعیت والے میرے
ساتھ آنے لگے اور کہا کہ اس وقت ہم تم کو اکیلا نہیں جانے دیں گے اگر تم وہاں
مارے گئے تو راج ہم کو توپ سے اڑا دے گا کہ تم اپنے ڈپٹی کو قتل کرا آئے میں
نے انہیں سمجھایا کہ نہیں مجھے کوئی نہیں مارے گا میں دو باتیں ان سے کر کے آتا
ہوں۔ اور میں نے بیچ میں کھڑے ہو کر سنایا کہ دیکھو تم دونوں کے بیچ میں میری جمعیت
حائل ہے جس کی طرف سے پہل ہو گی گویا مجھ سے مقابلہ ہو گا اور اپنی جمعیت کو
بیچ میں بلا کر کھڑا کر دیا۔ اور آپ تنہا افسران فوج کے پاس پہنچا اور ان کو سمجھایا کہ دیکھو
تم لوگ سپاہی ہو اور سپاہ کا قرینہ جاہل ہوتا ہے ایسا کام نہ کرنا کہ جانیں بھی تلف ہوں
اور لاشیں بھی کتے کوے کھائیں اور بال بچے تباہ ہو جائیں۔ عورتوں کی آبرو ریزی
ہو ایسا کام کرو نہ سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے۔ میرے نزدیک یہ بات مناسب ہے
کہ تم لوگ سب جے پور کو صدر میں چلے جاؤ وہاں جا کر اپنا استغاثہ پیش کرو افسران
فوج ہم تو اس بات پر راضی ہیں مگر کامدار بھی مانیں وہ ہم کو گرفتار کیا چاہتے ہیں میں
نے کہا کہ میں اس بات کا ذمہ دار ہوں پہلے ان کا چالان جے پور کو کروں گا جب تم کو

بصیحوں کا وہ اس بات پر راضی ہو گئے کہ اچھا کامداران کو بھی ہمارے ساتھ جے پور کو روانہ کردو۔ یہ کہہ کر میں کامداران کی طرف کو گیا اور وہاں جاکر اُن کو دھمکایا اور کہا کہ اپنی خیر چاہتے ہو تو تم دونو اسی وقت جے پور کو روانہ ہو جاؤ۔ ورنہ پہلے مجھ سے سمجھ لو پھر آپس میں لڑنا جھگڑنا جے پور ہی اب تو لڑو جھگڑو ٹھکانے کو کیوں برباد کرتے ہو اور ان بلوائیوں کو پیچھے ہٹادو۔ اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ ہٹادو ان کو پیچھے کو دو کانیں خالی کراؤ۔ نیچے جاکر انہیں کھڑا کر دو اور کامدار سے کہا کہ چلو میرے ہمراہ ناظم صاحب کے پاس ان دونوں کو ہمراہ لے کر ناظم صاحب کے پاس آکر کہا کہ بس مصلحت وقت اس میں ہے کہ آپ ان کو اسی وقت اپنے سوار ساتھ کر کے جے پور کو روانہ کریں اور میں اپنے سواروں کے ساتھ افسران فوج کو روانہ کرتا ہوں۔ فساد برخاست ہوتا ہے اور دونوں طرف کے مورچے ہٹوائے دیتا ہوں۔ ناظم صاحب نے بھی چار و ناچار اس تجویز کو منظور کیا اور کامداران سے کہا کہ جاؤ جے پور ہی جاکر آپس میں سمجھ لو اور تیار ہو جاؤ چلنے کو۔ میں نے جاکر توپیں کھلوا کر توپ خانہ میں رکھوائیں اور میرے آدمیوں نے بلوائیوں کو منتشر کر دیا اور دونوں ٹھکرانیوں سے کہلا بھیجا کہ اب اپنے اپنے وکیل جے پور کو بھیج دو اور اسی روز کامدار اور افسران فوج ہر دو متخاصمین کو جے پور کو چالان کر دیا گیا۔ غرضکہ نوکری جے پور میں ایسے ایسے کارنمایاں اکثر ظہور میں آئے ہیں۔

ایک بار زمانہ تھانہ داری سانگانیر میں شفیع میاں جنرل سپرنٹنڈنٹ نے مجھے تھانہ سے معطل کر کے میری جا پر قائم مقام کر کے اپنے ایک عزیز کو بھیج دیا۔ مجھے اطمینان تھا کہ مجھے معطل کون کر سکتا ہے۔ بے حکم حضور کے میں بھی خاموشی کے ساتھ

ہنستا بولتا دو ماہ تک گھر بیٹھا رہا۔ آخر ایک قصیدہ میں حال معطلی درج کرکے مہاراجہ صاحب کے پاس پہنچا مہاراجہ صاحب موضع کھاتی پورہ کی شکارگاہ میں تشریف رکھتے تھے اور اتفاق سے نواب احمد علی خاں صاحب بھی اور نائب عبیداللہ خاں صاحب اُن کے بھتیجے بھی کہ اُن دنوں میں جے پور میں موجود تھے وہ دونو صاحب بھی وہیں آموجود ہوئے۔ شام کو میں نے جاکر مہاراجہ صاحب کو سلام کیا۔ فرمایا آج نظامانہ دار جی تم کہاں آ گئے۔ میں نے عرض کی کہ بہت دن سے حضور کو سلام نہیں ہوا تھا اور کچھ لکھ کر بھی لایا ہوں مُسکرا کر فرمایا بہت اچھا چراغ جل جائیں تو بیٹھ کر سُن لوں۔ جب چراغ روشن ہو گئے تو کھاتی پورہ کے بنگلہ میں حضور صاحب بیٹھے برابر نواب احمد علیخاں صاحب بیٹھے اور سامنے کے رُخ کو چراغدان روشن تھا اُس کے ایک پہلو میں میں بیٹھا اور دوسرے پہلو میں نائب عبیداللہ خاں صاحب اور اُن کے برابر بابو کانتی چندر بہادر تھے اور میری بغل میں منشی نولکشور مالک مطبع اودھ اخبار اور مہاراجہ کی پشت پر مہاراج پرتاپ سنگھ جی جودھپور والے بیٹھے ہوئے اور ٹھاکر فتح سنگھ جی اُن سے باتیں کر رہے ہیں۔ کہ مہاراجہ صاحب نے حکم دیا ہاں ہوئے اور میں نے قصیدہ شروع کیا اور سب تعریف کر رہے تھے منشی نولکشور صاحب بولے واہ کیا قصیدہ لکھا ہے۔ بالکل فردوسی کی زبان معلوم ہوتی ہے مہاراجہ صاحب کی خوش اقبالی ہے۔ کہ اہلِ کمال آکر موجود ہو جاتے ہیں اس کلمہ پر مہاراجہ صاحب بہت خوش ہوئے۔ مگر جب وہ معطلی کے مضمون کے شعر آئے تو نواب احمد علی خاں صاحب سے پوچھا یہ کیا کہتے ہیں۔ اُنھوں نے کہا دو ماہ سے معطل ہو کر گھر بیٹھے ہوئے ہیں فرمانے لگے۔ میری بے اجازت کس نے معطل کیا۔ بابو کانتی چندر سے مخاطب ہو کر میں لکھوا چکا ہوں

کہ میری بغیر اجازت معطلی۔ تبدیلی۔ برخاستگی نہ ہو۔

بابو صاحب۔ ہاں میں نے یہ حکم کونسل میں لکھوایا ہے زبانی حضور کے۔

مہاراجہ صاحب۔ شفیع میاں بڑے بے شعور آدمی ہیں ان کی معطلی کی تنخواہ

ان کی تنخواہ سے دلا دو کہ آیندہ انہیں خیال رہے۔

اور بیس روپیہ ماہواران کے روزینہ داران میں کر دو اور اگر یہ نوکری بسر کارسرشتہ

میں انجام دیں تو کارگذاری کی تنخواہ علیحدہ ملے اور یہ روزینہ علیحدہ میں نے اٹھ کر سلام

کیا وہاں سے رخصت ہو کر گھر کو آیا دہ نواب احمد علی خاں کے مکان پر آئے اور مجھے

بلوایا اور کہا کہ اب تھانے پر جاؤ میں نے کہا مجھے معاف کیجئے۔ مہاراجہ صاحب نے

میرا روزینہ کر دیا۔ اب مجھے کار کردہ کی کچھ حاجت نہیں میں نہیں جاتا۔ اب میں انکار

کرتا ہوں اور وہ درپے ہوتے ہیں اور نواب صاحب سے کہا کہ ایک بار ان کو آپ سیلگڈھ نیز

بھجوا دیں۔ پھر یہ چاہیں استعفا داخل کریں میں بری ہو جاؤں خیر سمجھا کر مجھے تھانے پر

بھیجدیا۔ بعد ایک سال کے حضور صاحب نے مجھے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کر کے ٹوڑاوائی

کو بھیج دیا اور نیز یہ فرمایا کہ مجھے تیری چاکری کا حال خوب معلوم ہے انشاء اللہ تیری

ترقی بہت کچھ ہو گی۔ میری بدنصیبی سے چھ ماہ کے بعد اُن کا انتقال ہو گیا اور میں

اس دلدل میں پھنس گیا ایک سال ٹوڑاوائی میں میں نے نوکری دی اور وہاں سے تین

برس شیخاواٹی میں ڈپٹی رہا۔ مہاراجہ صاحب بہادر مہاراجہ مادھو سنگھ جی ان دنوں

میں بے اختیار تھے اور ایک طوفان بدتمیزی جے پور میں طغیانیوں پر تھا یعنی جس قدر

مہاراج رام سنگھ جی کے ملازم تھے وہ سب خانہ نشین ہو گئے۔ ایک نئے سپرنٹنڈنٹ

ہوئے تھے انہوں نے ہم چار ملی ڈپٹیوں اور پرانے تھانہ داروں کو موقوف کر کے

نے بھرتی کر دیئے تھے ان کی نالش فریاد بہت سی ہوئی۔ اُنھوں نے میری جگہ پر اپنے
ایک بھائی کو مقرر کیا اُن کی نالش فریاد ہوتی رہی۔ آخر دو برس چارہ جوئی کر کے تھک
کر اپنے گھر بیٹھ رہا ریاست نے اتنی پرورش کر دی کہ میرے بیٹے کو تھانہ دار کر دیا تھا
اسی اثنا میں میرا ارادہ بھوپال کا ہوا۔ اور دوران سفر میں مقام جاورہ میں قیام ہوا۔
نواب صاحب نواب اسمٰعیل خاں بہادر والئ جاورہ سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ایک
قصیدہ نذر کیا آٹھ روز مجھے مہمان رکھا اور پچاس روپیہ صلہ کے دے کر رخصت کیا۔
میں بھوپال میں آیا اپنے ایک دوست کے مکان پر مقیم ہوا۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب
سے ملاقات ہوئی حضور نواب شاہجہان بیگم صاحبہ کے مواجہہ میں مشاعرہ ہوتا تھا۔
آٹھویں دن روز جمعہ کو شریک مشاعرہ ہوتا تھا پس پانچ سات آدمی شریک جلسہ ہوتے
تھے۔ نواب صاحب نے امیدوار کیا تھا۔ بعد تین ماہ کے میں واپس مکان کو روانہ ہوا
ایک قصیدہ عید قربان کا بیگم صاحبہ کے دربار میں پڑھا تھا۔ اس کے صلہ میں دو سو
روپیہ عنایت ہوئے تھے وہ لے کر مکان کو چلا گیا نواب احمد علی خاں صاحب کے
بڑے بیٹے کی شادی میں میں نے قصیدہ لکھا پچاس روپیہ صلہ کے دیئے اور کہا
کہ اب آپ کہیں نہ جائیں میری ریاست میں رہیں چنانچہ مرتے دم تک اُنھوں نے
مجھے اپنے سے جدا نہ کیا اور میں آرام سے جے پور میں بیٹھا رہا۔

جے پور کو خدا آباد رکھے عجیب شہر ہے باعتبار شہریت یہ اپنا نظیر نہیں رکھتا۔
اور آب و ہوا بھی بحد اعتدال لطیف و خوشگوار ہے۔ ہر طرح کا امن و آسایش ہے۔
ایک ایسی عمدہ بات جے پور میں دیکھنے میں آئی کہ تمام ہندوستان میں نہیں یعنے ہر
قوم اور ہر فریق اور ہر مذاہب کے آدمی جے پور میں سکونت پذیر ہیں مگر باہم تعصب

مذہبی نہیں ہندو مسلمان۔ شیعہ سنی۔ انگریز سب باہم شیر و شکر ہیں کبھی باہم مذہبی تعصب کا تذکرہ نہیں آتا۔ ہولی۔ دسہرہ۔ محرم۔ رام لیلا وغیرہ میں انگریزی عملداریوں میں باہم فتنہ و فساد ہوئے آدمی مارے گئے۔ مگر جے پور میں کبھی تکرار تک نہیں ہوئی۔ یہ سب خوبیاں مہاراج رام سنگھ بہادر کے عدل و انصاف اور نظم و نسق اور سیاست دانی اور تالیف قلوب اور بلا تعصبی کے ہیں کہ آجتک وہی انتظام برقرار ہے جو بنا وہ ڈال گئے ہیں اور یہ سب نتیجہ اُن کی بیدار مغزی کا ہے حالانکہ مہاراجہ صاحب بہادر مہاراج سری سوامی مادھو سنگھ جی کے مزاج میں کسی درجہ تعصّب مذہبی نسبت فرقۂ اہل اسلام ہے مگر رعایا پروری کی نظر سے حقوق سب کے برابر سمجھے جاتے ہیں جو سلوک ہنود کے ساتھ ہوتے ہیں اس سے زیادہ کچھ مسلمانوں کے ساتھ مرعی رکھے جاتے ہیں۔ ایام قحط سالی میں سب اقوام کے ساتھ ایک برتاؤ کیا گیا اور دو دو روپیہ مہینہ سب کا برابر جاری رکھا گیا اور تین برس سب کو برابر ملے کیا۔ حق تو یوں ہے کہ زمانۂ قحط سالی میں جو مہاراجہ مادھو سنگھ جی نے رعایا پروری کی ہے۔ آج تک نہ کسی بادشاہ نے کی نہ کسی راجہ نے کروڑوں روپے اپنی رعیت پر سے صدقے کر دیئے غلہ کے بازاروں میں انبار چنوا دیئے اور دس سیر کا بیچے گئے۔ ایک پیسہ والے کو ایک لپ بھر کے دے دیتے۔ تھے اٹھارہ ہزار آدمی کی مدد جاری تھی عورات پردہ نشین رات کو جا کر کام کرتی تھیں۔ صبح سے پہلے مزدوری لے کر گھر آجاتی تھیں۔ بن میں عام حکم تھا جس کا جی چاہے درخت کاٹ لاؤ اور بیچو اور کھاؤ اس کے علاوہ لنگر جاری تھا۔ کنگلوں کے واسطے ڈیرے کھڑے کرا دیئے۔ نمدے کا فرش بچھوا دیا کئی ہزار کمبل تقسیم کرا دیئے۔ علاوہ ازیں مہاراجہ صاحب مزاج

کے بہت حلیم وسلیم ہیں کسی کے آزار تکلیف کے روادار نہیں منہ سے کسی کو بُرا بھلا نہیں کہتے کسی پر خفا نہیں ہوتے۔ رعایا۔ ملازم سب خوش وخرم ہیں فیاض بدرجہ اوسط ہیں جو جس کا مقرر ہے ملے جاتا ہے۔

قلعہ رنتھنبور [1]

یہ قلعہ بنظر استحکام روئے زمین کے قلعہ جات سے زیادہ تر رفعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اگر کوئی غنیم قلعہ کشائی کے ارادہ سے حملآور ہو تو ہر چہار اطراف سے قلعہ تک رسائی محال بلکہ غیر ممکن۔ اگر قلعہ والوں کے پاس سامانِ رسد و میگزین وغیرہ وجمعیت مناسب دفعیۂ محاصرین موجود ہو تو تمام عمر فاتح قلعہ مذکور پر دستیاب نہیں ہو سکتا۔

یہ قلعہ سات کوس کے دوائرہ میں بطور نقطۂ پرکار واقع ہوا ہے اور حصار کے پہاڑ بھی نسبت سر بفلک کشیدہ اور نہایت بلند وضخیم ہیں۔ دامن کوہستان میں زمین مزروعہ ہے۔ اُن میں زراعت بخوبی ہوتی ہے اور جابجا آبشار وچشمہ سار ہیں۔ پہاڑوں کا پانی تالابوں میں جمع ہوتا ہے اور دیہات آباد ہیں۔ طولاً عرضاً دوازدہ کوس کے فاصلہ میں یہ قلعہ واقع ہوا ہے اور کسی جانب سے راہ ہموار اور درہ اور راہ آمد وشد قلعہ نہیں ہے۔ بجز اسکے جادہ ہائے ناہموار وانتہائی دشوار گذار اور پست وبلند گھاٹیاں کہ جن

---

[1] اس فلک تمثال قلعہ کو سنہ ۱۲۹۹ء میں سلطان علاؤالدین خلجی نے فتح کیا لیکن خاندان کے زوال کے بعد یہ ریاست پھر راجپوتوں کے قبضہ میں چلی گئی۔ سنہ ۱۵۶۳ء میں شہنشاہ اکبر نے جے پور پر حملہ کیا یہاں کے راجہ بہارا مل نے اکبر کی اطاعت قبول کر لی اور اپنی بیٹی کی شادی شہنشاہ سے کر دی اکبر نے راجہ کے بیٹے بھگوان داس اور پوتے مان سنگھ کو امرا میں شامل کیا اور ۵ ہزاری منصب عطا کیا۔ شاید اسی وجہ سے اس ریاست میں مذہبی تعصب نہیں تھا (نظیر)

پر سے سوئے ایک دو پیدل اور ایک سوار کے عبور و مرور دشوار ہے۔ کوئی رستہ بھی ایسا نہیں جس سے توپ کا گزر قلعہ تک ہو کسی جانب سے لگاؤ ایسا نہیں کہ توپ پہنچ سکے چہار طرف سے پہاڑ قلعہ کو چکی کے گوند کی طرح گھیرے ہوئے ہیں ان کے بیچ میں قلعہ کا مینار واقع ہوا ہے۔ اور خوبی یہ ہے کہ یہ پہاڑ سیدھا مینار کی طرح زمین سے اُٹھ گیا ہے۔ قلعہ کا راستہ البتہ ڈھلوان ہے۔ قلعہ کے شمالی جانب پیش قلعہ ایک میدانِ وسیع واقع ہوا ہے اُس میں ایک تالاب عظیم الشان ہے۔ تالاب کے کنارے درختانِ انبہ بکثرت ہیں لیکن یہ قطعۂ زمین اس درجہ گلہائے رنگارنگ خود رو سبزہ زارِ شاداب سے ایسا پُرفضا اور پُربہار ہے کہ خطۂ کشمیر بھی اس کے نظیر نہیں ہو سکتا ہے۔ کیوڑے کیتکی کے درخت اس کثرت سے ہیں کہ کوسوں تک ان کی مہک پہنچتی ہے۔ تمام کوہستان خوشبو ہو رہا ہے قطعہ زمین سب سر سبز ہے۔ سبزے پر چھوٹے چھوٹے رنگ برنگ کے پھول مصور کے ہاتھ کے قلمکار معلوم ہوتے ہیں۔ یہ منظر ایسا خوش نما اور پُر فضا ہے، کہ اس کا جواب بھی نکلنا دشوار ہے۔ بالائے قلعہ بہت وسعت ہے ہزار ہا فوج کی گنجائش ہے پانی کے چشمے عمیق ہیں۔

جوہرا یو ہرا دو کھتے ایسے عمیق ہیں جس میں ہزار ہا من غلہ و میخ زین و اشرفیاں روپیہ کروڑوں سما جائیں اور بالائے قلعہ دو بزرگانِ دین اولیاء اللہ کا مزار ہے جن کی امداد سے قلعہ فتح ہوا ہے ایک بزرگوار کا نام تو سیّد صدر الدین صاحب ہے ان اضلاع میں ہندو مسلمان یا اور کوئی میاں صدر الدین کے نام کی قسم نہیں کھاتے ہیں۔ قلعہ کے پہاڑ سے ملا ہوا رن کا پہاڑ ہے۔ ان دونوں پہاڑوں میں باہم دو سو گز کا فاصلہ ہے۔ عجب تماشا ہے کہ جب قلعہ پر چڑھو تو رن کا پہاڑ

نیچا معلوم ہوتا ہے۔ اور جب رن کے پہاڑ پر چڑھو تو قلعہ نشیب میں ہو جاتا ہے۔
بادشاہ علاؤالدین خلجی راجہ ہمیر سے بارہ برس لڑا ہے جب قلعہ فتح ہوا ہے ہر گھاٹی
میں صدہا قبریں شہیدوں کی ہیں۔ لاکھوں آدمیوں کے کُشت و خون کے بعد قلعہ
فتح ہوا ہے۔ بامداد اُن دونوں بزرگواران سادات۔
رن کے پہاڑ پر جب بادشاہ کی فوج پہنچی ہے اور یہاں سے توپ لگائی
جب میدان میں آکر راجپوت لڑے ہیں۔
قلعہ کے پہاڑ کے گرد و پیش کے جو پہاڑ ہیں سب پُر بہار ہیں۔ جابجا چشمہ ہائے
آبِ رواں ہیں اور درختان گنجان اور سبزہ زار ہے۔ جہاں دیکھو پہاڑ میں سے
آبِ زلال جھرتا ہے اور کیتکی کے پھولوں کا سبزہ ہے۔ یہ قلعہ جے پور سے گوشۂ
مشرق و جنوب میں بفاصلہ چہل کوس واقع ہے۔ اس کوہستان میں شکار پرند، چرند،
درند بکثرت ہیں۔ جو صاحبانِ انگریز جے پور میں آتے ہیں اسی قلعہ کے دیکھنے کو ضرور
جاتے ہیں اور آٹھ آٹھ دس دس روز شکار گھیرہ۔ ریچھ وغیرہ کا کھیلتے ہیں سانبھر، نیل
گاؤ، جنبل۔ بارہ سنگھے، چیتے وغیرہ اس افراط سے ہیں کہ چرند تو کیا آدمیوں کے
قریب آجاتے ہیں اور مطلق وحشت و رم نہیں کرتے۔

کوہستان برائیہ

برائیہ نامی ایک پرگنہ ہے۔ علاقہ جے پور کا۔ جے پور
سے چوبیس کوس کے فاصلہ پر جانب گوشۂ مشرق و شمال

اس مقام پر کچھ آثار و نشانیاں پانچ ہزار سال گذشتہ کی موجود پائی جاتی
ہیں۔ تواریخ ہنود میں کورو پانڈوں کا مذکور ہے اور بھارت میں جس جنگِ عظیم کا
نشان ملتا ہے۔ وہ پانڈے یہیں مقیم تھے اور وہ جنگِ خونخوار اسی نواح میں ہوئی

ہے بھیم اور ارجن وغیرہ کے مکانات بھی موجود ہیں ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے جو زمین سے
کچھ بلند ہے۔ اُس کی سطح بالا پر ایک حجرہ وسیع پہاڑ میں ترشا ہوا ہے۔ اس کے
دروازہ کی چوکھٹ تک موجود ہے کہتے ہیں کہ یہ بھیم کی سکونت کا حجرہ ہے۔
اُسی پہاڑ پر دس بارہ گز طویل اور ڈیڑھ دو گز کے قریب ایک چشمہ
آب ہے اور اُس کے عُمق میں بہت مبالغہ ہے لوگ کہتے ہیں سات چار
پائیوں کے بان میں پتھر باندھ کر لٹکایا تھا تاہم تہ کو نہ پہنچا تھا۔ اُس کا عُمق کسی کو ثابت
نہیں ہُوا اُسے مشہور کرتے ہیں کہ بھیم نے پہاڑ پر لات ماری تھی تو زمین کا پیند اپھوٹ
کر یہ پانی اُبل آیا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ دوازدہ ماہ وہاں پانی بھرا رہتا ہے
اور اس میں سے لوگ بھر کر لے جاتے ہیں اور پیتے ہیں اور پانی کم نہیں ہوتا۔ اُسی
پہاڑ پر بڑے بڑے گولے پتھر کے ترشے ہوئے مدور پانچ پانچ گز کے اکثر دیکھنے میں
آئے۔ اُن گولوں کی نسبت یہ روایت سُنی جاتی ہے کہ یہ اُن ساتوں بھائیوں کے
کھیلنے کی گولیاں ہیں۔
اُن کے قریب ہی پہاڑ پر ایک اور سطح مربع قطعہ پہاڑ کا ہے کہ پچاس گز سے
پچاس گز تک مربع ایک سل پہاڑ کی ہے۔ اور اس کے ہر چہار کونوں پر چھوٹی چھوٹی
چار برجیاں بنی ہوئی ہیں مگر طرفہ تر یہ بات تعجب خیز ہے کہ پہاڑ کا ٹکڑا زمین سے
ادھر رکھا ہوا معلوم ہوتا ہے نیچے اس کے جوف سے چہار طرف سے خالی ہے
فقط ایک نوک اس کی پہاڑ پر دھری ہوئی ہے۔ اُس کی شکل ایسی ہے جیسے خاصدان
کا ڈھکنا اُٹھا کر کے رکھ دیتے ہیں اور بصورت اوندھے بُرج کے وہ پہاڑ پر رکھا
ہوا ہے آگے جا کر ایک پہاڑ پر پتھر کے نقارے دھرے ہوئے دیکھے اور ایک

پتھر کا ایک ہاتھی بقامتِ فیل اصلی بیٹھا ہوا دیکھا۔

اُس کے اُوپر کے پہاڑ پر ایک پتھر کی لاٹ چھ گز لمبی دیکھنے میں آئی۔

اُس کا حال دریافت کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ لاٹھ تو دال گھونٹنے کی ڈوئی ہے۔

اور یہ نقارے اصلی لوہے کے تھے۔ اور یہ فیل بھی ان کی سواری کا ہاتھی تھا

بعد یہ سب پتھر کے ہو گئے۔

شیخاوانی

یہ ضلع جے پور سے جانب شمال دور تک چلا گیا ہے حد غربی اس کی جودھپور اور بیکانیر سے ملحق ہے اور حد شمالی ہانسی حصار

اور بیر گنہ لوہارو ہے۔ یہ ملک تمام ریگستان ہے۔ جابجا ریت کے پہاڑ ہیں جس

وقت ہوا تیز چلتی ہے ادھر کا پہاڑ اُڑ کر اُدھر آجاتا ہے۔ آدمی اگر سوتا ہو اور ریت

اڑ کر آگئی ہے تو کچھ پتہ نہیں چلتا کہاں غائب ہو گیا۔ پانی کی اس ملک میں کم بلا ہے۔ پانی

اتنی دُور جا کر کنوئیں میں ہے۔ واقع ہوا ہے کہ جب کنوئیں میں سے چرسہ برآمد ہوتا ہے تو چرسہ

کھینچنے والے کو کنوئیں پر سے آواز نہیں پہنچ سکتی ہے لامحالہ لب چاہ ایک بڑا ڈھول

رکھا جاتا ہے۔ جب پانی کا چرسہ برآمد ہو جاتا ہے تو ڈھول پر ڈنکہ دیا جاتا ہے۔

کیلی والے کو خبر ہو جاتی ہے لاؤ کے نرگاوان کو روک لیتا ہے۔ یہ بات مشہور

ہے ڈھولے دھمکے سے پانی نکلتا ہے۔ اب اس پانی کی کیفیت یہ ہے کہ فی گاؤں

ایک کنواں ہوتا ہے بالائے چاہ ایک چبوترہ وسیع ترتیب دیا جاتا ہے اور سر چاہ چار

مینار بلند تعمیر کئے جاتے ہیں اور چاہ میں سے بذریعہ ڈول آب برآمد کیا جاتا ہے اور ہر چہار

حوض میں بھر دیا جاتا ہے۔ اب ٹھاکر برہمن بقال مہاجن مسلمان شیخ سید مغل پٹھان

سب ان حوضوں میں سے پانی بھر کر لے جاتے ہیں۔ وہاں تمیز ہندو مسلمان کا نہیں ہے

یہ تجویز کی گئی ہے کہ ہر چہار طرف چبوترہ نالیاں پختہ بنادی گئی ہیں کہ اُن حوضوں میں سے پانی چھلک کر اُن نالیوں میں جاتا ہے یا بوقت بھرنے حوضوں کے چبوترہ پر سے بہ کر اُن میں جاتا ہے ان میں سے اور اقوام گھڑے بھر بھر کر لے جاتے ہیں یا مویشی پیتے ہیں

بعض مقامات پر یہ بھی نہیں وہاں بالکل قحط آب ہے۔ پانی ہے مگر کس کام کا بالکل دریلائے شور کا پانی ہے زہر آب کا حکم رکھتا ہے ادھر آدمی کے حلق سے اُترا اُدھر دست کی راہ سے سب نکل جاتا ہے آدمی کو دست لگ جاتے ہیں۔ تلخ اس درجہ ہے جیسے برگِ نیب۔ اُن مقامات پر یہ کاروائی کی گئی ہے کہ صاف چٹیل میدان میں بڑے حوض پختہ ڈھلوان بنائے گئے ہیں اور پہلو ئے حوض میں ایک چاہ عمیق کندہ کر کے اُس کو پختہ کیا ہے اور اُس کی تہ بہت پختہ چونے سے کردی ہے اور کنوئیں کا دَور بھی پختہ ہے۔

موسمِ بارش میں جب بارانِ رحمت کا نزول ہوتا ہے تو اُن حوضوں میں پانی بھرتا ہے اور چاہ کی جانب حوض کا ضلع ڈھلواں ہے وہاں اُس کی موری رکھی گئی ہے۔ اور اُس کے مُنہ پر جالی لگی ہوئی ہے اُس جالی سے پانی چھنکر موری کی راہ سے پہنچ کر چاہ میں فراہم ہوتا ہے اور چاہ کے منہ پر ایک کھٹر کی لگی ہوئی ہے۔ وہ کھٹر کی بتدریج رہتی ہے۔ اور اُس کے مُنہ پر قفل لگا رہتا ہے۔ صبح کو گاؤں والے قفل کھول کر پانی تقسیم کرتے ہیں۔ ایک ایک گھڑا پانی کا گھر پیچھے دیا جاتا ہے اُس میں سب خانہ داری کا سامان کرنا ہوتا ہے اب اگر خدا نے فضل کیا۔ بارش ہوگئی تو وہ لوگ دیہات میں مقیم ہیں۔ اور اگر بارش نہ ہوئی تو وہ لوگ اپنے بال بچوں کو لے کر گاؤں سے نکل

کھڑے ہوتے ہیں۔ زراعت کی یہ کیفیت ہے کہ اُس ملک میں زراعت اونٹوں کے ذریعہ سے کی جاتی ہے نرگاواں کا کام نہیں۔

بعض جگہ ہل بھی نہیں جوتے جاتے فقط ہاتھوں سے ریت کے ٹیلوں پر تخم پاشی ہوتی ہے۔ قدرت خدا کو ملاحظہ کرنا چاہیئے کہ وہ ملک یک فصلہ ہے بارانی زراعت ہوتی ہے۔

قسم غلہ سے باجرہ۔ موٹھ پیدا ہوتی ہے۔ اساڑھ کے مہینے میں ایک چھینٹا پانی کا پڑا اور ان لوگوں نے تخم پاشی کی۔ باجرہ کا درخت گھوڑے سوار کے قد سے زیادہ تجاوز کرتا ہے اور ربیر بھر کی درخت میں بال آتی ہے۔

علیٰ ہذالقیاس موٹھ بھی زمین میں ایسی پھیلتی ہے کہ چھتے کے چھتے ہو جاتے ہیں لاکھوں من موٹھ باجرہ پیدا ہوتا ہے اور باجرہ کس قدر شیریں ہوتا ہے کہ گندم اور برنج کی کچھ حقیقت نہیں وہاں کے باشندوں کی وہی خوراک ہے۔ باجرہ کی روٹی اور موٹھ کی دال اور وہ ایسی خوش ذائقہ ہوتی ہے کہ اُس کے آگے پلاؤ۔ بریانی کی کچھ اصل نہیں۔ طرفہ ماجرا یہ ہے کہ اگر اُس ملک میں گندم برنج کا زیادہ استعمال کیا جائے تو آدمی بیمار ہو جاتا ہے۔

مویشی اس ملک کے نہایت توانا۔ گائے بھینس وغیرہ دودھ افراط سے دیتے ہیں اور دودھ چکنا ہوتا ہے۔ گھی بہت نکلتا ہے۔

بھیڑیں جیسی خوبصورت یہاں ہوتی ہیں کہیں نہیں دیکھیں۔ سفید براق رنگ ہوتا ہے پشم نہایت باریک ہوتی ہے کہ پارچہ بافی میں بہت کارآمد ہوتی ہے۔

گوشت بھیڑ بکری کا خوش ذائقہ۔ مجرب۔ فربہ۔ بھر بھرا مثل مرغ و ماہی ہوتا

ہے۔ اور سریع الہضم ہے ایسا لذیذ گوشت ہندوستان بھر میں نہیں ہوتا۔

ایک قسم کا تربوز خودرو ریگستان میں ہوتا ہے جس کو متیرہ کہتے ہیں سبحان اللہ کیا سرد و شیریں و کلاں ہوتا ہے۔ اُس کا شربت مثل قند شیریں اور خوش گوار ہوتا ہے ایک سوار اور گھوڑا بہنگام تشنگی میں سیراب ہو جاتا ہے وہ اکثر ریت کے ٹیلوں پر خودرو ہوتے ہیں اور ریت میں دبے ہوئے پڑے رہتے ہیں جن لوگوں کو اُن کا حال معلوم ہوتا ہے۔ وہ برآمد کر لیتے ہیں بہنگام سفر میں پانی تو کوسوں نہیں ملتا، متیرہ مل جاتا ہے اُس کو نکالا اور ایک جانب اس میں روزن کیا اور تاس وغیرہ یا اور کوئی ظرف پُر کر لیا۔ آپ پیا اور گھوڑے کو بھی پلا دیا۔ مجھے بہنگام دورہ اکثر اتفاق ہوا ہے کہ تشنگی غالب ہوئی ہے اور سواران ہمراہی سے کہا گیا ہے اور وہ ڈھونڈھ کر جنگل میں سے لے آئے ہیں اور اس کا شربت استعمال کیا گیا ہے۔

آدمی اس ملک کا محنت کش صاحبِ ارادہ۔ صاحبِ ہمت اور کماؤ ہوتا ہے۔ خصوصاً فرقہ مہاجن اور اسی وجہ سے وہ لوگ متمول ہیں۔ شیخاواٹی کا آدمی سوائے ملک یورپ تمام رُوئے زمین پر پھیلا ہوا ہے اور کمائی کر کے لاتے ہیں اور مکانات اور عمارات عالی شان بنواتے ہیں۔

میں تین سال برابر اس ملک میں برسر حکومت رہا ہوں۔

نواں باب

ریاست ٹونک کی ملازمت

ٹونک میں دھوم ہے کل سے کہ ظہیرِ خستہ
سرگزشتِ دلِ محزوں ہیں سنانے والے

بعد انتقال مہاراجہ صاحب مہاراجہ رام سنگھ جی بیکنٹھ باشی تین سال تک میں ملازمِ ریاست جے پور رہا بعد خانہ نشین ہو کر دو ڈھائی سال بے روزگار پریشان سرگرداں رہا۔ بعد نواب احمد علی خاں صاحب کی رفاقت میں چھ سال بسر کئے۔ اس اثنا میں شعر و سخن کا بہت چرچا رہا۔ بہت سا کلام فراہم ہوگیا۔ بعد انتقال نواب احمد علیخاں صاحب بہادر نواب مستطاب نواب حافظ محمد ابراہیم علیخاں صاحب امین الدولہ صولت جنگ فرمانروائے ریاست ٹونک خلد اللہ ملکہ کی طرف سے فقیر کی طلب ہوئی اور عاجز صاحبزادے احمد سعید خاں صاحب عاشق محرکِ سلسلہ ہوئے اور نواب احمد علی خاں صاحب مرحوم کے بڑے صاحبزادے کے نام حکم آیا کہ اُستاد ظہیر کو ٹونک بھیجدو۔ اس واقعہ سے پیشتر مجھے اکثر اوقات ٹونک جانے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا

اور نواب صاحب مرحوم کی خدمت میں آتا جاتا رہتا تھا۔ اکثر صاحبزادے میرے شاگرد ہو چکے تھے۔ اور عمائد شہر میرے معتقدین میں تھے۔ اول باوجود مجھے ٹونک جانے کا اتفاق ہوا تھا تو نواب عبید اللہ خاں صاحب وزیر جنگ نے مجھے اپنے بڑے صاحبزادے کی شادی میں مدعو کیا تھا اور نہایت احترام سے میری مہمانداری کی تھی میں نے قصیدۂ تہنیت شادی لکھا تھا وقت رخصت پچاس روپے اور دوشالہ صلہ میں دیا تھا۔

غرضکہ میں جب ٹونک میں پہنچا ہوں تو اپنے ایک شاگرد کے مکان پر فروکش ہوا اور پیشتر نائب صاحب سے ملاقات کی نائب صاحب بکمال اعزاز پیش آئے اور فرمایا آپ نے بہت راہ دکھائی۔ حضور پرنور کو بہت انتظار تھا۔ اس کے بعد منشی محمد یوسف صاحب میر منشی خاص اور کپتان سید نور الدین صاحب فصیح الملک جو نواب صاحب بہادر کے مصاحبین میں تھے اور میری طلبی کے بارہ میں وہی واسطہ تھے اُن سے ملا اور اُنہوں نے میرا کلام سُنا۔ چونکہ یہ دونوں صاحب نہایت سنجیدہ اور فہمیدہ سخن سنج سخن فہم اور خود سخنور تھے اور مذاق سخن سے خوب آگاہ تھے۔ وہ نہایت محظوظ ہوئے اور کہا کہ جیسی شہرت سُنی تھی اُس سے بدرجہا زائد پایا اب کل انشاء اللہ تعالیٰ حضور میں چل کر نذر گزرانیے۔ دوسرے روز معیت ہر دو صاحبان میں نواب صاحب بہادر خداوند نعمت کی خدمت میں پہنچا۔ نذر گزرانی۔ حضور بہت خوش ہوئے۔ اپنا کلام مجھے سُنایا میں نے تعریف کی۔ فرمایا جب تم نے پسند کیا تو میری دانست میں بلاشک مقبول عام و خاص ہوگا۔ اس کے دوسرے روز صاحبزادے اسحاق خاں صاحب برادر حقیقی نواب صاحب کے مکان پر مشاعرہ تھا حکم ہوا کل مشاعرہ میں حاضر ہو کر اپنا کلام عرض کرو۔ دوسرے روز مشاعرہ میں ایک ہجوم کثیر صاحبزادگان رائین دولت کا

فراہم ہوا۔ نواب صاحب پسِ پشت سراچہ تشریف رکھتے تھے۔ قنات کے دروازوں پر چلمنیں پڑی ہوئی تھیں۔ غزلخوانی شروع ہوئی اوّل نواب صاحب بہادر کی غزلیں پڑھی گئیں۔ اور بہت سی تعریف ہوئی اور بعد سلیمان خاں صاحب اسد شاگرد منشی مظفر علی صاحب اسیر مرحوم نے نائب صاحب کی غزل پڑھی۔ کیونکہ نائب اُن کے شاگرد تھے۔ بعد سلیمان خاں صاحب نے اپنی غزل پڑھی میں نے تعریف کی آپ کا کلام بہت اچھا ہے۔ بعد مجھے حکم ہُوا تو غزل پڑھ میں نے غزل کا مطلع پڑھا بس مطلع سُنتے ہی مشاعرہ میں شور برپا ہوگیا۔ نواب صاحب بہادر نے تین تین چار چار بار مطلع کو پڑھوایا بعد دوسرا مطلع پڑھا۔ اُس پر بھی یہی کیفیت ہوئی تیسرا مطلع پڑھا وہ اُس سے بڑھا ہُوا تھا۔ اُس وقت ایک صاحبزادے نے اُن کا نام بھی بھول گیا ہوں اور وہ انتقال فرماگئے (افسوس ظہیر صاحب بھی رحلت فرماگئے) اُنھوں نے مشاعرہ میں کھڑے ہوکر بہ آوازِ بلند یہ بات فرمائی سلیمان خاں صاحب شعرا سے کہتے ہیں کہ خود بخود در و دیوار سے صدائے تحسین و آفرین بلند ہے۔ غرضکہ تمام غزل پر یہی کیفیت رہی۔ بعد میرے اور حضّار نے غزلیں پڑھیں مشاعرہ ختم ہُوا۔ نواب صاحب بہادر نے مجھے اندرونِ قنات بُلاکر بہت قدرافزائی فرمائی۔ اُس کے بعد جلسہ سالگرہ نواب صاحب بہادر کا ہُوا۔ اُس تقریب میں شامل رہا۔ حسبِ قاعدہ نذر ہوئی اُس کے تیسرے روز صاحبزادے احمد یار خاں کے مکان پر مشاعرہ ہُوا میں نے قصیدہ سالگرہ کا پڑھنا شروع کیا۔ اور تحسین و آفرین کا غل مچ گیا۔ میں چلمن کے برابر بیٹھا ہُوا قصیدہ سُنا رہا ہوں اندرون کمرہ سے حضور تعریف فرماتے جاتے ہیں اور باہر عوام تعریف کر رہے ہیں۔ جب میں قصیدہ سُنا چکا تو اندر نواب صاحب اپنے جلسے کے لوگوں سے جو

قصر میں تھے۔ ان سے صلاح لینے لگے کہ اس قصیدہ کا صلہ کیا تجویز کیا جائے۔ یہ
قصیدہ استادوں کے قصائد سے ملتا جلتا ہوا ہے۔ میرزا محمد علی خاں صاحب اور
نواب نجف خاں صاحب ممبرانِ کونسل نے عرض کی کہ ظہیر تو ذوقِ زندہ ہے اور
حضور بہادر شاہ، اب صلہ کا اختیار حضور کو ہے۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ پانسو روپیہ
دلادینے چاہئیں۔ اس وقت میری بدنصیبی سے دو حساد بھی موجود تھے انہوں نے
عرض کی کہ حضور قصیدہ تو ذوق کا ہے آپ صلہ کس بات کا دیتے ہیں مگر سبحان اللہ
حضور نواب صاحب بہادر کی دریادلی فرمایا کسی کا ہو ہے تو میری مدح میں مجھے صلہ
دینا واجب ہے۔ خیر اچھا تو ڈھائی سو روپیہ دلادو۔ خیر وہ حکم لکھوا دیا گیا۔ اسی وقت
میرزا محمد علی خاں صاحب نے باہر آکر مجھ سے یہ ماجرا بیان کیا کہ یہ معاملہ پیش آیا
جب بعد تین ماہ کے وہ صلہ کے روپے معرفت نائب صاحب کے مجھے وصول ہوئے
عرصہ چہار ماہ تک میں امیدوار رہا۔ اس عرصہ میں دربار داری بھی رہی اور ہمیشہ جلسے
شاعروں کے بھی ہوتے رہے میں ہر مشاعرہ میں شامل ہوتا رہا صحبتِ شعر و سخن شبانہ
روز سرکار میں گرم رہتی تھی بعد میں نے ایک روز نائب صاحب سے کہا کہ میں کب
تک امیدواروں میں بسر کروں میں مسافر ہوں۔ نائب صاحب نے کہا میں تم کو
رخصت کرائے دیتا ہوں میں نے یہ تذکرہ منشی محمد یوسف سے کیا انہوں نے بیان
کیا کہ تم ہرگز ایسا نہ کرنا تم نواب صاحب کے حسب الطلب آئے ہو تم نوکر ہو تو
تمہیں تنخواہ ملے گی۔ نائب صاحب تمہارا رہنا نہیں چاہتے وہ سلیمان کے ساعی ہیں
چنانچہ بعد چار ماہ کے ایک روز حافظ عبدالرحمن صاحب مختار سے جناب نواب
صاحب نے مجھے اور سلیمان خاں صاحب کو بلا کر دو دو ماہی کی تنخواہ برابر دی اور

کہا کہ چوتھے مہینے تم کو اسی حساب سے تنخواہ ملا کرے گی یہ وہی سال اور وہی دن ہیں
کہ جس سال داغؔ صاحب حیدرآباد میں کامیاب ہوئے اور یہاں ہی میرے نام
داغؔ صاحب کا خط پہنچا ہے کہ یہاں میں نوکر ہوگیا ہوں۔ اُس کے جواب میں خبر ملنے
پر میرے خط کی تحریر ہے تو اُس کا بھی یہی مضمون تھا۔ کہ میں بھی نوکر ہوگیا ہوں۔ اسی اثنا
میں نواب خاتون زمانی بیگم صاحبہ ہمشیرہ زادی نواب کلب علیخاں صاحب مرحوم محل
خاص حضور نواب صاحب بہادر خداوند نعمت میری شاگرد ہوئیں اور کچھ تنخواہ میری
وہاں سے بھی مقرر ہوگئی اور بیگم صاحبہ کی مثنوی اصلاح کو آنے لگی غرض میں اپنے خوش
وخرم رہنے لگا میں خاصی اچھی طرح بسر کرتا تھا۔ اُدھر میں نوکر اور میرا بیٹا نوکر تھا۔
وہ تھانے دار تھا۔ بعد میں دو تین سال وہ معطل ہوگیا تھا کچھ پروا کی بات نہ تھی۔
میں نوکر تھا۔ اسی اثنا میں میری منجھلی لڑکی کی شادی ہوئی اور وہ رخصت ہوکر دہلی چلی
گئی۔ میرا ارادہ سیر و سیاحت کا ہوا میں ٹونک سے تین ماہ کی رخصت حاصل کرکے
بڑودہ ہوتا ہوا بمبئی پہنچا اور حیدرآباد میں وارد ہوا۔ اکثر عمائد سے ملاقات ہوئی۔ مہاراجا
بھگوان سہائے بہادر میرے شاگرد ہوئے اور دو تین آدمی شاگرد ہوئے۔ خانساماں
محمد ابراہیم خاں صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ مجھ سے نہایت اخلاق سے پیش
آئے۔ مجھے امیدوار کیا تم ٹھہرو میں حضور میں تذکرہ کروں گا سہرے حضور کیواسطے
لکھوائے۔ جھولا لکھوایا۔ غزلیں اکثر لے جاتے تھے۔ غرضکہ لیت ولعل میں پانچ
مہینے گزر گئے۔ ٹونک سے تاکید طلبی کی ہوئی۔ تار آیا اُدھر لڑکے کا خط آیا ہم کو آپ
کی کمائی درکار نہیں آپ چلے آیئے میں یہاں سے چلا گیا۔ ٹونک میں پہنچا تو میرے
بعد چھ ماہ میں تنخواہ تقسیم ہوئی ہے مجھے نہ ملی۔ بلکہ دوسری چھ ماہی میں ملی نہایت

درجہ کی زیر باری ہوگئی - نو سو روپیہ کا قرضدار ہوگیا - خدا خدا کر کے وہ قرضہ ادا کیا -
اب چرخ جفا کار دل آزار نے ایک تیر ستم تاک کر ایسا دل پر لگایا کہ دل اور جگر کو پھوڑ
کر پار ہوگیا - یکایک گھر سے خط پہنچا کہ منجھلی لڑکی بیمار ہو کر دلی سے جے پور میں آئی
تھی - اُس کا انتقال ہوگیا - اس خط کو دیکھتے ہی روح تن سے پرواز کر گئی - رویا -
پیٹا لیکن کیا کر سکتا تھا گھر پر آیا بی بی کو دیکھا تو وہ دیوانی ہو رہی تھی اُسے سمجھایا اپنے
دل پر پتھر رکھا گیارہ بچوں میں یہ چار پروان چڑھے تھے - جوان ہوئے تھے - سب سے
بڑا لڑکا تھا اور یہ تین لڑکیاں تھیں - ایک چھوٹی لڑکی کی ہنوز شادی نہیں ہوئی تھی
وہ منجھلی لڑکی مرنے والی پانچ ماہ کی ایک دختر نہایت خوبصورت چھوڑ کر مر گئی تھی -
اس کی پرورش کی گھر میں نہایت تاکید کی کہ بجائے متوفیہ کے اس کو سمجھو - انّا
دودھ پلانے پر نوکر رکھ کر پھر نوکری پر روانہ ہوا - برس روز بعد اُس بچی کا انتقال ہو
گیا - اور زخم پر زخم لگا - اور وہ داغِ کہن دوبارہ تازہ ہوگیا - اُس پر بھی صبر کیا -
اُن روزوں ہی ٹونک میں تھا کہ میری بی بی ٹونک میں میرے پاس پہنچیں صاحبزادہ
احسان اللہ خاں ہمشیرہ زادہ و داماد نواب صاحب بہادر میرے شاگرد تھے اُن
کی والدہ صاحبہ یعنی خواہر نواب صاحب کے پاس جا کر رہیں - بیگم صاحبہ نے
نہایت خاطر مدارات فرمائی - بعد ایک ماہ کے وہاں سے رخصت ہوئیں تو مجھ سے
کہا کہ مجھے گھر پہنچا آؤ - خیر میں نے شکرم کا کرایہ دیا اور شکرم کا نیچے کا درجہ لیکر
اس میں نصف شکرم میں پردہ ڈال دیا - اُس میں اُنہیں اور ایک نیک بخت منگلانی
خاتون زمانی بیگم صاحبہ کے ہمراہ ہی دونوں کو بٹھا دیا - اور آپ باہر ہو بیٹھا - اور
سب سامان اپنا شکرم کی ماچی پر بند ہوا دیا - اور تین مرد اور میرے باقی باہر

بیٹھے تھے ۔ اور چند آدمی شکرم کے اوپر کے درجے میں تھے ۔ میرے پاس تلوار بہت عمدہ تھی میرے پاس رکھی ہوئی تھی جب ہم ندی سے پار اتر کر شکرم پر سوار ہوئے ہیں تو مغرب کا وقت تھا اور جب تین کوس راہ اور طے کی ہے ۔ تو دس بجے رات کا وقت تھا کہ یکایک دھڑا دھڑ کی آواز آنی شروع ہوئی اور مار یو مار یو کا غل مچا اور غارتگروں نے آکر شکرم کو گھیر لیا اور لٹھ مارنے شروع کئے مارے لٹھوں کے کوچوان کو اور محافظ شکرم کو بھی گرا دیا ۔ اور شکرم کے اوپر کے چھپر پر لٹھ مارنے لگے اور ایک عورت اور ایک مرد شکرم کی پشت کے تختے پر بیٹھے تھے مارے لٹھوں کے ان کا چورا کر دیا ۔ اب یہ کیفیت ہوئی کہ ایک پر ایک شکرم کے اندر گرتا ہے ۔ میں تین آدمیوں کے نیچے دب گیا ۔ اِدھر اُدھر کے درجہ والے جو گھبرا کر اُتر اُترتے ہی اُن کو بھونا کر دیا ۔ ایک جوان انگریزی سپاہی تھا وہ جوان بھرتی کرنے آیا تھا اُس کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا ۔ اُس غریب نے پانچ چار ڈنڈے مارے ایک کو اُس نے بھی گرا دیا تھا ۔ مگر اکیلا کیا کر سکتا تھا وہ چالیس آدمی تھے اُس کے سر پر بہت سے لٹھ پڑ گئے ۔ آخر غش کھا کر گر گیا ۔ اِدھر میں تڑپ کر آدمیوں کے نیچے سے نکلا ۔ تلوار کو ٹٹولتا ہوں تلوار کا پتہ نہیں میں شکرم سے نکل کر تختے پر آیا ہوں کہ ایک شخص نے برابر سے لٹھ دیا میرے کاندھے پر پڑا دوسرے نے لٹھ مارا سر پر پڑا سر پھوٹ گیا تیسرا لٹھ جو برابر سے مارا میری نظر اُدھر تھی ۔ وہ میں نے خالی دیا پرے کو گردان کر لی سو وہ لٹھ تختے کی زنجیر پر پڑا وہ لٹھ میں نے تھام لیا ایک طرف سے میرے ہاتھ میں دوسرا سرا غارتگر کے ہاتھ میں تو اور دو تین آکر مجھے لپٹ گئے تختے پر سے نیچے گرا دیا ۔ اوپر سے اور چاہتا تھا کہ میرے لٹھ مارے کہ میری بی بی

میرے اوپر گر پڑی ایک بولا۔ ارے ڈوگری ہے ڈوگری مر جائے گی۔ اب میرا ہاتھ پکڑ کے دو تین نے کھڑا کیا اور میرا بدن، اور کمر ٹٹولنے لگے میں نے کہا کہ میرے پاس کچھ نہیں۔ وہ تینوں مجھے گھسیٹتے ہوئے کوئی دس قدم کے فاصلہ پر لے گئے اور وہاں جا کر کنکروں پر پھینک دیا اور دو آدمی لٹھ لے کر میرے سر پر کھڑے ہو گئے اور کہا ڈوگرے تو یہاں سے ہلا تو تجھے جان سے مار ڈالیں گے۔ میری بی بی روتی ہوئی میرے پاس آئی اور کہا ہائے غارت گر گاڑی والوں کو مار دھاڑ کر رہے ہیں۔ اور پوٹلیں باندھ باندھ کر اسباب کی لئے جاتے ہیں۔ اور ہم دونوں بیٹھے ہوئے یہ سماں دیکھ رہے ہیں۔ ایک آدمی کے ہاتھ میں وہی میری تلوار ہے اور وہ اچھلتا پھرتا ہے اور کہتا ہے اس تلوار سے سب کا سر کاٹ لوں گا۔ اُدھر گاڑی کے اندر کے آدمیوں کو سب کو باہر نکال کر سب کی تلاشی لے لی کسی کے پاس ایک پیسہ نہ چھوڑا۔ اور اُس عورت مغلانی کے پاس پانسو چھ سو کا مال اسباب تھا سب چھین لیا۔ ایک برہمنی کے پاس زیور تھا سب اُتار لیا فقط پاؤں کے کڑے نہ اُتر سکے۔ جب وہ تلوار ہلاتا ہوا ادھر آئے میری بی بی روتیں اور چپکی چپکی مجھ سے کہتیں خدا کے لئے تم یہاں سے بھاگ جاؤ تمہاری جان تو بچ جائیگی میں نے کہا بھاگ کر جاؤں تو اس سے کہیں جان بچ سکتی ہے۔ اسی اثناء میں ایک شخص اور مسافر آمرا اُس کو دیکھتے ہی یہ دونوں شخص جو میرے سر پر کھڑے تھے اُنہوں نے برابر سے جا کر اُس کی پشت پر دو لٹھ مارے وہ گر گیا اس کی جیب میں سے پانچ روپے نکال لئے اور تلوار چھین لی۔ اسی اثناء میں کچھ دوڑنے کی آواز آئی تو وہ سب کے سب فرار ہو گئے پھر جا کر دیکھا تو سب کے چوٹیں لگی ہوئی تھیں۔ سب کے پاس کچھ نہ چھوڑا سب لوٹ کر لے گئے۔ انتی

دیر میں گاؤں والے آ گئے اُن سے ہر چند کہا گیا کہ تم اُن کا تعاقب کرو مگر
نہ مانا کہا جب تک پولیس کا آدمی ہمراہ نہ ہو ہم کھوج نہیں نکل لیتے۔ میرا سب سامان کپڑا
زیور وغیرہ سب لے گئے۔ کچھ نہ چھوڑا۔ فقط ایک پرانا برقعہ جو پرانے کپڑے کا سفر کرنے
کے واسطے سیا تھا وہ چھوڑ گئے۔ رات بھر اُسی جگہ سب پڑے رہے صبح اُٹھ اُٹھ
کر اُن چوروں کا سراغ دیکھنے لگے کہ کدھر کو گئے ہیں میں بھی ڈھونڈھتا ہوا کوئی دو
سو قدم گیا تو وہاں دیکھا کہ میرے دونوں صندوقچے ٹوٹے ہوئے پڑے ہیں۔ اور
پاندان بھی ٹوٹا ہوا پڑا ہے۔ بیگ پھٹے ہوئے پڑے ہیں۔ کپڑے ندارد۔ زیور نقد روپیہ
وغیرہ کچھ نہیں مگر وہ ڈاکو میرے سر پر ایک احسان کر گئے کہ آج تک اُن کا شکر گزار
ہوں میں نے صدہا دعائیں اُن کو دیں کہ خدا اُن کا بھلا کرے۔ میری ساری عمر کی کمائی دہ
چھوڑ گئے۔ میرے جواہرات میں سے ایک نگینہ انہوں نے نہیں لیا۔ میں کیا دیکھتا ہوں
کہ جزدان جو نیا چھینٹ کا میں نے سلوایا تھا وہ تو اتار کر لے گئے اور میرے جتنے
مسودات غزلوں اور قصائد کے اور قلمی دیوان میرا ایک جا رکھ کر اوپر پتھر رکھ گئے۔ اسی
کی تلاش میں میں نکلا تھا۔ بس یہ دیکھ کر مجھے اتنی خوشی حاصل ہوئی کہ حد سے بے حد گویا
میرا سب مال اسباب مجھ کو مل گیا۔ میں نے خوشی خوشی وہ کاغذات اپنے اٹھا لئے اور باقی
سب سامان اپنا وہیں پڑا رہنے دیا۔ اور وہاں سے آ کر سب آدمیوں سے کہا کہ بھائی میری
دولت تو مجھے مل گئی وہ پوچھنے لگے کیا دولت ملی۔ میں نے کاغذات دکھائے اور
کہا جا کر اپنی چیز تلاش کرو سب پہنچ گئے۔ جو کچھ ٹوٹا پھوٹا پرانا جس جس کا تھا۔ وہ
سب نے پہچان لیا اور اسی طرح پڑا رہنے دیا۔ سہ پہر کو جب صاحبزادے عبدالرحیم خاں
صاحب فوجدار ریاست موقع واردات پر پہنچے ہیں تو وہ اٹھوایا گیا۔ پھر واپس ٹونک

کو جانا پڑا۔ اور فوجداری میں اظہار لکھائے۔ آٹھ روز کے بعد گھوڑا گاڑی میں گھر کے
آدمیوں کو سوار کرا کے ٹونک کو آیا۔ سال بھر کے بعد میرے پاس گھوڑی تھی۔ وہ
فروخت کرنے کو جے پور کے میلے میں لے گیا تھا۔ وہ میلے میں بندھی ہوئی تھی
ایک دن صبح کا وقت ہے جا کر گھوڑوں کو مل رہے ہیں۔ پچھاڑی میں گھوڑوں کی
الاؤ تھا۔ اس پر میں بیٹھا ہوا چائے پکا رہا تھا۔ آدمی دودھ لینے کو گیا ہوا تھا کہ ناگہاں
میرے دامن کو آگ لگی۔ اور وہ دامن بھڑک گیا۔ میں نے ہاتھوں سے اُسے بجھایا۔
دوسرا دامن بھڑک اٹھا۔ میں بجھانے لگا مگر پر سے انگرکھا بھڑک اُٹھا۔ میں اُٹھ کر بھاگا سامنے
سائیس گھوڑے مل رہے تھے۔ اُن سے کہا۔ ارے دیکھتے ہو تم بجھاتے نہیں اُنہوں
نے دوڑ کر میرے کپڑے پھاڑ کر پھینک دیئے۔ انگرکھا کرتہ سب جل گیا۔ پیٹ اور
کمر اور شانے اور دونوں ہاتھ جھک کر کباب ہو گئے اور آب ہوا لگی اور اُس میں سوزش
پیدا ہو گئی اور مجھے غش آ گیا۔ جیون علی میرے داماد موجود تھے جلدی سے شفاخانہ
میں دوڑے گئے اور وہاں ایک ہنڈیا میں کچھ پانی میں ملی ہوئی دوا لائے۔ اور زخموں
پر ملی۔ اور کچھ دوا لائے۔ مجھے پلائی کہ مجھے تسکین ہوئی اور کرایہ کی گاڑی کر کے مجھے
مجھے گھر لائے۔ گھر میں دیکھتے ہی رونا پیٹنا پڑ گیا۔ تمام پشت پر ایک بڑا آبلہ پڑا ہوا تھا
غرضکہ شفاخانہ کا علاج ہوا تین ماہ میں تندرست ہوا۔ تمام دنیا میں موت کی خبر اُڑ
گئی تھی حتے کہ ٹونک میں بھی خبر پہنچ گئی تھی کہ وہ مر گیا۔ لیکن خدا نے فضل کیا۔ جب
میں ٹونک گیا ہوں تو سب میرے دوست ملنے آئے اور والی نہایت خوش ہوئے
میرے بدن کی کھال جہاں جہاں سے جلی تھی وہ سب اُدھڑ گئی تھی۔ پہنچوں تک
ہاتھوں کا چمڑا سب اُتر گیا تھا۔ فقط گوشت و استخوان رہ گئے تھے اس علالت

ہیں میر جیون نے میری بڑی خدمت کی۔ مجھے اُٹھانا بٹھانا۔ کھانا کھلانا سب وہی کرتے تھے۔ کیا خدا کی قدرت ہے کہ میری تو خبر گیری اس بندۂ خدا نے پوری پوری کی۔ مگر اُن کی خبر میں نہ لے سکا۔ میں جب ٹونک گیا وہ بیمار پڑ گئے۔ پندرہ روز کے بعد اُن کا انتقال ہو گیا۔ ہنوز پہلے زخم دل کے بھرنے نہ پائے تھے کہ یہ صدمۂ عظیم داماد کا ہوا۔ چار بچے چھوٹے چھوٹے تھے۔ کیا صدمہ ہوا کہ کمر ٹوٹ گئی۔ یارب العالمین میں بوڑھا۔ مرنے کو تیار بیٹھا ہوں۔ جوان بیٹی بیوہ ہوئی۔ یہ بچے کیونکر پرورش پائیں گے۔

سجّاد مرزا کی وفات

بس اسی صدمہ میں تھا کہ فلک غدار ستمگار نے کہا کہ اس پر صبر کئے بیٹھا ہے۔ ایسا صدمہ جان کاہ اور زخم شمشیر دل شگاف لگایا جائے کہ زندگی تلخ ہو جائے۔ میر جیون علی کے مرنے کے بعد ایک سال کے چھوٹی لڑکی کی شادی قرار پائی تھی۔ سجاد مرزا جب سوائی مادھو پور میں سنہ ۔۔ء میں نوکری پر تھا۔ مجھے لکھا آپ کچھ سامان اور زیور پارچہ وغیرہ کا کر کے بھیجئے اور میں بھی کچھ بندوبست کرتا ہوں۔ ادھر میں رخصت لے کر گھر کو جاتا ہوں۔ اور آپ یہ سامان وغیرہ لے کر گھر پر آجائیے۔ لڑکی کی شادی ہو جائے۔ غرضکہ میں نے بندوبست روپیہ وغیرہ کا کر کے کچھ زیور چاندی کا اور کوئی اسّی روپیہ کا کپڑا ریشمی۔ گلبدن۔ اطلس وغیرہ کچھ سفید خرید اور پچاس روپے کا گوٹہ کناری وغیرہ بہم کر لیا اور کچھ اور روپیہ کا انتظار تھا۔ وہ قرض نکلوایا تھا کہ وہ دستیاب ہو جائے تو میں جے پور چلا جاؤں۔ وہ کمبخت ساہوکار ایسا ملیچ تھا کہ روز آج کل کرتا تھا۔ اس اثنا میں مجھ سے پہلے وہ رخصت لے کر جے پور پہنچ گیا۔ وہاں جاتے ہی جنرل سپرنٹنڈنٹ نے اس کی بدلی بوروانے کی کر دی۔ ہر چند اُس نے عذر کئے کہ میری بہن کی شادی ہے

میں نہیں جاسکتا۔ سپرنٹنڈنٹ درپے ہوگیا کہ ایک مہینے کے واسطے چلا جا۔ پھر
جے پور کی تبدیلی ہو جائے گی۔ قضا سر پر سوار تھی۔ میرے خط کی بھی راہ نہ دیکھی۔
اُس کی ماں نے ہر چند روکا کہ تو نہ جا۔ تیرا باپ اب آتا ہے۔ شادی ہو جانے دے پھر
جائیو۔ ایک نہ مانی۔ یہی کہا کہ ابا جی کے آنے میں دیر ہے۔ میں جب تک ہو آؤں گا۔ وہ
یہاں سے سوار ہو کر ندراونی مقام کھندیلہ پہنچا اور میں نے وہ سامان زیور اور
پارچہ گوٹہ کناری عبدالقادر خاں صاحب رسالدار کے بھائی کی معرفت گھر کو روانہ کیا اور
کہلا بھیجا کہ اسی ہفتہ میں آتا ہوں۔ ادھر سجاد مرزا کھندیلے میں پہنچا۔ وہاں جاکر سنا کہ ڈپٹی
صاحب تو مر گئے۔ یہ حیران ہوا۔ ہیں یہ کیا معاملہ ہوا۔ ابھی تو ڈپٹی صاحب نے مجھے بلوایا ہے
میری تبدیلی کرائی۔ یہ کیا ہوا۔ وہ مقام کندیلہ سے پانچ سات کوس پر بودہ دریبہ میں ہے
دو روز بعد وہاں پہنچا۔ تیسرے روز سجاد مرزا اور دوسرا اہلکار واسنگھ جس کی تبدیلی پر
یہ گیا تھا وہ اور ڈپٹی کا بھائی یہ سب کہندیلہ میں آئے۔ اُس شب کو سب ڈپٹی صاحب
کے مکان پر پڑ رہے۔ دوسرے روز ڈپٹی کا بھائی اپنے بھائی کے استخوانِ سوختہ لے
کر گنگا کو گیا اور سجاد مرزا کو کہہ گیا۔ کہ میں واپس آکر اپنے بھائی کا سامان تم سے
لے لوں گا تم حفاظت سے رکھنا۔ وہ تو وہاں سے رخصت ہوا اور سجاد مرزا نے
واسنگھ سے کہا کہ اب تم دفتر مجھے سنبھلوا دو۔ واسنگھ نے کہا کہ ایک دو روز
تم صبر کرو۔ میں دفتر سنبھلوا دوں گا۔ سجاد مرزا نے کہا وجہ حجت کی کیا ہے۔ تمہاری
تبدیلی ہو گئی اب دفتر کیوں نہیں سنبھلواتے۔ جاؤ تم اپنے علاقہ پر جاؤ۔ میرا دفتر مجھے سپرد
کرو۔ کہا آج تو نہیں سنبھلواتا کل سنبھلوا دوں گا۔ اس میں زیادہ تکرار کی نوبت پہنچی۔ سجاد
مرزا کو لوگوں نے خفیہ طور پر مشتبہ کر دیا تھا کہ اُس نے ڈپٹی کو زہر دے کر مارا ہے

اُس کمبخت (سجاد مرزا) کے مُنہ سے نکل گیا۔ سیدھی طرح دفتر سنبھلوا دو ورنہ ہتکڑی بیڑی ڈال کر شہر جے پور بھیجوں گا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کو خبر ہوگئی ہے، ڈپٹی کے مارے جلنے کی آؤ اس کا کام بھی کر و۔ پس اُس نے یہ چالاکی کی کہ پہلے تو اُس آدمی کو جو سجاد مرزا کے پاس تھا بہکا کر نکال دیا کہ وہ نوکری چھوڑ کر چلا گیا۔ اب یہ دو بچے رہ گئے اور سجاد مرزا بشارت حسن اور اشتیاق حسین یہ دونوں چھوٹے چھوٹے تھے۔ اُس دن سجاد مرزا تو دائرہ میں ایک ڈپٹی دوسرے رہتے تھے ان سے ملنے گیا۔ اور بشارت حسن گوشت بھون رہا تھا کہ واسنگھ آیا اور کہا کہ پانی ڈال گوشت جلتا ہی یہ اُٹھ کر پانی لینے گیا اور اس ظالم بے رحم نے سنکھیے کی پڑیا دیگچے میں ڈال دی اور چمچے سے چلا دی۔ جب یہ آیا تو وہ چمچا ہانڈی میں پھیر رہا تھا۔ اس نے پانی ڈال دیا۔ اور وہ اُٹھ کر چل دیا شام کو جب سجاد مرزا آیا ہے تو اُس نے پوچھا بچوں سے روٹی پکالی ہے۔ انہوں نے کہا ہاں ماموں روٹی پکالی ہے۔ ان تینوں نے بیٹھ کر روٹی کھالی۔ بس کھاتے ہی قے اور دست لگ گئے۔ آدھی رات گئے ذرا تھے دست ٹھیرے ہیں کہ واسنگھ نے پوچھا۔ اب تمہاری طبیعت کیسی ہے۔ کہا دل پر جلن ہے۔ کہا سکنجبین پی لو میں لاتا ہوں دوبارہ پھر اور سنکھیا سکنجبین میں ملا کر پلا دی۔ بس دوبارہ سنکھیا دینے سے حال تغیر ہو گیا۔ اب خیال کیا چاہیے کہ کیا عالم بیچارگی اور بے بسی کی موت ہے۔ عالم غربت۔ نہ کوئی دوست نہ شفیق رفیق نہ تیماردار نہ طبیب غمخوار نہ عزادار۔ سوائے بے کسی کے کوئی پرسانِ حال نہیں۔ سوائے دو بچوں خورد سال کے کہ وہ بھی اُسی حال میں گرفتار ہیں اُنہیں بھی قے دست لگے ہوئے ہیں غرض صبح ہوتے اُس کا کام تمام ہو گیا۔ تھانہ دار اور منشی تھانہ نے آ کر تجہیز و تکفین کی اور

اُن دونوں بچوں کو تھانہ میں لے جاکر دوا درمن کی کہ بیچارے جاں بر ہو گئے۔
ورنہ ان کا کام بھی تمام ہو جاتا۔ دوسرے روز منشی تھانہ نے ایک اونٹ کرایہ
پر لے کر اور ایک سوار کی حفاظت میں ان بچوں کو جے پور روانہ کیا اور دوسرے روز
شام کے وقت بچے گھر کو آئے۔ جب بچے محلے میں پہنچے ہیں اور سجاد مرزا مرحوم
کے ماموں احمد مرزا جان ایک دوست سے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے اُنہوں نے
بچوں سے پوچھا تمہارا ماموں کہاں ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ وہ مر گیا۔ یہ سنتے ہی وہ بیہوش
ہو کر گر پڑے اور محلہ میں ایک فریاد برپا ہو گئی زن و مرد ہمراہ ہوئے۔ بچے جب گھر
میں آئے تو تمام محلے کی عورات جمع ہو گئیں۔ باہر مردوں کا اجتماع ہو گیا۔ اب سب
بچوں سے حقیقت پوچھتے ہیں کیا ہوا کہو تو سہی۔ اب غریب بچے سہمے ہوئے اپنی مصیبت
میں آپ گرفتار ہیں۔ دبی زبان سے کچھ حقیقت بیان کی۔ ایک حشر برپا ہو گیا۔ صبح کو
احمد مرزا خاں نے مجھے خط لکھا کہ تم خط دیکھتے ہی چلے آؤ۔ سجاد مرزا کا حال غیر ہے
اس خط کو دیکھتے ہی روح جسم سے پرواز کر گئی۔ اسی وقت سرکار میں جاکر رخصت
طلب کی۔ شام کو اونٹ گاڑی میں سوار ہو کر جے پور روانہ ہوا۔ کمبخت اونٹ ایسے
ناقص تھے کہ وہ ایک چوکی بھی نہ چل سکے۔ رستہ میں وہ تھک کر بیٹھ گئے۔ گاڑیبان
دوسرے اونٹ لینے گیا۔ اس عرصہ میں نصف شب گذر گئی۔ گاؤں والوں نے
شکرم کو روک لیا کہ اس وقت روانہ ہونے دیں گے پہلے شکرم لٹ چکی ہے صبح
کو شکرم روانہ ہوئی نوابی میں جاکر اونٹ بدلوائے گئے میں نے کچھ کھانے کو بازار سے
لیا کھانے کو تھا مگر نوالہ حلق میں پھنسنے لگا۔ منہ سے نہ چلا۔ اسی اثنا میں ایک برات محلہ
والوں کی جے پور سے ٹونک کو جاتی تھی۔ وہ مجھے ملی میں نے اپنے بچوں کا حال پوچھا انہوں

نے کچھ دبی زبان سے ایسا بیان کیا، کہ اور بھی اوسان پراگندہ ہو گئے۔ غرضکہ پھر شکرم روانہ ہوئی۔ مگر اونٹ بہت خراب تھے وہ دوسرے روز صبح کو جے پور میں پہنچے اور میں شکرم میں سے اُتر کر گھر پر پہنچا۔ میری بی بی نے سب کو منع کر دیا تھا کہ کوئی تذکرہ کچھ نہ کرنا۔ میں گھر میں گیا تو سب خاموش تھے۔ اُسی وقت احمد مرزا خاں کو اور احمد سلطان کو بلوایا۔ میں ہر چند پوچھتا ہوں کوئی نہیں بتاتا یہی کہتے ہیں وہ کھندیہ میں ہے جب سب مرد جمع ہو گئے تو میں نے کہا خدا کے واسطے بتاؤ تو سہی ماجرا کیا ہے میں سمجھ گیا کہ بلاشک سجّاد مرزا مر گیا جو یہ سب خاموش ہیں۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں نے زور سے زمین پر سر دے مارا کہ میرے دماغ سے خون جاری ہو گیا اور میں نے کہا کہ اگر حقیقت بیان نہیں کرتے تو میں اپنے کو اسی وقت ہلاک کئے دیتا ہوں۔ تب عزیزوں نے میرے ہاتھ پکڑے اور کہا صبر کرو۔ ہم بیان کرتے ہیں۔ جب احمد مرزا خاں نے یہ حقیقت زبانی بچوں کی بیان کی تو میں چیخیں مار کر رونے لگا میری بھتیجی نے سجاد مرزا کے دونوں بچوں کو لا کر میرے آگے بٹھا دیا۔ وہ چھوٹا بچہ کوئی سوا برس کا تھا۔ اس نے کبھی مجھے نہ دیکھا تھا اور نہ میں نے اُسے دیکھا تھا۔ مگر جوشِ خون کی تاثیر دیکھو کہ وہ گھٹنیوں چل کر آ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ میں نے اُسے چھاتی سے لگایا اور دوسرا بچہ کہ وہ چار برس کا تھا اُس نے میری گردن میں ہاتھ ڈال دیئے۔ میں نے دونوں کو چھاتی سے لگایا تو جو آگ میرے سینہ میں بھڑک رہی تھی فی الجملہ تسکین ہوئی۔ احمد سلطان صاحب نے کہا کہ اب سجّاد مرزا ان بچوں کو سمجھو۔ یہ ان کی نشانی ہے تمہاری نسل قائم رہے گی اب ان کی پرورش کرو اگر تم بھی اپنے کو ہلاک کر دو گے تو یہ بچے کیونکر پلیں گے۔ غرضکہ بعد دو چار گھڑی کے جب میرے اوسان

درست ہوئے تو میں نے کہا کہ میں اب حکام کے پاس جاکر فریاد کرتا ہوں۔ میری بی بی کہنے لگی جو کچھ ہوا اب صبر کرو۔ مُردے کی مٹی عزیز کرو گے قبر کھود کر نعش نکلوائی جائے گی۔ میرا دل تو گوارا نہیں کرتا نالش فریاد نہ کرو۔ یہ لوگوں نے ڈرایا تھا۔ غرضکہ کسی نے مجھے کچہری نہ جانے دیا میں نے کہا اس کی فاتحہ درود تو کرو کہا کہ کل صبح تمہارے آنے سے پہلے رسم پھولوں کی ہو چکی کل سب عورات فراہم ہوئی تھیں اور باہر سب عزیز و اقارب دوست آشنا جمع ہوئے تھے بعد قرآن خوانی کے ختم پڑھوا دیا تھا پھول کل ہو چکے ہیں۔ غرض میں تو اپنی مصیبت میں مبتلا رہا۔ لوگ آتے تھے رسم فاتحہ ادا کرتے۔ دوسرے روز کچہری سے ہرکارہ آیا اور مجھ سے کہا کہ بچوں کو سپرنٹنڈنٹ جی نے بلایا ہے تم اُن کو لے کر چلو۔ غرض یہ کہ میں نے اُن دونوں لڑکوں کو سجاد مرزا کے ہمراہ تھے لے جاکر کچہری میں پہنچا۔ سپرنٹنڈنٹ کو اس امر کی اطلاع بیشتر ہی ہو چکی تھی اور آدمیوں نے مہاراجہ صاحب کو منتظر ایس بھی بذریعہ تار اطلاع دے کر اجازت قبر کھولنے کی منگا کر تحقیقات کے واسطے حکم بھیج بھی دیا تھا۔ یہ بچے گئے تو ان کو دلاسا دے کر بہ آہستگی سب حال دریافت کیا اور اظہار لکھوائے اور تحقیقات جاری ہوئی۔ عند التحقیقات عمل ڈاکٹری سے معدے متوفی سے سنکھیا برآمد ہوا۔ خون بے گناہ ثابت ہوا۔ جب میں نے جاکر کونسل میں عرضی دی کہ میرا بیٹا جوان نوکری سرکار میں مارا گیا ہے میں اس خون کا قصاص چاہتا ہوں اور مرحوم کی بی بی اور دو بچے خورد سال ہیں اُن کی پرورش ہونی چاہیے۔ اس عرضی پر حکم ہوا کہ بعد تکمیل مثل مقدمہ سائل کی دادرسی ہونی چاہیے اور قتل کی تحقیقات اول محکمہ گرامی میں ہوئی اور جنرل سپرنٹنڈنٹ نے اپنے مواجہ میں ایسی تحقیقات کی

کہ باید و شاید اور پھر نظامت میں مسل گئی۔ اور پھر فوجداری میں آئی اور مجھے اور بچوں کو طلب کیا گیا اور مسل کی تصدیق کی گئی۔ بعد اس کے میں اُس کے بچوں کو ہمراہ لے کر بابو راؤ کامتی چندر بہادر کے مکان پر پہنچا اور کہا کہ میرا بیٹا جوان بے قصور نوکری راج میں مارا گیا ہے۔ اور میں بوڑھا ہوں۔ کوئی دن کا مہمان ہوں۔ ان بچوں اور اُس کی بیوہ کی پرورش کون کرے گا۔ بابو صاحب نے اُس وقت دو ممبر کونسل کے اُن کے پہلو میں بیٹھے تھے۔ اُن سے دریافت کیا کہ یہ کیا کہتا ہے۔ اُن دونوں نے متفق اللفظ بیان کیا کہ اس کا بیان راست ہے کوئی شک نہیں۔ ہمارے یہاں اطلاع آگئی ہے اُسی وقت بابو صاحب نے فرمایا کہ ظہیر الدین تو رو نہیں۔ جے پور کا راج بے انصاف نہیں ہے۔ تیری اور تیرے بچوں کی پرورش کی جائے گی۔ اور قاتل کو ایسی سزا دی جائے گی کہ تیرے آنسو پچھ جائیں گے۔ تیرا بیٹا نہیں مارا گیا ہے۔ میں خود مدعی ہوں نیز صاحب ممبر کلکٹری موجود تھے۔ اُن کو حکم دیا کہ کاغذات دفتر کونسل کے نکلوا کر دیکھو ایک بار مہاراج رام سنگھ جی نے اس کے بیس روپے ماہوار بصیغہ روزینہ داران جاری کرنے کا مجھ کو حکم دیا تھا۔ وہ کاغذات نکلوا کر وہ بیس روپیہ جاری کر دو۔ پھر میں نے عرض کی کہ میں اپنے بیٹے کے خونبہا میں ایک پیسہ نہیں چاہتا۔ اگر کوئی لاکھ روپے نقد اور ہزار روپیہ مہینہ مجھے دے گا تو بھی میں نہ لوں گا۔ میرا لعل بے بہا مارا گیا ہے ہاں اگر راج کو پرورش منظور ہے تو اُس کے بچوں اور بیوہ کی پرورش کر دے۔ تو بابو صاحب نے فرمایا ایسا ہی ہو گا۔ چنانچہ چار ماہ تک دفتر کونسل میں ان کاغذات کا تجسس کیا گیا کچھ پتہ نہ چلا۔ چونکہ عرصہ کثیر منقضی ہو چکا تھا اور دفتر کئی جا منتقل ہو گیا تھا۔ وہ کاغذ برآمد نہ ہوئے۔ آخر الامر بابو صاحب نے مجھے بلا کر حکم دیا کہ میں مجبور ہوں

تیرے بچوں کی تقدیر سے وہ کا غذات تو دستیاب نہیں ہوئے اور تجھے منظور نہیں اب جو سجّاد مرزا کی تھانہ داری کی تنخواہ تھی اُس کا نصف بارہ روپیہ دو آنہ تیرے بچوں کا مقرر کیا گیا۔ اٹھارہ سال کی عمر تک بعدہٗ راج سے پرورش روزگار کی ہوگی چنانچہ اس حکم کی نقل بطورِ سند مجھے مل گئی میرے پاس موجود ہے۔ اُس سند میں لکھا ہوا ہے کہ مبلغ دوازدہ روپیہ بصیغہ روزینہ داران بنابر پرورش بیوہ و اطفال سجّاد مرزا متوفی ظہیر الدین کو ملتے ہیں اور بعد وفات ظہیر الدین اُس کے بچوں کو اٹھارہ برس کی عمر تک ملیں گے۔ وہ روزینہ میرے بچوں کو گھر پر ملے جاتا ہے۔ اور مسمی دانشکھ قاتل سجّاد مرزا کی نسبت سزائے دائم الحبس تجویز ہو کر جیل خانہ سپرد کیا گیا۔ وہ محبوس ہے۔

بس اس صدمۂ جانکاہ نے میری کمر توڑ دی اور زندگی تلخ کردی ہوش و حواس میں اختلال واقع ہوگیا۔ دل و دماغ منتشر ہوگئے۔ لطفِ زندگی جاتا رہا۔ اُس روز سے میری بصارت اور سماعت میں فرق آگیا۔ اب آنکھوں سے سوجھتا نہیں کانوں سے بالکل بہرا بھنڈ ہوگیا ہوں۔ جسم پر سوائے استخوان اور پوست کے گوشت کا نام نہیں رہا۔ بے حیائی سے زندگی بسر کر رہا ہوں۔ جائے غور ہے کہ ایسی حالت میں کوئی شعر کہہ سکتا ہے ❖

ٹونک میں شعر و شاعری

اب تتمۂ حالات شعر و سُخن مقام زمانۂ قیام ٹونک معرض بیان میں لائے جاتے ہیں۔ ٹونک میں اکثر شعر و سُخن کے لکھنے اور پڑھنے کا اتفاق رہا۔ اور بہت سی غزلیں لکھی گئیں۔ اکثر مشاعرے مواجہ نواب صاحب بہادر میں ہوئے خدا کی عنایت سے آج تک

کسی کی غزل فقیر کی غزل پر سربر نہ ہوئی ۔ تمام اہلِ ٹونک اعلےٰ ادنےٰ موجود ہیں۔
بڑے بڑے زور لگا کر لوگ لکھ کر لائے اور جب آخیر میں میری غزل پڑھی گئی۔
سب سرد ہو گئے ۔ اکثر منصف مزاجوں نے اپنی غزلیں سرِ مشاعرہ چاک کر ڈالی ہیں
بلکہ بارہا ایسا ہی اتفاق ہو گیا ہے کہ اکثر حضار نے اہلِ بزم کو اتناع کر دیا ہے۔ کہ
کوئی غزل کی داد نہ دینا اور پھر جب میں نے غزل شروع کی ہے تو جو لوگ پیچھے
اہلِ مشاعرہ کے کھڑے ہیں اُن کا شور تحسین و آفرین ایسا بلند ہوا ہے کہ حسّاد کا رنگ
فق ہو گیا ہے۔ بہت سے معرکہ ایسے بھی گزرے ہیں۔ چنانچہ ایک بار نواب صاحب
کے مواجہہ میں مشاعرہ ہوا اور اہل مشاعرہ نے اچھی اچھی غزلیں پڑھیں۔ میرے شاگردوں
نے بھی بہت اچھی اچھی غزلیں لکھی تھیں غرضکہ جب افتخار حسین خاں صاحب مضطر[1]
نے غزل پڑھی ہے تو غزل اُن کی بہت نادر تھی ۔ اُن کے جانبداروں میں سے جو
لوگ تھے ۔ اُنھوں نے بڑے نعرے سبحان اللہ کے لگائے اور ہر شعر پر یہ بیان

[1] افتخار حسین مضطر خیر آبادی۔ جو بسمل خیر آبادی کے شاگرد امیر مینائی کے چھوٹے بھائی تھے۔
جے پور میں وکیل تھے نواب ابراہیم خاں پہلے بسمل سے اصلاح لیتے تھے اُن کی وفات کے بعد
مضطر خیر آبادی سے اصلاح لینے لگے۔ مضطر کی یہ غزل بہت مشہور ہے ؎

میں وہ قلبِ مضطرب ہوں جسے کل کبھی نہ آئے
وہ نہالِ بے ثمر ہوں جو پھلوں تو پھل نہ آئے

مقطع ہے ؎

نہ تم اُن کو پوجو مضطر کہ یہ بُت ہیں چند روزہ
تم اُسی خدا کو پوجو کہ جسے اجل نہ آئے (نظیر)

ہوتا ہے کہ کیا کہنا ہے۔ کوئی شاعر اب کیا کہے گا۔ قلم توڑ دیا ہے۔ ایک شہرت سی شہرت ہو رہی ہے کہ میں کیا بیان کروں۔ حالانکہ میرے شاگرد احمد سعید خاں عاشق کی غزل مضطر کی غزل سے کم نہ تھی۔ بلکہ مذاقِ زبان میں بڑھی ہوئی تھی۔ قصہ کوتاہ آخر کو جب میری نوبت آئی تو میں نے بیان کیا سُنو صاحبو! تم صاحبوں کی جوان طبیعتیں۔ دلوں میں نئی نئی اُمنگیں۔ سب طرح کی فارغ البالی۔ دل و دماغ تمہارے صحیح اور درست ہیں میں بوڑھا آدمی ہوش و حواس تک درست نہیں۔ دل و دماغ میں طاقت نہیں۔ ہزارہا صدمے قلب و جگر پر پڑے ہیں اب کیا شعر کہوں گا۔ اور تمہارے مضمون کہاں سے لاؤں گا۔ مجھے تو معاف ہی رکھیئے تو بہت مناسب ہے۔ اندر سے نواب صاحب نے حکم دیا نہیں غزل پڑھنی پڑے گی جیسی کہہ کرلائے ہو پڑھو۔ تمہاری غزل کے واسطے تو مشاعرہ ہی مقرر ہوا کرتا ہے۔ غرضکہ مجبور میں نے غزل شروع کی اور مطلع غزل پڑھا بس غزل کا مطلع سُنتے ہی ایک شور مچ گیا اور مرزا محمد علی خاں صاحب ممبر کونسل نے پکار کر کہا۔ کہ اُستادی کے یہ معنی ہیں کہ ایک مطلع ایک دیوان کے برابر ہے۔ وہ صاحب۔ جو فرماتے تھے کہ قلم توڑ دیا ہے۔ اب انصاف سے فرمائیں کہ مطلع کہاں پہنچا ہے سو سُنار کی اور ایک لوہار کی وہ مطلع یہ تھا ؎

وہ جھوٹا عشق ہے جس میں فغاں ہو
وہ کچی آگ ہے جس میں دھواں ہو

اُس وقت افتخار حسین خاں صاحب نے فرمایا کہ انہیں باتوں سے تو یہ لوگ اُستاد مانے جاتے ہیں۔ ایسے اشعار سے سکہ شاعری کا بیٹھتا ہے۔

غرضکہ صدہا اس قسم کے معرکے رہے۔ حالانکہ سوائے ایک نواب سلیمان صاحب[1] اسدؔ اور بسمل صاحب اور مضطر صاحب سب میرے دوست احباب تھے۔ خدانخواستہ میرے اُن کے درمیان کبھی چشمک یا تنازعہ کسی طرح کا نہیں واقع ہُوا۔ مگر ہاں جہاں حسّاد لکھنؤ کے نام پر مرنے والے جن کے باپ دادا کو خواب میں بھی لکھنؤ کی زیارت نصیب نہ ہوئی ہوگی اُن کا یہ عالم تھا کہ رشک وحسد میں جل کر کباب ہوتے جاتے تھے۔ خدا واسطہ کا بیر۔ چنانچہ روزِ اوّل جو میں نے قصیدہ سالگرہ کا سُنایا اور جس کی نسبت یہ کہا گیا تھا۔ کہ یہ اُستاد ذوقؔ کا قصیدہ ہے۔ میرے شاگرد صاحبزادہ احمد سعید خاں نے اُس کی صبح کو یہ کام کیا کہ کہیں سے دیوانِ ذوقؔ مانگ کر لائے اور اس کو بجائے خود میرے قصیدہ سے ملا کر دیکھا تو زمین آسمان کا فرق اُس کی تشبیب میں تھا اُستاد کے قصیدہ میں غسلِ صحت کی تشبیب تھی میرے قصیدہ میں سالگرہ کی وہ اُس سے کیونکر مطابق ہو سکتا تھا۔ علاوہ بریں مدح میں بڑا اختلاف۔ وہ میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا کہ ذرا آپ میری خاطر سے تھوڑی دور تکلیف کیجئے اور اُن صاحب کے مکان تک چلیے۔ میں نے کہا کہ میاں جانے بھی دو۔ حسّاد ایسا ہی کیا کرتے ہیں وہ مُصر ہو گئے کہ میں لے ہی چلوں گا۔ غرضکہ وہ مجھے ہمراہ لے کر وہاں پہنچے، اور جا کر کہا کہ لیجئے حضرت وہ چور ڈھور سب موجود ہیں۔ یہ دونوں قصیدے بھی موجود ہیں اور کہنے والے بھی۔ جو حضرات یہ فرماتے تھے کہ اُستاد کا قصیدہ پڑھ دیا ہے۔ وہ کون صاحب ہیں۔ ایک صاحب بولے کہ ہم ہیں

---

[1] نواب سلیمان خاں اسدؔ میر مظفر علی اسیرؔ لکھنوی کے شاگرد اور صاحبِ دیوان تھے نوابصاحب نے ظہیرؔ کی طرح انہیں بھی خاص طور سے ٹونک بلایا تھا۔ (نظیرؔ)

ہم کہتے ہیں - احمد سعید خاں آپ کس واسطے اُستاد کا قصیدہ بتاتے ہیں - جواب - زبان اُستاد کی اور متانت اور مضامین پکار رہے ہیں - زمانہ حال میں کوئی نہیں کہہ سکتا ہے اُس وقت وہ دونو قصیدے پڑھوائے گئے اور اُن حضرات کو قائل معقول کیا گیا +

نواب ابراہیم علی[1] نواب ابراہیم علی خاں بہادر فرمانروائے ٹونک کو خداوند عالم زندہ اور سلامت رکھے اور اُس کے ملک کو آباد اور سرسبز

نواب صاحب موصوف جمیع محامد ذاتی وصفاتی سے آراستہ پیراستہ ہیں - نواب صاحب ممدوح کو نفوس قدسیہ میں شمار کرنا چاہیئے - نواب صاحب سارئیس باشرع متقی و پرہیزگار - عابد و زاہد باخدا - عاشق رسول - دیندار - شریف پرور - عدل گستر رحیم - کریم - جواد - فیاض - بہادر - سخی - دریا دل - کریم النفس - خدا ترس - وسیع الاخلاق

---

[1] نواب ابراہیم علی خاں خلیل ۱۸۴۳ء میں پیدا ہوئے - اپنے والد نواب محمد علی خاں کی معزولی کے بعد ۱۸۶۶ء میں مسند آرائے ریاست ہوئے - انہیں نعت گوئی کا بھی شوق تھا - ذیل میں آپ کی ایک نعت کے چند اشعار درج کرتا ہوں ؎

دیکھ پائے گر جمالِ روئے انور آفتاب	والضحیٰ پڑھنے لگے حیران ہو کر آفتاب
روشنی کا ایک مرکز ہے فلک پر آفتاب	ہیں یہاں ایک ایک جلوے میں بہتر آفتاب
آپکے پرتو سے اُس نے پائی ہیں آرائشیں	ہے جبینِ صبح پر چاندی کا جھومر آفتاب
آسماں والوں کو بھی ہے پاسِ خاطر آپ کا	اک اشارہ جب کیا آیا پلٹ کر آفتاب
آپ ہی کی چاند کو رہتی ہے شب بھر جستجو	آپ ہی کو ڈھونڈھتا رہتا ہے دن بھر آفتاب
آپ محشر میں اگر بہرِ وضو فرمائیں عزم	آفتابہ لے کے دوڑے تابہ کوثر آفتاب

(نظیر)

دوستدار فی زمانناد دنیا میں نہیں۔ میرے قلم کو طاقت نہیں کہ اُن کے اوصافِ حمید تحریر کر سکے۔ اوّل تو یہ کہ نواب صاحب بہادر کے ثروت و حشمت و ریاست کے باوجود، بوئے رعونت اور تمکنت پاس ہو کر نہیں نکلی۔ سراپا عجز و انکسار بلکہ خلقِ مجسّم کہنا چاہیئے۔ زہد و صلاح کا یہ حال ہے کہ کبھی نمازِ سحر تک قضا نہیں ہوئی اوقاتِ شبانروزی یادِ الٰہی میں بسر ہوتی ہے۔ شب کو کل چار گھنٹے آرام کرتے ہوں گے چار بجے بیدار ہو جاتے ہیں۔ خدمتگاروں کو حکم ہے کہ مجھے جگا دو۔ صبح کو بیدار ہو کے اور حوائج ضروری سے فارغ ہو کر نماز میں مشغول ہوئے باغ میں مسجد ہے اُس میں نماز پنجگانہ با جماعت ادا کرتے ہیں میں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ گھڑیوں مسجد میں پڑے ہوئے تضرع و زاری کرتے ہیں رحم و ترحم کا یہ حال ہے کہ شاید کسی خدمتگار سے کچھ قصور سرزد ہو گیا اور اُسے کوئی طمانچہ غصہ میں مار بیٹھے تو پھر اُس سے قصور معاف کراتے ہیں کہ میاں اللہ کے واسطے میرا قصور معاف کر دے۔ سخاوت کا یہ حال ہے کہ باوجود اس بے دستگاہی کے کہ پانچہزار روپے اُن کے دستِ خرچ کے مقرر ہیں اُس میں بہت سے لوگ بیش قرار درباری ہیں۔ اور اُن کی اولاد بھی اُس میں شریک ہے جو کچھ داد و دہش ہوتی ہیں اُس میں سے کرتے ہیں۔ ریاست کے روپے سے کچھ تعلق نہیں سوائے نقد وغیرہ کے۔ پوشاک اسلحہ جو وقت پر موجود پایا بخش دیا۔ زبان پر کبھی کوئی کلمہ تہذیب کے خلاف نہیں آتا۔ مرنج و مرنجاں کسی متنفّس کو اُن کے دم سے تکلیف نہیں پہنچتی۔ عملداری ٹونک میں مقدور ہے کسی کا کہ مرتکب منہیات کا ہو جائے۔ مسکرات وغیرہ کا پورا پورا انتظام ہے۔ رمضان المبارک میں کیا مجال ہے کہ بے عذر شرعی کوئی ترکِ صوم و صلوٰۃ کر سکے۔ کوچہ کوچہ محتسب ہوتا ہے جس کو تارک الصّوم پاتا ہے فی الفور گرفتار کر کے کوتوالی میں پہنچایا جاتا ہے

اور پھر وہ تا اختتامِ ماہ مبارک کوتوالی نظر بند رہتا ہے وہاں اُس سے روزے رکھوائے جاتے ہیں اور رویتِ ہلال شوال پر رہا کر دیا جاتا ہے۔ زنانِ فاجرہ کو گرفتار کرکے نکاح کرا دیئے جاتے ہیں۔ نواب صاحب بہادر کو مولود شریف کا ازحد شوق ہے سال میں ایک بار مجلسِ مولود شریف منعقد ہوتی ہے۔ علماء۔ فضلا۔ صاحبزادے۔ عمائد لازم سب فراہم ہوتے ہیں۔ کھانا بہت عمدہ کھلایا جاتا ہے۔ شیرینی تقسیم ہوتی ہے ربیع الاوّل میں بارہ روز مجلس نبوی منعقد ہوتی ہے اور نظیر باغ کی نہایت طیاری ہو جاتی ہے۔ جھاڑ فانوس گلاس وغیرہ کی روشنی بکثرت ہوتی ہے اور اذنِ عام ہوتا ہے۔ تمام شہر کی خلقت فراہم ہوتی ہے اور سیر سیر بھر شیرینی سب کو تقسیم ہوتی ہے۔ سات روز تک مردانہ محفل رہتی ہے اور پانچ روز زنانہ مجلس ہوتی ہے۔ اُس روز حکم ہے۔ کہ رات کو کوئی فرد گھر سے باہر نہ نکلنے پائے۔ مستورات پردہ نشین سب مجلسِ مولود میں جاتی ہیں۔ اور وہ مولود شریف نظم و نثر نواب صاحب کی تصنیف سے ہے۔ اور احادیث و روایات صحیحہ کا ترجمہ ہے۔ اسی جزو کی اُس کی ضخامت ہے وہ پڑھا جاتا ہے۔ شعر و شاعری کا ازحد ذوق ہے اور کلام بھی عمدہ ہے۔ زیادہ توجہ حمد و نعت کی جانب ہے۔ مگر افسوس اس امر کا ہے کہ ریاست کے انتفاع میں بہت نقصان اور تنزّل ہو گیا ہے اور ریاست بدرجۂ غایت مقروض ہو گئی ہے۔ بائیس لاکھ کی ریاست اور پیداوار نو دس لاکھ کی رہ گئی ہے۔ وجوہات باعثِ تنزّل ریاست واقع ہوئے ہیں۔ بڑی خرابی تو یہ ہے۔ کہ علاقہ ریاست ٹونک کا منتشر پرگنات پر واقع ہوا ہے ایک پرگنہ دوسرے پرگنہ سے علیحدہ ہے اور عملداری ہائے غیر سے ملحق ہے۔ اور صدہا

کوس کے فاصلہ سے واقع ہوا ہے۔ بیچ میں اور ریاستیں آگئی ہیں۔ جو عامل و ناظم جاتا ہے۔ اپنی شکم پُری سے غرض رکھتا ہے۔ ریاست کی خیرخواہی اور تباہی رعایا سے کچھ مطلب نہیں۔ جب رعیت پر جبر و تعدی ہوتا ہے رعیت برخاست ہوکر اور ریاست میں چلی جاتی ہے۔ مثلاً پرگنہ سرونج علاقہ ٹونک تو برباد ہوگیا اور بھوپال آباد ہوگئی۔ دوم یہ کہ خرچ اخراجاتِ خاندان بہت بڑھ گئے اب گنجائش اتنی نہیں کہ نواب صاحب اپنی اولاد کا کچھ مقرر کریں۔ جن صاحبزادگان کی ماؤں کی جو تنخواہ ہیں۔ وہ اُس میں بسر کرتے ہیں۔ اُن کی ذاتی کچھ آمدنی نہیں۔

مورثِ اعلےٰ نواب محمد امیر خاں صاحب اوّل رئیس ٹونک کے بارہ بیٹے اور کئی بیٹیاں ہیں اور تنخواہ اُسی حساب سے تقسیم ہوتی چلی آئی۔ اب ریاست میں کیا رہ گیا ہے خاندان کے مصارف میں برابر ہو لی برائے نام ریاست ہے۔ علاوہ ازیں ریل کی سڑک نکلنے سے اور رہا سہا ستیاناس برباد اور تباہ کردیا۔ مگر تاہم نواب صاحب کا علوہمت اور صرف خیر و خیرات نذر و نیاز وغیرہ میں کسی طرح فرق نہیں آیا بدستور سابق اب تک ہیں جو مسافر آجاتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ لے ہی نکلتے ہیں۔ ہمیشہ اعراب بطور گداگر کے آتے ہیں۔ اور روپیہ درخت کہنہ وغیرہ لے جاتے ہیں۔ کوئی ٹوٹا پھوٹا شاعر بھی جا نکلتا ہے۔ اور اُس کی نواب صاحب تک رسائی ہوجاتی ہے۔ تو نوکر نہیں ہوتا تو زادِ راہ مِل جاتا ہے۔

نواب صاحب کو شعر و سُخن کا شوق از حد ہے قصیدہ بغیر صلہ کے سُننا حرام جانتے ہیں بخلاف امرائے حیدرآباد۔ نواب صاحب ممدوح شاعر کی قدر و منزلت و اعزاز فرماتے ہیں۔

میں ریاست ٹونک میں بہت اچھی طرح بسر کرتا تھا تیس روپیہ ماہوار نواب صاحب دیتے تھے۔ دس روپیہ ماہوار بیگم صاحبہ دیتی تھیں۔ خدمتگار کی تنخواہ صاحبزادہ احسان اللہ خاں صاحب دیتے تھے۔ اُنہیں کے مکان میں رہتا تھا کرایہ مکان کا نہ دینا پڑتا تھا۔ سواری احسان اللہ خاں کے یہاں موجود تھی۔ جہاں چاہتا تھا چلا جاتا تھا۔ ایک تانگہ سرکار میں سے تعینات تھا۔ پندرہ روپیہ ماہوار خواجہ عبدالرحیم خاں صاحب ڈھاکہ سے بھیجتے تھے۔ اہل وعیال قریب تھے۔ جب چاہتا تھا چلا جاتا تھا۔ نواب صاحب بہادر نہایت اعزاز و احترام سے پیش آتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ میں فاصلہ سے الگ بیٹھا ہوں۔ اور نواب صاحب کی نظر پڑی ہے فرمایا یہاں قریب آجاؤ۔ ہر چند میں نے عذر کیا از راہِ قدر شناس فرمایا تم قریب آجاؤ تم بہرے ہو میرا کلام سمجھ میں نہیں آئے گا اور اپنے قریب طلب فرمایا ہے۔ ہر طرح عزت وحرمت سے بسر ہوتی تھی۔ بیٹھے بٹھائے گردش نصیب کی خواہ مخواہ وطن سے بیوطن ہو کر حسب ترغیب بعض احباب حیدر آباد میں چلا آیا اکثر دوستوں کے خطوط پہنچے حیدر آباد میں آجاؤ۔ یہاں کے امرا قدر دان ہیں۔ شعر وسُخن کا چرچا از حد ہے۔ تمہارے کلام کے بہت لوگ مشتاق ہیں۔ شعر وسخن کی بڑی قدر دانی ہے۔ غرضکہ میرا قصد بھی حیدر آباد کا ہوا۔ زیادہ تر خیال اس امر کا دامنگیر ہوا کہ میری عمر تو پوری ہو چکی ہے مگر بچوں کا کچھ فکر کرنا چاہیئے اور کچھ نہ ہوگا۔ تو ان کے روزگار کی صورت تو نکل آئے گی۔ اس خیال سے قرض دام کا بندوبست کیا کچھ پارچہ پوشیدنی تیار کرائے چار ماہ کی رخصت لے کر جے پور ملنے آیا مگر جب میں آیا تو بی بی کی طبیعت علیل پائی

آٹھ روز کے اندر اندر اُن کا انتقال ہو گیا۔ یہ خانہ ویرانی کی صورت پیش آئی جو کچھ روپیہ کا بندوبست زادِ راہ کا کر کے لایا تھا۔ وہ تجہیز و تکفین میں صرف ہُوا اب ارادہ فسخ ہو گیا میں نے جے پور سے لکھ بھیجا کہ مجھ پر تو یہ واقعہ گزرا ہے۔ پھر تحریر گئی مشیتِ ایزدی میں دخل کیا ہے جو امر تقدیری تھا وہ ہُوا مگر آپ چلے آئیں +

دسواں باب

حیدرآباد دکن میں ورود

غرضکہ مجبور وہاں سے روانہ ہوا۔ بڑودے ہوتا ہوا یہاں آیا۔ راجہ بھگوان سہائے بہادر نے مجھے باغ میں اُتروایا۔ دو آدمی میرے ہمراہ آئے تھے یہ سب بار میرا اُن پر پڑ گیا۔ اوّل اوّل تو میرا خرچ اسّی نوے روپے کے قریب ماہوار کا تھا۔ مگر پھر ایک صاحب کو میں نے رخصت کر دیا۔ اُس کو راجہ بھگوان سہائے بہادر نے رخصتانہ دیا۔ پورے ایک سال تک راجہ بھگوان سہائے بہادر میرے کفیل رہے اور میرے کُل اخراجات اُن کے ذمہ تھے۔ اُسی ایّام میں سرکار دولت مدار آقائے نامدار کی نذر ہو گئی میں نے قصیدہ مدحیہ سُنایا۔ بعد وقت رخصت فرمایا میں پھر تم کو بلواؤں گا۔ اِسی اثنا میں روانگی دہلی کی تیاری ہو گئی۔ مہاراجہ صاحب اور اعلےٰ حضرت قدر قدرت دہلی تشریف لے گئے۔ اب میرا بھی ارادہ ہوا کہ تو بھی واپس وطن کو چلا چل۔ جن لوگوں نے بلوایا تھا۔ وہ کہنے لگے بے نیل مرام جانا کون دانائی ہے۔ صبر کرو تا واپسی

مہاراج کے دہلی سے رہنا چاہیئے۔ غرضکہ میں یہاں ٹھہر گیا تین مہینے کے بعد
مہاراجہ صاحب بہادر تشریف لائے۔ مولوی برتر صاحب دہلی سے وطن کو
چلے گئے۔ مجھ سے کہہ گئے تھے کہ میں جاکر رائے رایان بہادر سے کچھ تجویز
خرچ کرا کے بھیجتا ہوں اور یہاں یہ کہہ رکھا تھا کہ کچھ دستگیری مہاراجہ مرلی منوہر
صاحب کی طرف سے ہوگی اور کسی قدر رائے رایان بہادر دستگیری فرمائیں گے
مابقی مہاراجہ سرکار عالی بہادر مقرر فرمائیں گے۔ تیری گذر بخوبی ہو جائے گی وہ
سب کوری باتیں تھیں۔ ایک سوائے راجہ بھگوان سہائے بہادر کے کسی نے
بات تک نہ پوچھی۔ اب یہ صورت ہوئی مجھ سے کہا گیا نوکری کا ڈھب لگنا تو مشکل
ہے مگر رخصت بہت معقول طور سے ہو جائے گی۔ اسی امید میں آٹھ ماہ کا
عرصہ گذر گیا اور سب کوری باتیں اور دم وہاں سے ہی نکلے۔ آخر ٹونک سے تحریر
آگئی کہ تمہارا نام دفتر سے جدا کر دیا گیا۔ اب تم ٹونک آکر کیا کرو گے۔ جب میں
سب طرف سے مایوس ہو گیا تو جن صاحبوں نے مجھے بلایا تھا وہ منہ چھپانے
لگے۔ ملنا تک چھوڑ دیا۔ آخر میں نے سرکار خداوند نعمت کو عرضی لکھی اور اپنی
مصیبت اور انقطاع تعلق ٹونک کا حال لکھ کر سرکار کی خدمت میں بھیجی۔ اور
نیز داغ صاحب نے بھی سرکار میں لکھا۔ خداوند تعالےٰ سرکار دولت مدار کو تا ابد
سلامت رکھے کہ سرکار نے بخیال کبر سن اندھا۔ بہرا۔ اپاہج۔ بیکار محض سمجھ
کر از راہ ترحم میری پرورش فرمائی کہ اس زمانے میں روٹی نصیب ہو گئی۔ ورنہ
یار لوگوں نے تو دنیا سے کھونے میں کوئی کسر نہ رکھی تھی۔ اب گوشۂ عافیت
میں بیٹھا ہوا جو کچھ دال دلیا اور روکھی سوکھی روٹی نصیب ہوتی ہے بہ از ار

وقت و پریشانی نصیب اُسے غنیمت جان کر کھاتا ہوں۔ اور اپنے آقائے نامدار خداوند نعمت کو دعا دیتا ہوں۔ اور قدردانی حیدرآباد کی تو بخیر جن لوگوں سے مجھے توقع تھی وہ اندر اُن کا پھل نکلے۔ پھر جو کچھ رہی سہی حالت قدرِ سخن کی ہے۔ تو یمین السلطنت مدار المہام مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے دم سے ہے۔ البتہ مہاراج صاحب بہادر اس فن کے قدردان ہیں۔ اور سرکار میں اکثر شعرا ملازم ہیں اور نیز مہاراجہ صاحب بہادر کا کلام بھی اعلےٰ درجہ کا ہے۔ خود بھی ایسا فرماتے ہیں جس کا جواب نہیں۔ نظم و نثر فارسی اُردو بہت لاجواب ہے۔ اس کے علاوہ مہاراجہ صاحب بہادر جامع الکمال ہیں۔ ہر فن میں مداخلت تام رکھتے ہیں۔ حُسن اخلاق کی شہرت تو عالمگیر ہے۔ محتاج شرح و بیان نہیں ہے۔ فیاضی و دریادلی و داد و دہش و سیر چشمی و علوے ہمّت کا حال اظہر من الشمس ہے۔ سب سے صرف واصراف نذر و نیاز عرس بزرگان و مشائخین کا ہے۔ ان تقریبات میں بیدریغ علےٰ الحساب صرف فرماتے ہیں۔ ہزارہا روپیہ تیاری سامان عرائس میں اور پخت طعام نیاز میں صرف ہوتے ہیں۔ اور ہزارہا آدمیوں کو طعام ہائے لذیذ پُرتکلف کھلائے جاتے ہیں۔ اور تقسیم طعام بے دریغ ہوتی ہے۔ ؎

برین خوانِ یغما چہ دشمن چہ دوست

عُرس مولا علی رض

ان تقریبات کے علاوہ مہاراجہ صاحب بہادر جب کوہ مولا علی پر تشریف لے جاتے ہیں تو کئی کئی مہینے قیام فرماتے ہیں۔ تمام عملہ سرکاری اور ملازم سرکار اور محلّات وغیرہ ہمراہ ہوتے ہیں۔ سب کو طعام پُرتکلف دونوں وقت مطبخ سرکار سے بلے دریغ عطا ہوتا ہے

اور ہنگام عرس حضرت علی مرتضےٰ شیر خدا صلوٰۃ اللہ علیہ میں چند روز پیشتر از عرس اعلےٰ حضرت قدر قدرت فلک رفعت کیواں حشم بجلیس شیم رونق افروز کوہ مبارک ہوتے ہیں اور تمام حیدر آباد کی خلقت کا ازدحام ہوتا ہے اُس زمانہ میں کئی سو آدمی کا اجماع خاص و عام در دولت سرکار پر ہوتا ہے۔ خیمہ ہائے متعدد اِستادہ ہوجاتے ہیں۔ اکثر اربابِ نشاط و طوائف وغیرہ بھی حاضر ہوتی ہیں۔ اس اجماع کثیر و جم غفیر کو طعام سرکار سے تقسیم ہوتا ہے۔ دونوں وقت دیگیں کھانے کی پکتی ہیں اور تقسیم ہوتی ہیں۔ کئی روز تک یہ پخت جاری رہتی ہے۔ اور بعد عرس کے انعامات ہمراہیاں کو علی قدر مراتب مہاراجہ صاحب بہادر اشرفیاں تقسیم فرماتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت قدر قدرت خلد اللہ ملکہٗ زمانِ قیام میں دو تین بار بنگلہ سرکار پر رونق افروز ہوتے ہیں۔ بزمِ رقص و سرود برپا ہوتی ہے۔ روشنی کا سامان بخوبی ہوتا ہے۔ یہ مہاراجہ صاحب بہادر کی دریا دلی اور سیر چشمی اور بلند حوصلگی اور علو ہمت کا ایک نمونہ ہے جو معرضِ بیان میں آیا۔

آج کسی امیر یا رئیس کی یہ ہمت ہے کہ اس طرح بیدریغ صرف کرے گا۔ حیدر آباد میں بڑی بڑی سرکاریں اور جاگیر داران اولوالعزم ہیں۔ حالانکہ اُن کی آمدنی جاگیرات مہاراجہ صاحب کی جاگیر سے بدرجہا زیادہ ہے۔ مگر یہ ہمت اور حوصلہ کسی کا نہیں کہ اس طرح بے دریغ صرف کرے۔ غور کیا جاتا ہے تو مہاراجہ صاحب بہادر حاتم وقت ہیں۔ تونگری بدل است نہ بمال بزرگی بعقلست نہ بسال۔

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے اُن کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے

میں حبِ وطن سے حیدر آباد روانہ ہوا ہوں تو مجھے بڑی بڑی امیدیں قدردانی

حیدرآباد سے نکھیں میں جانتا تھا کہ سوائے ذات بابرکات اعلٰے حضرت قدر قدرت کے اگر ایک دو امیر کی سرکار میں تیری رسائی ہوگئی تو تیری گذر بخوبی ہو جائیگی کیونکہ گورنمنٹ حیدرآباد کی سرکار عالی جاہ ہے۔ آج ہندوستان میں سلطنت خیال کی جاتی ہے۔ اُس کی برابر کوئی ریاست نہیں اُس کا جاہ و حشم مصر اور ایران کی برابر شمار ہوتا ہے۔ وہاں بڑے بڑے امیر کبیر ہیں۔ پچیس پچیس لاکھ کے جاگیر دار ہیں۔ ہزار ہا روپیہ کے تنخواہ دار تو اہلکار ہیں۔ ایسے مقام پر پانچ چار سو روپیہ ماہوار کا روزگار ہونا کچھ دشوار نہیں۔ مجھے خیال ریاستہائے ہندوستان کا تھا۔ ہندوستان کے رئیس پانچ پانچ چار چار لاکھ کے جاگیر دار بیچارے آدھی لنگوٹی میں پھاگ کھیلتے ہیں۔ اُن کو کل لوازمہ ریاست اور تجمل جلوس ریاست کا رکھنا پڑتا ہے۔ اصطبل میں دس پانچ خاصہ کوتل ہزار روپیہ کی قیمت سے لگا کے پانچہزار تک موجود ہیں۔ فیل خانہ میں دو چار ہاتھی بھی ہیں اُس کے علاوہ سامانِ جلوس نوبت نقارہ علم ماہی مراتب فوج سپاہ سوار پیدل۔ توپ خانہ۔ مصاحبین اہلکار عملہ وغیرہ سب سامانِ ریاست موجود ہے۔ غرضکہ جب میں یہاں پہنچا ہوں تو میرا گمان فاسد نکلا۔ یہاں مقدمہ برعکس پایا۔ قدردانی تو بالائے طاق رہی روٹیوں کے لالے پڑھ گئے بقول سرکار دولت مدار ظہیر صاحب کو کس نے سبز باغ دکھایا۔ کہ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں آکر حیران و پریشان ہوئے ٭

میر محبوب علی خاں [1]

بہ نفس نفیس نہایت دانا مُدبر و ہوشیار روشن دماغ وروشن خیال۔ رحیم۔ رعیّت نواز۔ رعیّت دوست۔ رعیّت پرور۔ خلیق۔ وجیہ۔ خوش رو۔ خوش خو۔ سخن گستر۔ حق پسند بہمہ صفت موصوف

[1] مظفر الملک فتح جنگ نواب میر محبوب علیخاں نظام الملک آصف جاہ ششم ۱۸ اگست ۱۸۶۶ء کو پیدا ہوئے اور ۲۶ فروری ۱۸۶۹ء کو مسند آرائے ریاست ہوئے آپکی تعلیم وتربیت مختلف اوقات میں مولوی محمد خاں شہید۔ مولوی مسیح الزماں خاں۔ مولوی انوار اللہ خاں۔ مولوی اشرف حسین۔ منظفر حسین خوشنویس۔ مرزا نصر اللہ خاں۔ مسٹر کلارک۔ سٹر جنگ۔ افسر جنگ۔ مٹو خاں وغیرہ نے کی۔ آپ کو زبان عربی۔ فارسی۔ اُردو اور انگریزی پر عبور حاصل تھا۔ فنونِ سپہ گری کے بھی ماہر تھے آپ علماء و فضلاء اور اہلِ کمال کے قدردان تھے۔ سینکڑوں اہلِ علم اور باکمالوں کو آپ سے فیض پہنچا۔ مولوی سیّد احمد کو فرہنگ آصفیہ کی اشاعت کے لئے زرِ کثیر دیا۔ آپ ہی نے مولانا شبلی مولانا حالی۔ مولوی ڈاکٹر عبد الحق قدر بلگرامی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ مولوی عبد الحلیم شرر۔ ڈپٹی نذیر احمد۔ سیّد علی بلگرامی۔ پروفیسر شہباز۔ مرزا داغ اور مولانا ظفر علی خاں کی سرپرستی کی۔ مرزا داغ کو جو شعر وسُخن میں انکے اُستاد تھے۔ جو عزت۔ شہرت اور عروج حاصل ہُوا وہ اُردو زبان کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہُوا۔ آخر میں مرزا داغ کی تنخواہ ۱۵۰۰ روپیہ ماہوار تھی۔ تعجب ہے کہ حضرت ظہیر مصنف کتاب ہذا کی کما حقہٗ قدر افزائی نہ ہوئی۔ جیسا کہ اُن کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے۔

میر محبوب علیخاں آصف تخلص کرتے تھے اور اپنے اُستاد داغ کے رنگ میں غزل کہتے تھے ان کی ایک غزل کے دو اشعار لکھتا ہوں ؎

عاشق تیری زلفوں سے پریشان بہت ہیں ۔۔۔ بتاکتنی یہ لوٹتی ایمان بہت ہیں
کچھ اور ہو غم حضرتِ آصف کی بلا کو ۔۔۔ ہاں تیری محبت میں پریشان بہت ہیں

(نظیر)

ہیں۔ فی زمانا ابراہیم بک عادل شاہ ثانی کہنا چاہیئے اور نتیجہ رعایا پروری اور تالیف قلوب کا یہ رنگ ہے کہ تقریب میں رعایا اور ملازمین اپنے پاس سے زر کثیر صرف کر کے آرایش شہر و روشنی وغیرہ کا سامان فراہم کرتے ہیں اور محافلِ رقص و سرود گرم کر کے عیش و نشاط مناتے ہیں اور دل و جان سے اپنے بادشاہ مہربان پر نثار اور قربان ہیں۔

رعایائے حیدرآباد تمام و کمال خورسند و خوشحال متمول و مالا مال ہے۔ کسی طرح کی شاکی نہیں۔

آبادی شہر

بازار از کثرتِ خلائق ایک جہانِ دیگر تصور کرنا چاہیئے۔ بیرونِ حصارِ شہر حیدرآباد ہر چہار جانب شہر کوسوں تک بازار اور مکانات بنتے چلے گئے ہیں۔ آدمیوں کا بن کہنا روا ہے۔ ہزارہا گھوڑا گاڑی اور جھٹکے وغیرہ دو گھڑی رات پچھلے سے نصف شب تک شہر میں دوڑتے ہیں۔ سواریوں کی کثرت سے پیدلوں کو راستہ چلنا دشوار ہوتا ہے۔ شبانہ روز آمد و رفتِ خلقت جاری ہے۔

ملازمین کی تنخواہیں بہ نسبت ریاستہائے ہندوستان ازادنے تا اعلےٰ دو چند سہ چند چہار چند ہیں۔ اور دربار بخش قرار پاتے ہیں۔ متوسلین طبقۂ علیہ آصفیہ تین طبقہ پر تصور کیئے جاتے ہیں۔

طبقۂ اعلےٰ — طبقۂ اوسط — طبقۂ ادنےٰ

امرائے طبقۂ اعلےٰ

وہ امرا اور جاگیردار ہیں جو خاندانِ شاہی سے نسبتِ قرابت رکھتے ہیں۔ جیسے نواب شمس الامرا مرحوم کا

خاندان ہے کہ باون گاؤں کے جاگیر دار ہیں - ان سے بڑھ کر کوئی جاگیر دار نہیں اعلےٰ حضرت قدر قدرت کے ہمشیرہ زادہ ہیں -

اور بعد ازاں اور امرا ہیں - جو امرائے قدیم اور جاگیر داران موروثی ہیں - مثلاً راجہ رایان مہاراجہ شیو رام بہادر دیانت ونت آصفجاہی -

و رائے رایان راؤ لچھمن راؤ بہادر دیانت ونت آصفجاہی -

و مہاراجہ راجگان مہاراجہ چندو لال بہادر بیکنٹھ باشی کا خاندان و نواب مختار الملک سالار جنگ بہادر مرحوم کا خاندان - اس قدر امرائے دولت آصفیہ تو طبقۂ اوّل میں تصوّر کئے جاتے ہیں ؞

امرائے طبقۂ دوم - اس طبقہ میں تین لاکھ روپیہ سے لے کر پچاس ہزار روپیہ کے جاگیر دار منصبدار اور ارکین دولت پنشنخوار در ماہہ دار مثل معین المہامان و دیگر ملازمان محکمہ جات و حکام و تعلقہ داران وغیرہ وغیرہ - پانچہزار سے لے کر دو سو روپیہ کے تنخواہ دار و منصب دار تک طبقہ دوم میں شمار کئے جاتے ہیں ؞

امرائے طبقۂ سوم - اس طبقہ میں دو سو روپیہ سے لے کر پانچ روپیہ کے نوکر اہلکار محکمہ جات و ملازمین صیغۂ فوج سوار و پیدل وغیرہ تصوّر کئے جاتے ہیں -

حیدر آباد کا سو روپیہ ماہوار کا ملازم اور ریاست ہائے ہندوستانی کا تیس روپیہ کا در ماہہ دار حیثیت میں برابر ہے -

حیدر آباد میں جو سو روپیہ میں بسر اوقات کر سکتا ہے وہ شمالی ہندوستان میں

تیس روپیہ میں کر سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں سب اشیاء ارزاں ہیں حیدرآباد میں گراں، اوّل تو روپے کے خوردے میں ڈھائی آنہ کا فرق ہے۔

اقتصادی حالات

اب اجناس کو غور کیجئے گوشت یہاں فی روپیہ چار سیر کا فروخت ہوتا ہے۔ ہندوستان میں آٹھ سیر کا بکتا ہے (لیکن اب وہ وقت نہیں رہا۔ ہر جگہ آٹھ آنہ (۸ر) سیر کا نرخ ہے۔ ممکن ہے کہ حیدرآباد میں بھی اضافہ ہوگیا ہو) دوچند فرق ہوگیا۔ غلہ یہاں دس سیر کا ہو تو وہاں سترہ اٹھارہ سیر کا ملتا ہے ایک ادنٰے رقم ہے کہ ایک غریب آدمی کے گھر کے کپڑے دھوبی چار آنے مہینے میں دھوتا ہے۔ حیدرآباد میں ایک آدمی کے کپڑوں کی دھلائی ایک روپیہ ماہوار طلب کرتا ہے۔ اور مہینے میں دو بار بمشکل دھو کے دیتا ہے۔ حجّام خط کی بنوائی ایک آنہ لیتا ہے۔ (اب دہلی میں بھی یہی مقرر ہے) ہندوستان میں غریب آدمی حجامت کا ایک پیسہ دیتا ہے۔ آسودہ حال دو پیسے دیتے ہیں یہاں جتنے کمینہ پیشہ ور ہیں سب خوش و خرّم مرفہ الحال ہیں۔

اور طبقہ سوم کے شریف تہیدست، دنیا کی قلّتِ معاش۔ حیدرآباد کے اخراجات ہی حسبِ حیثیت تموّل حدِ اعتدال سے بدرجہا بالاتر ہیں یہاں قلیل المعاش کی بسراوقات غیر ممکن ہے۔ خصوصًا مسافر بن امید وارِ روزگار نہایت خراب و خوار و ذلیل ہوتے ہیں۔ کوئی دروازہ پر آنے کا روادار نہیں ہوتا ہے۔

سوائے ذاتِ بابرکات بندگانِ عالی اعلیحضرت قدر قدرت خلداللہ ملکہ، و مہاراجہ یمین السلطنت مدار المہام بہادر +

امراء کی تمکنت

طبقۂ اوّل و دوم کے امرائے حیدرآباد نازک دماغ تمکنت دوست عیش پسند شہانہ مزاج ہیں غربا کے حال پر متوجہ بہت کم ہوتے ہیں۔ بلکہ غربا و شکستہ بال کی باریابی بھی دربار تک خواب و خیال ہے۔

سگ و دربان چو یافتند غریب　　　این گریباں گرفت و آں دامن۔

ایسے نازک مزاج امرا کو شعر و سخن کا دماغ کہاں کہ وہ اپنے وقتِ عزیز عیش و آرام کو اس کار بیکاران میں صرف فرماویں ؎

اے عندلیبِ ناداں دم در گلو فرو بند　　　نازک مزاج شاہاں تابِ سخن ندارد

یہاں شعر و سخن کی کیا وقعت اور شاعر کی کیا قدر و منزلت کسی فن کا اہلِ کمال صاحبِ جوہر ہو۔ کوئی پُرسانِ حال نہیں۔

ہاں کسی قدر ہے تو البتہ مرثیہ خوانوں کی عشرۂ محرم میں قدر ہو جاتی ہے مگر اُنہیں لوگوں کی جو پشتینی شہرت یافتہ ہیں اور اُن کے آباؤ اجداد کا نام چلا آتا ہے اُسی اعتبار سے وہ پوچھے جاتے ہیں۔ خواہ وہ اُس رتبہ کے ہوں۔ یا نہ ہوں۔ باعتبارِ شہرت اُن کی قدر دانی فرمائی جاتی ہے۔ حیثیت ہنر و فنون سے کچھ بحث نہیں اپنی ناموری و شہرت سے مطلب ہے۔ کہ فلاں امیر نے فلاں مرثیہ خواں کو بلایا ہے۔ اب اُن حضرات کے مقابل ہیں کوئی عرش کے تارے بھی توڑ لائے تو کوئی پُرساں نہیں ہوتا۔ سوائے مرثیہ خوانی کے ظاہرا کوئی نذر و نیاز وغیرہ معلوم نہیں ہوتی۔ جیسا کہ اور شہروں میں امیر غریب علی قدرِ مقدرت طعام داری کرتے ہیں۔ اور غربا و مساکین کو عشرۂ محرم میں کھانے کھلواتے ہیں۔ ہزاروں روپے

نذر و نیاز میں صرف کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں کسی فن کے اہلِ کمال کو کسی سرکار میں نوکر ہوتے نہ سنا کسی سخنور کو دو پیسہ صلہ ملتے نہ دیکھے۔ بخلاف اس کے ہندوستان کے امرا کو ہر اقسام کے شوق ہوتے ہیں کسی کو لہو و لعب کی جانب توجہ ہوتی ہے مثل پتنگ بازی۔ کبوتر بازی یا اور کسی قسم کی بازی یا شکار وغیرہ بعضوں کو گھوڑے کی سواری کا شوق ہوتا ہے۔ تو اچھے اچھے ہر ملک اور ہر قوم کے نایاب خاصے گھوڑے علیٰ قدرِ حیثیت طویلے میں موجود ہوتے ہیں۔ اُس فن کے آدمی نوکر ہوتے ہیں کسی امیر کو پرندوں کے شکار کا شوق ہوتا ہے تو ہزار ہا روپیہ اسی پر صرف ہوتا ہے اُس کے سامان فراہم ہوتے ہیں۔ غرضکہ امیر کو جس فن کا ذوق ہوتا ہے اُس فن کے آدمی بکثرت جمع ہوتے ہیں اور اُن کی قدر دانی کی جاتی ہے اور نہال اور مالا مال ہوتے ہیں۔ امرایانِ حیدر آباد یورپین تعلیم یافتہ ہیں۔ انگریزوں کے قدم بقدم چلتے ہیں کس درجہ مہذب و محتاط ہیں کہ ایک پیسہ کسی بازی میں بیجا صرف نہیں فرماتے ہیں۔ کیا مجال کہ کسی فن کا آدمی اپنا اظہارِ جوہر کرکے ازراہ شعبدہ بازی ایک حبہ ٹھگ کر لی جائے۔ یہ ان حضرات کی دانشمندی اور مقتضائے لوازم احتیاط خودداری ہے پیشتر ہی انسداد اس امر کا رہتا ہے کہ کوئی شخص مسافر دروازے پر نہ آنے پائے۔

اس کے علاوہ اور سب طرح کا فیضِ عام باداد و دہش و شہرہ سخاوت جو شیوہ امارت ہے راقم الحروف کے گوشگزار نہیں ہوا۔

اپنے طرزِ کلام کی وضاحت

در اقصائے عالم بگشتم بسے | بسر بردم ایام با ہر کسے
تمتع ز ہر گوشہ یافتم | ز ہر خرمنے خوشہ یافتم

میں نے اپنی مدت العمر پر جو غور و نگاہ ڈال کر حساب کیا تو کس طرح پر تقسیم ہوتی ہے - ایک حصہ تو زمانۂ طفولیت اور نادانی اور لہو و لعب کا عنفوانِ شباب اور جوانی تک حصہ حصہ دوم سرگردانی و خانہ بدوشی و بیابان نوردی و تلاش و جبۂ معاش و نوکری و صرفِ اوقاتِ روزگاریگی میں تصور کیا جاتا ہے ۔

ما بقٰے ان دو حصص کے ایک ثلث زمانہ کسبِ فنِ سخن و سخنوری و مشق سخن و سخنگوئی و صحبت کاملین فنِ سخن و حصول استفادہ فن تصور کرنا چاہیے۔ سن میرا ستر سے تجاوز کر گیا ہے اوّل زمانہ طفولیت میں مجھے شعر و سخن کا شوق ہوا اور میں شیخ محمد ابراہیم ذوق خاقانی ہند کا شاگرد ہوا تو وہ زمانہ جاہلیت کا تھا۔ مجھے عیب و صوابِ سخن کا کچھ امتیاز نہ تھا۔ ہر چند کہ اصلاحِ سخن بہت کم ہوئی لیکن فیضانِ صحبت بابرکات سے استفادہ بہت کچھ حاصل ہوا - اور بعد انتقال ان بزرگوار کے یارانِ ہم فن کی صحبت سے بہت امتیاز حاصل ہوا - بعد زمانہ غدر کے پانچ چار سال کے بعد جب دلی واپس آیا ہوں اور چرچا شعر و سخن رہنے لگا تو مفتی صدرالدین خاں صاحب آزردہ و نواب مصطفٰے خاں صاحب شیفتہ اور حافظ غلام رسول صاحب ویران کی صحبت کا بیشتر اتفاق رہا - اور گاہ گاہ مرزا اسد اللہ خاں صاحب غالب کی خدمت میں جانے کا اتفاق ہوتا تھا مگر اصلاحِ سخن کسی سے نہیں لی لیکن ان بزرگواروں و دیگر کاملین کے کلام کو دیکھ کر بنظرِ غور استفاضہ حاصل کیا - اور اپنی طبیعت کے زور سے ان تینوں استادانِ وقت ذوق - مومن - غالب کے کلام کا لب لباب اخذ کر کے اپنی طرز جداگانہ اختیار کی - شیخ صاحب مرحوم کی تو زبان اور محاورات کی پیروی اختیار کی

مومن صاحب کے مضامین اور نازک خیالی و سوز وگداز کا اتباع کیا۔

مرزا غالب صاحب کی بندش و ترکیبات کی تقلید اختیار کی۔

اس کے علاوہ جو کلمات کہ میرے فہم ناقص میں مذموم اور غیر فصیح۔ ناجائز مفہوم ہوئے اُن سے احتراز کیا اور اُن کو متروکات میں داخل کیا۔ خذ ما صفا و دع ما کدر۔ نان بر شیر مال باروغن تلخ گندہ الایجاد بندہ۔ میرا مقصود یہ نہیں ہے کہ مجددِ وقت ہوں اور حضرات بھی میری تقلید اختیار کریں۔ میں نے کوئی متروکہ لفظ اپنے کلام میں شامل نہیں کیا اور احباب کو اپنے کلام کا اختیار ہے۔ جائز رکھیں یا نہ رکھیں۔

بیس سال کامل مجھے ریاست جے پور میں اتفاق روزگار سرشتہ کا ہوا اس اثنا میں مطلق فرصت طبع آزمائی کی نہ ہوئی۔ شائد اس عرصہ میں بیس پچیس غزل اور ایک دو قصیدہ نگاری کا اتفاق حسب تقاضائے احباب ہوا ہو تو ہو مگر بعد جب اُس روزگار سے مستعفی ہو کر خانہ نشین ہوا ہوں اور نواب احمد علی خاں صاحب رونق کی رفاقت اختیار کی ہے۔ جب اس جانب توجہ کی گئی ہے اور میرے کلام کی شہرت ہوئی ہے اور خلائق کی رجوع ہوئی ہے اور اطراف و جوانب سے لوگ میرے شاگرد ہونے شروع ہوئے اور مشقِ سخن روز بروز ترقی پذیر ہوتی چلی گئی ہے۔ تا اینکہ عنایت ایزدی سے دیوان اوّل گلستانِ سخن اختتام کو پہنچ گیا۔ پہلے دیوان کی اشاعت زمانہ ملازمت ٹونک میں خداوند مسبب الاسباب نے اُس کے انطباع کے سامان بھی فراہم کرا دیئے راجہ بھگوان سہائے بہادر اور خواجہ عبدالرحیم خاں صاحب کی کفالت سے

وہ چھپ کر تیار ہوا اور تمام اطراف و اکنافِ ہندوستان میں اشاعت پا گیا اور تازہ بانِ انطباع دیوانِ دوم بھی ترتیب پا گیا مگر بعد اس قدر استطاعت نہ ہوئی کہ وہ بھی چھپوایا جاتا۔ اب عنایتِ ایزدی سے تین دیوان کا ذخیرہ میرے پاس موجود ہے اور ایک جلد کے قریب مرثیے۔ سلام۔ رباعیات وغیرہ فراہم ہو گئے ہیں۔ خداوند تعالےٰ اپنے خزانۂ غیب سے کوئی سامان مہیا کر دے گا تو وہ بھی طبع ہو جائیں گے۔ ظاہرا تو کوئی سامان نظر نہیں آتا۔

مدّت العمر میری خدمت سلاطینِ عظام و رؤسائے ذوی الاحترام میں صرف ہوئی اور جہاں رہا اعزاز و احترام سے رہا۔ رؤسائے اولوالعزم نے میرے کلام کو نظرِ وقعت سے ملاحظہ کیا اور جن امرائے عالی ہمّت، والانظر نکتہ سنج سخن شناس کو خداوندِ عالم نے نگاہِ باریک بین و جوہرِ قابلیت و استعدادِ سخن شناسی عطا فرمایا ہے انہوں نے علیٰ قدرِ مقدرت عطایائے صلہ جات و خلعت و انعامات وغیرہ سے میری قدر افزائی فرمائی حتیٰ کہ نو شعر کی غزل کے صلہ میں مجھے ہزار روپے ایک امیر نے عنایت فرمائے ہیں اور جب نئی غزل لکھ کر لے گیا ہوں اشرفیاں ملی ہیں۔

نواب احمد علی خاں صاحب رونق تین ہزار روپے ماہوار کی معاش کے آدمی تھے مگر جب میرے کسی بچے کی شادی درپیش ہوتی تھی تو اُس تقریب میں مجھے دو سو روپیہ علاوہ تنخواہِ معیّنہ کے عطا فرماتے تھے اور قصائد کا صلہ علاوہ عطا ہوتا رہتا تھا۔ علیٰ ہذا القیاس شاگردانِ دیگر مثل راجہ بھگوان سہائے بہادر گرم و خواجہ عبدالرحیم خاں صاحب انیم بھی ہمیشہ دستگیری فرماتے رہے۔ اسی طرح مدّت العمر بسر ہو گئی۔ اب چند روز کی زندگی باقی ہے۔ آفتاب لبِ بام و شمع سحر کا عالم ہے۔ ہر لمحہ بے رازہ والے۔ اب زمانہ انحطاط و تنزلی کا ہے۔

معراجِ کمال تو حاصل ہو چکی ہے۔ تمام ہندوستان میں ڈیرہ غازی خاں سے لے کے ڈھاکے بنگالے تک اور کوہ شملہ سے لے کے مدراس تک میرے شاگرد موجود ہیں۔ جابجا میرا کلام پہنچ گیا ہے۔ لوگ کلام کے مشتاق رہتے ہیں۔ ایک ایک مصرعہ کی قدر و منزلت کرتے ہیں۔ اصلاحات کو آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ کوئی ایسا سخنور نہیں جو مجھے جانتا نہ ہو۔ جو گلدستہ نیا جاری ہوتا ہے، پہلے درخواست میرے پاس آتی ہے اب اس سے زیادہ کیا آسمان پر پہنچیا ہے۔ عنایاتِ ایزدی سے میرے شاگردوں کا کلام حدِ تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔ جو خود اُستاد ہیں۔ ایک ایک کے سَو سَو دو دو سَو شاگرد موجود ہیں۔ میری اصلاح کے محتاج نہیں۔ یہ اُن کا حُسنِ عقیدت ہے کہ مجھے دکھاتے اور سُناتے ہیں، ورنہ شعرائے ہمعصر سے اُن کا کلام رُتبہ میں کم نہیں بلکہ خدا چاہے تو بالا ہی ہوگا۔ اور قصائد نگاری میں تو اپنا جواب آپ ہیں۔ مولوی نادر علی برتر منشی نجم الدین احمد ثاقب بدایونی۔ صاحبزادہ احمد سعید خاں عاشق ٹونکی درجہ اول میں یہ صاحب ہیں۔ درجہ دوم میں منشی رمضان علی خاں اختر اجمیری۔ منشی ابراہیم دبیر روڑکوٹی۔ نین میاں اُنس سکنہ باڑہ اودھ و منشی سلطان احمد ناشاد سکنہ کلکتہ و نواب خواجہ عبدالرحیم خاں صاحب اثیم نواب ڈھاکہ و حکیم اسد علی خاں صاحب دہلوی متخلص بہ مضطر و سید حسن سید بھوپالی و محمود خاں محمود حیدرآبادی اور درجہ سیوم کا کچھ حساب نہیں اُن کا شمار قیدِ تحریر میں لانا غیر ممکن ہے اُن کے نام کہاں تک یاد کئے جائیں۔ ان کو بہ نظرِ طوالتِ عبارت فروگذاشت کیا گیا۔

اب سِن میرا استیؔ سے تجاوز کر گیا۔ دل و دماغ میں طاقت نہ رہی قویٰ مضمحل ہو گئے، ہوش و حواس مختل سہو و نسیان کی یہ کثرت ہے کہ بات کہتے ہی بھول

جاتا ہوں۔ اولاد کے صدموں سے دل پاش پاش ہو گیا۔ افکار اہل و عیال نے آدمیت سے کھو دیا۔ کوچ ہر وقت گردن پر سوار ہے۔ کانوں سے بہرا، آنکھوں سے اندھا۔ جو شخص ان مصائب میں گرفتار ہو اس کو شعر و سخن سے کیا تعلق۔ باوجود اس تشتتِ خاطر کے خونِ جگر پی کر اور جان کو ہلاک کر کے کچھ کچھ کہا گیا تو انجام اس کا سوائے رشک و حسد و حرف گیری کے کچھ نہ دیکھا گیا۔ ناقدریٔ زمانہ کا یہ حال ہے کہ ناقص و کامل ایک نظر دیکھے جاتے ہیں۔ کوئی قدر دانِ کمال نہیں۔ ان وجوہات کے باعث طبیعت اس فن کی طرف سے بیزار ہو گئی۔ لامحالہ شعر و سخن کی جانب سے دست بردار ہونا پڑا اور شعر و شاعری کو سلام کر کے مہرِ خموشی دہن پر لگا کر گوشہ نشینی اختیار کی ؎

آنانکہ بکنجِ عافیت بنشستند دندانِ سگ و دہانِ مردم بستند
کاغذ بدریدند و قلم بشکستند از دست و زبانِ حرف گیراں رستند

شعر و سخن

میں جب واردِ حیدر آباد ہوا تو تمام حیدر آباد میں شہرت ہو گئی۔ جوق جوق و خیل خیل اصحاب ملاقات کو آتے تھے۔ صبح سے رات کے گیارہ بجے تک میرے مکان پر مجمع رہتا تھا۔ کلام کی فرمائش ہوتی تھی۔ تعمیلِ حکم کرنی پڑتی تھی۔ اسی اثنا میں میرے شفیق قدیم نواب عبد اللہ خاں ضیغم نے ایک مشاعرہ قرار دیا۔ اور سب احباب کو میرے آنے کی اطلاع دے دی اُس جلسہ میں بکثرت اجماعِ خلائق ہوا اور میرے پہنچنے سے قبل مشاعرہ شروع ہو گیا تھا۔ غرضکہ جب میں پہنچا ہوں تو سب صاحبوں نے براہِ عنایت تعظیم دی

اور مشاعرہ تو ہو ہی رہا تھا۔ مگر میں نے یہ کیفیت عجب دیکھی کہ ہنوز ایک غزل تمام نہ ہوئی تھی کہ دوسرے صاحب آگے بڑھ گئے اور شمع اپنے آگے رکھ کر پڑھنے لگے۔ ہنوز ان کی غزل ختم نہ ہوئی کہ ایک شخص اُن کے پہلو میں سے اور نکل آئے اور جھٹ غزل شروع کر دی۔ کوئی داد دے یا نہ دے، پڑھے چلے جاتے ہیں۔ دو دو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو شعر بے لطف و بے مزہ پڑھے جاتے ہیں۔ کسی طرح خاموش نہیں ہوتے۔ ایک پر ایک گرا پڑتا ہے۔ خلافِ تہذیب اپنی اپنی جائے سے اُٹھ کر غزل پڑھنے والے کے پیچھے جا بیٹھتے ہیں۔ ایک جا سے شمع کو جنبش نہیں ہوتی اور لطف یہ کہ جو صاحب پڑھ چکتے ہیں وہ اُٹھے اور گھر کو روانہ ہوئے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ یہ کیسے بے تہذیب لوگ ہیں کہ ان کو ذرا خیالِ آدابِ محفل نہیں۔ اپنے دل میں نہایت پشیمان ہوا کہ تو اس محفل میں کیوں آیا۔ غرضکہ تمام شب بسر ہوئی۔ صبح کے قریب میری غزل کی نوبت آئی تو گنتی کے آٹھ دس آدمی تھے۔ باقی سب چل دیئے معلوم ہوا کہ یہ لوگ اپنا کلام سنانے کو آئے تھے میرے کلام کے شائق نہ تھے خیر جب میری غزل پڑھی گئی ہے تو خدا کی عنایت سے جو ہمیشہ سے میرے کلام کا رنگ ہے اور جو کیفیت مشاعروں میں اور جا ہوتی ہے وہی یہاں ظہور میں آئی۔ ہر چند کہ اُس وقت بہت ہی تھوڑے سے آدمی تھے مگر تمام حیدرآباد میں شہرت ہو گئی۔ پھر اور بڑے بڑے معرکے رہے، جو حضرات کہ یہاں اُستادوں میں شمار ہوتے ہیں اور ان کے صدہا شاگرد بھی ہیں اور واقعی کلام میں اُن کا پایہ اُستادی کو پہنچا ہوا ہے وہ حضرات سب مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ خدا نے اُن کے سامنے آبرو رکھ لی۔ کوئی غزل کسی صاحب کی غزل سے انیس نہیں رہی اور یہ قصائد کا حال تمام حیدرآباد پر روشن ہے میرا لکھنا

فضول ہے۔ ان حضرات میں اکثر شعرائے نامور اہلِ لکھنؤ سے ہیں۔ دلّی والوں میں فقط ہم دو آدمی تھے یا داغ صاحب یا فقیر ظہیرؔ۔ سو داغ صاحب بذاتِ خاص مشاعرہ میں آتے نہ تھے۔ فقیر البتہ ہر مشاعرہ میں جا موجود ہوتا تھا۔ انجام اس کا یہ ہوا کہ اُن بزرگواروں نے مشاعرہ میں آنا ترک فرما دیا۔ مہاراجہ مدار المہام بہادر کے مواجہ میں بھی اکثر جلسے ہوئے۔ خدا نے وہاں بھی سُرخرو کیا۔ اُن جلسوں کی حقیقت حاضرینِ مشاعرہ کے دل پر منقش ہے مگر افسوس صد افسوس، صلہ اور مُزد ایسی جانفشانی اور عرقریزی و خونِ جگر پینے کا سوائے رشک و حسد و نیش زنی و بیخ کنی کچھ نہ دیکھا ؎ اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی۔ داغ صاحب مرحوم و مغفور کی بھی زندگی بھر یہی کیفیت رہی کہ لوگوں کو رشک و حسد رہا۔ اور ہمیشہ خواہی نخواہی موردِ اعتراضات رہے۔ علیٰ ہذا القیاس میں بھی اسی بلا میں مبتلا ہوں ؎

بحذر و توبہ تواں رستن از عذاب خدای ولیک می نتواں از زبانِ مردم رست

بھلا داغ صاحب سے اگر رشک و حسد تھا تو بجا تھا کہ اُن کو خدا نے صاحبِ جاہ و منصب کیا تھا۔ مجھ بدنصیب کو تو پیٹ بھر روٹی بھی نصیب نہیں۔ مجھ سے ناحق کا بغضِ لِلّٰہی ہے۔ حاصلِ کلام جس قدر شہرت قدردانیِ حیدرآباد سُنی گئی تھی اُسی درجہ کساد بازاری پائی گئی۔ بے ہترا رنجیدہ و عاقل خوار دار زمیں ذاتِ خدا پر توکل کئے ہوئے بیٹھا ہوں۔ جب تک آب و دانہ ہے بسر کرتا ہوں۔ اپنے خداوندِ نعمت کے حق میں دعائے خیر کرتا ہوں۔

تمت بالخیر

اکادمی پنجاب کی چند مطبوعات

مسرّت کی تلاش:۔ اُردو کے نوجوان سنجیدہ نگار وزیر آغا کی تصنیفِ لطیف۔ زندگی اور اُس کی گوناگوں کیفیات، پر ہماری زبان میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ یہ خیال افروز کتاب ہمارے ادب میں فکر و نظر کے ایک سلسلۂ جدید کا آغاز کرتی ہے۔ قیمت دو روپے اراکین اکادمی سے ایک روپیہ آٹھ آنے۔

دیوان شیفتہ:۔ اُردو کے شگفتہ کلام شاعر نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کا مجموعۂ سخن، جو ایک عرصہ سے نایاب تھا، اب خوبی تصحیح و تدوین اور حسنِ طباعت سے آراستہ ہو کر از سرِ نو شائع ہوا ہے۔ آغاز میں ایک جامع مقدمہ بھی موجود ہے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے، اراکینِ اکادمی سے دو روپے۔

بامِ رفعت:۔ اُردو کے منزّہ خیال شاعر اثر صہبائی کے منتخب کلام کا ایک دلآویز مجموعہ ساڑھے تین سو صفحات۔ مجلّد و مطلّے۔ قیمت اڑھائی روپے۔ اراکین اکادمی سے دو روپے۔

نگارِ فطرت:۔ مرزا عباس بیگ محشر دورِ حاضر کے واحد فطرت پرست شاعر ہیں۔ اور ان کی نیچر شاعری اپنے آہنگ اور جمال میں ایک فروغِ بے مثال حاصل کر رہی ہے۔ مجلّد و مذہب قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ اراکین اکادمی سے سوا روپیہ ؏

فغانِ دہلی یعنی معاصرینِ غالبؔ و ذوقؔ کے وہ الم ناک مرثیے جو انہوں نے دہلی کی ویرانی و تباہی پر لکھے، اسی عہد کے ایک شاعر نغز گو میر تفضل حسین خاں کوکب نے مرتب کئے تھے اب اس فراموش شدہ کتاب کو موجودہ ایڈیشن نے حیاتِ تازہ بخشی ہے۔ قیمت دو روپے۔ اراکین اکادمی سے ڈیڑھ روپیہ۔

ملنے کا پتہ: **سیکرٹری۔ اکادمی پنجاب۔ ادبی دنیا منزل لاہور**

اکادمی پنجاب

اکادمی پنجاب مغربی پاکستان میں سب سے پہلا ادبی وقف (لٹریری ٹرسٹ) ہے۔

اکادمی پنجاب ایک معیاری دار المصنّفین کی تاسیس میں مصروف ہے۔

اکادمی پنجاب کے کاروبار میں نفع کا عنصر شامل نہیں ہے۔

اکادمی پنجاب سنجیدہ اور بلند پایہ علمی و ادبی کتابوں کی اشاعت میں مصروف ہے۔

اکادمی پنجاب کی رکنیت کے قواعد وضوابط اکادمی کے دفتر سے طلب فرمائیے۔

صلاح الدین احمد

آنریری سیکرٹری اکادمی پنجاب

ادبی دنیا منزل۔ لاہور

حیاتِ جاوید

(جدید ایڈیشن)

- "حیاتِ جاوید" سرسید احمد خاں علیہ الرحمۃ کی زندگی اور کام کی کہانی ہے۔
- "حیاتِ جاوید" کے مصنف اُردو کے نامور شاعر اور ادیب مولانا الطاف حسین حالی ہیں۔
- "حیاتِ جاوید" ہماری کلاسیکی کتابوں میں ایک بہت بڑا مرتبہ رکھتی ہے
- "حیاتِ جاوید" اُردو میں سوانح نگاری کا بہترین کارنامہ ہے۔
- "حیاتِ جاوید" کے مطالعے سے اسلامیانِ ہند کے سب سے بڑے لیڈر کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔
- "حیاتِ جاوید" سرسید کے صحیح خیالات وعزائم کا آئینہ ہے۔
- "حیاتِ جاوید" کی ایک جلد ہر گھر اور ہر لائبریری میں موجود ہونی چاہئے
- "حیاتِ جاوید" کے جدید ایڈیشن میں ڈاکٹر سید عبد اللہ کا دیباچہ اور صلاح الدین احمد کا مقدمہ اور رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند بطورِ ضمیمہ شامل ہے

ضخامت تقریباً ایک ہزار صفحات — قیمت ساڑھے بارہ روپے

تقطیع کلاں۔ مجلّد و مذہب۔ — اراکینِ اکادمی سے دس روپے

×

کتب خانہ اکادمی پنجاب۔ ادبی دُنیا منزل لاہور

سے طلب فرمائیے۔